آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

خالدہ جیلانی

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

پکوان

افسانے

نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

نفسیات

میری بیاض سے

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

صدیوں اور زمانوں سے گزرتی انسانی تاریخ کے تسلسل کو دیکھیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق کائنات کا مقصد و منتہیٰ محبت ہے اور محبت ہی اس کو قائم رکھ سکتی ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو دُنیا میں پھیلائے۔

دُنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے اُن کی تعلیمات کا بنیادی مقصد انسانوں کی اصلاح تھا۔ انہوں نے امن اور محبت کی تعلیم دی، صبر، شکر، نیکی اور سچائی کا سبق دیا۔ وہ راستہ دکھایا جس سے دُنیا سنور جائے اور جو آخرت کے لیے بھی زادِ راہ ہو۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے مذہب نے ہمارے لیے ایک واضح اور روشن راستہ متعین کر دیا ہے جس پر چل کر ہم اپنی دُنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔

آہ خالدہ جیلانی،

ایک طویل رفاقت کا اختتام ہوا۔ خالدہ جیلانی راہی ملک عدم ہوئیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا آغاز ہوا تو اس وقت جو چند لوگ اس سے وابستہ ہوئے۔ ان میں سے ایک خالدہ جیلانی بھی تھیں۔ وہ ابتدا سے ہی خواتین ڈائجسٹ سے منسلک رہیں اور یہ ساتھ آخر دم تک قائم رہا۔ اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ قائم رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ خالدہ جیلانی ہمارے لیے گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ گھر کے ہر فرد کے ساتھ ان کا دوستی کا رشتہ تھا۔ ایسی دوستی جو محبت، خلوص اور غم گساری سے عبارت تھی۔ وہ ہر خوشی اور غم کی شریک تھیں۔ ان کا گھر کے ہر فرد کے ساتھ اپنائیت اور محبت کا تعلق تھا۔ یہ اور بات ہے کہ دوستی اور محبت کے اس تعلق میں احترام بھی شامل تھا۔

طبعاً وہ بہت سادہ مزاج تھیں، ان کے مزاج میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ تہذیب، شائستگی اور رکھ رکھاؤ ان کی شخصیت میں شامل تھا۔ انہوں نے آفس میں کبھی کسی سے تیز لہجے یا اونچی آواز میں بات تک نہ کی۔

خالدہ جیلانی شعبہ اشتہارات سے منسلک تھیں اور بڑی ذمہ داری اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیتیں۔ اپنے شعبے میں وہ بہت کامیاب تھیں۔

ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر خلوص تھا۔ آفس کے کسی بھی فرد کو کوئی ضرورت یا کام ہوتا، وہ ان سے کہتا اور وہ بڑی ہی خوش دلی کے ساتھ اس کا کام کرتیں۔ آج آفس کے سب ہی لوگ بہت اُداس ہیں اور ان کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔

کچھ لوگ اپنے اوصاف کی بنا پر ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں۔ خالدہ جیلانی دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔ لیکن ان کی یادوں کے اُجلے نقوش ہمیشہ دل میں روشن رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ خالدہ جیلانی کی مغفرت کے لیے دُعا فرمائیں۔

سالگرہ نمبر،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

ہماری قارئین اکثر لکھتی ہیں کہ وہ مصنفین سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہیں۔ اس بار ہم نے سروے میں قارئین کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ مصنفین سے وہ سوال کر سکتی ہیں جو ان کے ذہن میں ہے۔ ہم مصنفہ کا جواب ان کے سوال کے ساتھ شائع کریں گے۔

سروے کا سوال یہ ہے۔

1۔ اگر آپ کو اپنی پسندیدہ مصنفہ سے سوال کرنے کا موقع ملے تو کیا سوال کریں گی۔

اس سوال کا جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 25 فروری تک موصول ہو جائے۔

مصنفین سے درخواست ہے کہ وہ سالگرہ نمبر کے لیے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔
قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

تہمت لگانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:
"جو شخص اپنے مملوک (غلام، باندی) پر بدکاری کی تہمت لگائے تو قیامت والے دن اس (مالک) پر حد قائم کی جائے گی، مگر یہ کہ وہ (مملوک) ایسا ہی ہو جیسے اس نے کہا (پھر مالک پر حد لاگو نہیں ہوگی۔" (بخاری و مسلم)
فوائد ومسائل:
1۔ مالک پر قیامت والے دن حد قذف (زنا کی تہمت لگانے کی سزا) اس لیے قائم کی جائے گی کہ دنیا میں مالک اپنے مملوکین پر ہر طرح کا ظلم کر لیتے ہیں اور ان کی دادرسی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جب بے لاگ انصاف فرمائے گا تو اس مظلوم طبقے کے ساتھ بھی انصاف کا اہتمام ہوگا اور جو مالک دنیا میں سزا سے بچ رہے ہوں گے، انہیں قیامت والے دن سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔
2۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنے مالکانہ اختیارات کے گھمنڈ میں اپنے غلاموں اور نوکروں چاکروں پر ظلم کرتے ہیں۔

فوت شدہ کو برا کہنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ انہوں نے (اچھے یا برے) جو عمل آگے بھیجے، وہ اس کو پہنچ گئے۔" (بخاری)
فائدہ:
مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اچھے یا برے جو عمل بھی کیے، اس کے مطابق وہ جزا یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہمیں اب انہیں برا کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کسی بھی

فوت شدہ پر سب وشتم نہ کی جائے۔ بالخصوص کسی کا نام لے کر سوائے اس مصلحت شرعی کے جس کا ذکر عنوان باب اور اس کے فوائد کے تحت میں گزرا۔

تکلیف پہنچانے سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالٰی نے فرمایا۔
"اور وہ لوگ جو بغیر کسی قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

مسلمان کون ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"(کامل) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے جس نے کلمہ پڑھ کر توحید و رسالت محمد یہ کا اقرار کر لیا۔ لیکن کامل مسلمان وہ ہے جس کا کردار اتنا بلند ہو کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔

مہاجر تو اصل میں وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے وطن اور خویش و اقارب کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی سے اللہ کے دین پر عمل کر سکے۔ لیکن وہ شخص بھی مہاجر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق نافرمانی والے کاموں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے معنی ترک کرنے کے ہیں، وطن کو ترک کر دے یا معاصی کو ترک کر دے۔

بغض رکھنا

اللہ تعالٰی نے فرمایا: مومن تو بھائی بھائی ہیں۔ (الحجرات۔ 10)

نیز اللہ تعالٰی نے فرمایا: "(مومن) مومنوں پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔" (المائدہ۔ 54)

اور اللہ تعالٰی نے فرمایا: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں، آپس میں مہربان۔" (الفتح۔ 29)

تین دن سے زیادہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:
ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کا مطلب ہے کہ ایسا کام یا بات نہ کرو جس سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو۔ حسد نہ کرو، یعنی کسی مسلمان کو کوئی نعمت اور شرف و فضل حاصل ہو تو اس کے زوال کی آرزو مت کرو۔ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ، یعنی ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو تو سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے اعتراز کرتے ہوئے کنی کترا کر مت نکلو۔ یہ تمام چیزیں ممنوع ہیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پیدا ہوتا ہے، اسی لیے تین دن سے زیادہ ترک تعلق اور بول چال بند رکھنا جائز نہیں ہے۔

پیر اور جمعرات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ

معاف کردیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔ کہا جاتا ہے ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں، ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

فائدہ:

اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض و عناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

حسد حرام ہے

اور یہ کسی صاحب نعمت سے زوال نعمت کی آرزو کرنے کا نام ہے، وہ نعمت دینی ہو یا دنیوی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس نعمت پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی۔" (النساء۔ 54)

حسد سے بچو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حسد سے بچو، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ یا فرمایا: خشک گھاس کو (کھا جاتی ہے)" (ابوداؤد)

ٹوہ لگانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ٹوہ مت لگاؤ۔" (مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو۔) (الحجرات۔ 12)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

بدگمانی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کے حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لیے کوشش کرو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ باہم بغض رکھو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ۔ اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ، جیسے اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے، نہ اس کو حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے......" اور اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے۔ "آدمی کو برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، عزت اور مال حرام ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو، وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" (مسلم)

بھائی بھائی

ایک اور روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو، جاسوسی نہ کرو، عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ، محض دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھا کر مت لگاؤ اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے۔

"ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، اور باہم بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔"

بول چال بند نہ کرو

ایک اور روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے بول چال بند مت کرو اور تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ بدگمانی سے مراد کسی مسلمان کی بابت ایسا گمان ہے جس کا کوئی ظاہری سبب نہ ہو، اسی طرح وہ خیال ہے جو بغیر کسی دلیل کے دل میں پیدا ہو۔

2۔ اس کا مطلب ہے کسی سودے کی بولی میں اس لیے اضافہ کرنا تاکہ دوسرے لوگ دھوکا کھا جائیں، اس کا مقصد خریدنا نہ ہو۔

3۔ اس حدیث میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان کا مقصد مسلمان کی عزت کا تحفظ ہے، بلاوجہ بدگمانی، عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش، مسلمان کی عزت کے منافی ہے، اس لیے ان سے روک دیا گیا۔ دوسرا مقصد اخوت اسلامیہ کی پاسداری ہے، اسی لیے ظلم کرنے سے، دست گیری کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے، حقیر سمجھنے سے اور تکبر کرنے سے روک دیا گیا ہے اور مسلمان کی جان، مال اور عزت کو دوسرے مسلمان پر حرام کر دیا گیا ہے۔ بولی میں اضافے اور سودے پر سودا کرنے کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے بھی بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے۔

عیب تلاش کرنا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اگر تو مسلمانوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گا یا قریب ہے کہ تو ان کے اندر فساد پیدا کر دے۔" (یہ حدیث صحیح ہے، اسے امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ:

جب ایک شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں اور ان کی کمزوریوں کے تعاقب میں لگا رہے گا تو پھر دوسرے لوگ بھی اس کی بابت یہی انداز اختیار کریں گے، اس سے معاشرے میں جو فساد پیدا ہو گا وہ ظاہر ہے، اس لیے شریعت نے اس سے منع کر دیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور اس کے بارے میں کہا گیا کہ "یہ فلاں آدمی ہے، اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔"

انہوں نے فرمایا: "ہمیں ٹوہ لگا کر عیب تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے، البتہ اگر کوئی کمزوری ہمارے سامنے آئے گی تو ہم اس پر اس کی گرفت کریں گے۔" (اسے ابوداؤد نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کا ایک نمونہ ہے جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً اسلام کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

2۔ محض شبہ پر حد یا تعزیر عائد نہیں ہو گی، اس کے لیے واقعی ثبوت ضروری ہے۔

بدگمانی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی کرنے سے بچو، اس لیے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔" (الحجرات۔12)

سب سے بڑا جھوٹ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ روایت اس سے قبل کے باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں بھی بدگمانی سے، خاص طور پر اہل خیر و صلاح کے بارے میں بدگمانی سے بچنے کی تاکید ہے، اس لیے کہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے۔ علاوہ ازیں شرعی احکام اور سزائیں یقین پر نافذ ہوتی ہیں،

2۔ عام حالات میں ہر مسلمان کی بابت اچھا خیال رکھنا ضروری ہے، الا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے برعکس موجود ہو۔

مسلمان کو حقیر جاننا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے استہزا نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے استہزا کریں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے (مومن بھائیوں) کو عیب مت لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) اللہ کی حکم عدولی ہے۔ اور جو توبہ نہ کریں، بس وہی لوگ ظالم ہیں۔'' (الحجرات۔ 11)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہر اس شخص کے لیے خرابی ہے جو طعنہ زنی کرنے والا، عیب جُو اور چغل خور ہے۔'' (الھمزہ۔1)

کافی ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کو برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔'' (مسلم)

غرور

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی کبر ہوگا۔''

ایک آدمی نے عرض کیا ''ایک آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کی جوتی اچھی ہو (کیا یہ بھی کبر ہے؟) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بے شک اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے، خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔ کبر، حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔'' (مسلم)

عمل برباد

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔

تو اللہ عزوجل نے فرمایا۔ ''کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا اور تیرے عمل میں نے برباد کردیے۔'' (مسلم)

فائدہ:

1۔ بعض لوگوں کو اپنی عبادت اور زہد و تقویٰ پر گھمنڈ ہوجاتا ہے جو انہیں دوسروں کی بابت بدگمانی میں مبتلا کردیتا ہے اور وہ بڑے یقین سے اس بات کا اظہار کردیتے ہیں کہ فلاں شخص کو تو اللہ نے بھی معاف نہیں کرنا، حالانکہ یہ اللہ کی شان میں بے ادبی کا مظاہرہ اور اپنی بابت حد سے زیادہ خوش گمانی کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس عابد و زاہد و متقی کے سارے عمل برباد کرکے اسے جہنم میں پھینک دے اور اس گناہ گار کو معاف کرکے جنت میں بھیج دے جس کی بابت یہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ اسے اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے انسان کو اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

مرنے والوں کو سہولتیں

انشاجی

اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ بدھ کو گڑھی شاہو میں ''انجمن معین الاموات'' کا جلسہ ہوا، جس میں نئے سال کے لیے عہدیدار منتخب کیے گئے۔

معین کا مطلب ہے مددگار، اعانت کرنے والا۔ اموات جمع ہے موت کی۔ ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا، لہٰذا اس کے معنی کچھ غور کرنے سے سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو ہم نے فوراً اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے کہا کہ۔

''دیکھو، لاہور والے تم کراچی والوں سے بازی لے گئے۔ اپنی انجمن بنالی۔ جو کام تم لوگ یہاں فرداً فرداً کرتے ہو، اب وہاں اجتماعی طور پر ہوا کرے گا۔ اب یہ لوگ آبادکاری والوں پر زور دے کر قبرستانوں کے لیے مزید زمین بھی منظور کرالیں گے۔ یہاں تم لوگوں سے یہ بھی نہ ہوسکا۔''

آج کل نیکی کا زمانہ نہیں، بجائے اس کے کہ اس امر ضروری کی طرف توجہ دلانے پر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتے، بپھر گئے اور کہنے لگے۔

''دیکھو جی...... تم گھوم پھر کر ہر بات ہم پر لاتے ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ خود تمہارے پڑوس میں تابوت الحکما حکیم عزرائیل علی خاں مالک ہلاہل دواخانہ بھی تو موجود ہیں اور اب تو ہومیو پیتھیوں کو بھی خلق خدا کے مارنے جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ طب چین و جاپان والے تو مریض پر وار کرنے کے لیے لائسنس تک نہیں لیتے۔ ان نیولوں اور سانڈوں اور درویش کی چٹکی والوں کو بھی تم بھول گئے، جن کی ایک پڑیا زکام، آشوب چشم، بواسیر، ہیضہ، کھٹی ڈکاروں، گٹھیا اور گنج کا شرطیہ علاج ہوتی ہے بلکہ چہرے کی رنگت سفید اور سفید بالوں کو کالا کرنے کے لیے بھی مزید کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

☆☆☆

ادھر سے ہماری توجہ ہٹی تو خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ ملاوٹ کا کام کرنے والوں کی انجمن ہے جنہوں نے لکڑی کے برادے، بھٹے کی لال اینٹوں کے سفوف اور کیکر کی چھال وغیرہ کی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے کر اتنا بڑا بنا دیا ہے۔ اب تک یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعمیر مکانات یا ایندھن کے کام کی سمجھی جاتی تھیں ہلدی، مرچ مسالوں اور چائے کے طور پر ان کا

استعمال کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ موبل آئل بھی فقط بسوں اور ٹرکوں وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کسی نے نہ سوچا تھا کہ یہ گھی کا نعم البدل ہے اور اس سے انسانی جسم کی گاڑی بھی خوش اسلوبی بلکہ زیادہ، تیزی اور تیز رفتاری سے چلائی جاسکتی ہے۔ زندگی کی راہ جو پہلے ساٹھ ستر، اسی سال میں طے ہوتی تھی، موبل آئل باقاعدگی سے استعمال کرنے والا اسے دو تین ہی سال میں طے کرلیتے ہیں۔

☆☆☆

اس پر ہم اپنے پرانے کرم فرما سیٹھ ہلدی بھائی، چونا بھائی، نوٹوں والے، پرانے کوٹوں والے کے پاس گئے اور اس انجمن کے بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے فوراً موبل آئل میں تر ترائی جلیبیوں کی پلیٹ ہماری طرف بڑھائی، جوہڑ کا پانی ملے دودھ کی چائے کے ڈبل کپ کا آرڈر دیا جس میں کیکر کی چھال کے علاوہ چنوں کا چھلکا بھی استعمال کیا گیا تھا، جو اعصاب کے لیے خصوصاً گھوڑوں کے اعصاب کے لیے مفید مانا گیا ہے۔ اس کے بعد جس ملے تمباکو کی بیڑی ہمیں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بابا، یہ انجمن ہماری نہیں ہے۔ ہم تو درویش گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شہرت سے ہمیں نفرت ہے۔ نام و نمود کا شوق نہیں، اسی لیے خفیہ تہہ خانوں میں اپنا کام کرتے ہیں اور پبلک کی خدمت بجالاتے ہیں۔ اگر کوئی منصفی کرے تو دیکھے کہ فیملی پلاننگ والوں سے زیادہ مفید کام تو ہم کرتے ہیں۔ آخر آبادی کو کم ہی تو کرنا ہے، پریذیڈنٹ صاحب نے یہی تو کہا ہے۔"

اس کے بعد بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے کتھے اور پیپل کی لکڑی کی سپاری کا پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ "حکومت کہتی ہے اناج بچاؤ۔ جب ہم نے اناج بچایا اور اپنے گوداموں میں بھر لیا۔ خود میرے تہہ خانے میں کئی سو بوریاں ہوں گی۔ تو اب حکم نکالا ہے کہ یہ بری بات ہے، اسے باہر نکالو، سستا بیچو۔ بابا، تم اخبار والا ہے، حکومت کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ رزق جیسی انمول چیز کو سستا کیسے بیچ دیں۔"

☆☆☆

اب ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ انجمن بسوں، ٹرکوں اور رکشہ والوں نے بنائی ہے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہمارا دھیان سب سے پہلے اس طرف کیوں نہ گیا، جو پبلک کی خدمت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور فٹ پاتھ پر ٹرک چلا کر اور نالے میں بس گرا کر ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہمت کرے تو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ ہم پتا پوچھتے پوچھتے ٹرک ٹرانسپورٹ یونین کے دفتر پہنچے تو اس کے سیکریٹری جنرل نے فوراً ٹرانسسٹر کی آواز دھیمی کر کے نسوار کی چٹکی سے ہماری تواضع کی اور کہا "ابھی حقہ تازہ کر کے لاتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے، صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی انجمن معین الاموات کی اس ماہ میں کیا کارگزاری ہے اور آیا بس والوں کا پلہ بھاری رہا ہے یا ٹرک اسے ہارن دیئے بغیر پاس کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

ہماری بات ان کی سمجھ میں آئی تو فوراً تھرڈ گیئر میں گفتگو کرنے لگے اور پھر فورتھ گیئر میں آنے کو تھے کہ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں سلامتی دیکھی۔ اس اثناء میں سامنے "انجمن معین الاموات شاخ کراچی" کا بورڈ نظر آگیا۔ ہم نے ہانپتے کانپتے اندر داخل ہو کر کہا۔

"صاحبو! ہماری مدد کرو......" اس پر ایک صاحب جو منگوں کے درمیان بیٹھے لٹھا ناپ رہے تھے بولے۔

"جناب ہمارا کام تو مردے کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانا ہے۔ زندوں کے امور میں ہم دخل نہیں دیتے۔ وہ سامنے ٹرک آرہا ہے، پہلے اس کے سامنے لیٹ جائیے پھر ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔"

عباس اشرف اعوان سے باتیں

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''عباس اشرف اعوان۔''
2 ''پیار کا نام؟''
''عباس ہی کہتے ہیں۔''
3 ''تاریخ پیدائش؟''
''21 دسمبر 1992ء۔''
4 ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 10 انچ/قوس۔''
5 ''مادری زبان؟''
''پنجابی۔''
6 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''آٹھ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر پانچواں ہے۔''
7 ''شادی؟''
''نہیں ہوئی۔''
8 ''تعلیم؟''
''ایم اے جرنلزم۔''
9 ''شوبز میں آمد؟ گھر والوں کا ردعمل؟''
''آٹھ سال جدوجہد کی 2016ء سے کمرشلز کرنا شروع کیے، 2019ء سے ڈراموں میں چانس ملنا شروع ہوا اور اب اللہ کا کرم ہے...... گھر والوں نے بہت سپورٹ کیا اور اب وہ بہت خوش ہیں۔''
10 ''بچپن کی ایک بری عادت جو مشکل سے گئی؟''
''غصہ جلدی آجاتا تھا۔''
11 ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''2013ء سے کمائی کا عمل شروع ہوا۔ ایک کال سینٹر میں جاب کی تھی۔ اور جو ملا تھا، وہ امی کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔''

12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''بچپن کا پہلا پیار فٹ بال تھا۔''
13 ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''جن دنوں شوٹ پر جانا ہو تو سورج جلدی نکل آتا ہے ورنہ دیر سے اٹھتا ہوں۔''
14 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''
''پانی۔''
15 ''کیا برداشت نہیں، بھوک یا غصہ؟''
''بھوک برداشت نہیں ہوتی۔''
16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''پاکستان میری جان ہے۔ مگر ہماری قوم لسانیت میں پھنس چکی ہے۔ سندھی، سندھی کو سپورٹ کرتے ہیں۔ پنجابی، پنجابی کو اسی طرح پٹھانوں اور بلوچیوں کا بھی یہی حال ہے، 14 اگست کے موقع پر ٹی وی اسکرین پہ جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم ایک ہیں، جبکہ ایسا نہیں ہے۔''
17 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''
''کسی ملک کی نہیں...... البتہ دنیا گھومنا چاہتا ہوں۔''
18 ''لاک ڈاؤن میں وقت کیسے گزارا؟''
''اللہ کا شکر ہے، میں کورونا کا شکار نہیں ہوا اور لاک ڈاؤن میں اچھا وقت گزرا کیونکہ رمضان بھی تھا۔''
19 ''شوبز میں کیا اچھا ہے، کیا برا ہے؟''
''شوبز میں جو لوگ آپ کو سپورٹ کریں وہ اچھے ہیں اور جو لوگ Leg puling (ٹانگ کھینچنے کی کوشش) کریں وہ آپ کی سوچ سے بھی زیادہ برے ہیں۔''
20 ''کھیلوں سے لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟''
''اسپورٹس سے لگاؤ ہے اور فٹ بال میری جان
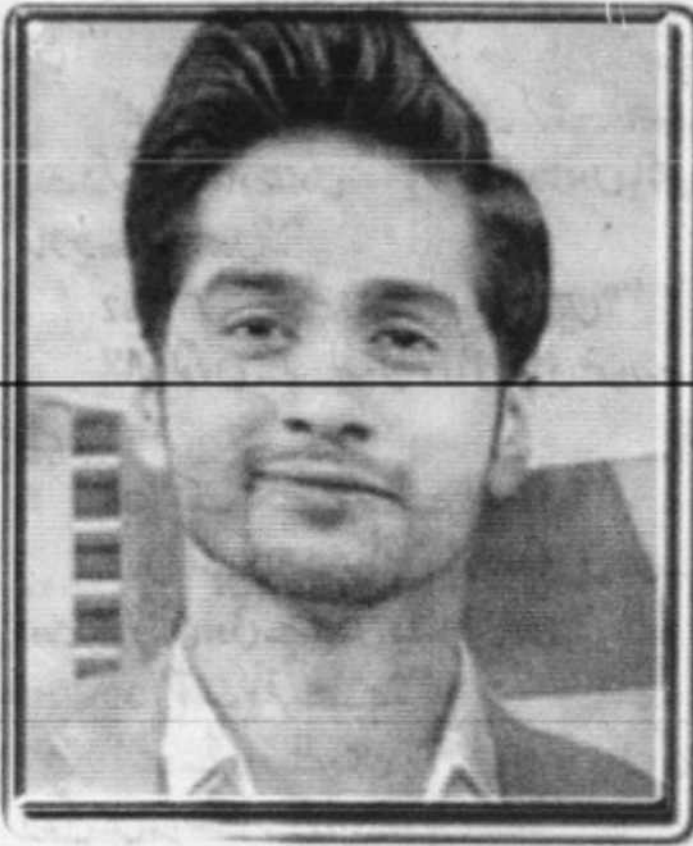
ہے۔“
21 ”زندگی سے کیا سیکھا؟“
”یہی کہ زندگی کسی بھی وقت آپ کا ساتھ چھوڑ سکتی ہے۔ جس نے زندگی دی ہے، اس ذات سے جڑ کر رہنا چاہیے۔ ایک مسجد بنوانا میرا خواب ہے۔“
22 ”تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟“
”ایک بہت اچھا سا موبائل فون...... کپڑے اور ضرورت کی کوئی بھی چیز۔“
23 ”گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ سیریل پسند آیا؟“
”قربتیں“ اور ”ثبات۔“
24 ”پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟“
”تب میرا جسم کانپ رہا تھا۔“
25 ”تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟“
”جب اپنے ساتھ چھوڑتے ہیں تب ہوتا ہے...... مگر اللہ ساتھ ہوتا ہے تو کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔“
26 ”دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟“
”جب ڈائریکٹر کہتے ہیں ”ایکشن“۔“
27 ”زندگی میں کچھ واپس ملنے کا موقع ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟“
”اپنے نانی نانا اور اپنے دادا دادی واپس لینا چاہوں گا۔“
28 ”بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟“
”بالکل لیتا ہوں اور لینا بھی چاہیے کیونکہ صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔“
29 ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟“
”اپنے والدین سے۔“
30 ”آپ کے اب تک کے ڈراموں کی تعداد، نام بھی بتائیں؟“

”پری ہوں میں، استانی جی، کبھی بینڈ کبھی باجا، قربتیں، ثبات“ ان کے علاوہ اور بھی ہیں مگر ان سیریلز نے کافی اچھا بزنس دیا۔“
31 ”رومینٹک کردار آسانی سے کر لیتے ہیں یا نیگیٹیو؟“
”کام کام ہے......کوئی بھی رول ہو آسانی سے کر لیتا ہوں۔“
33 ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“
”ابھی تک تو اللہ کا کرم ہے کہ جو فیصلہ کیا اس میں سب اچھا ہی ہوا۔“
34 ”کچن سے لگاؤ؟ کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟“
”بالکل بھی نہیں ہے اور نہ ہی کبھی شیف بننے کا سوچا ہے۔“
35 ”آپ برانڈ کانشس ہیں؟“
”نہ خود ہوں اور نہ ہی مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو برانڈ کانشس ہیں کیونکہ میں اکثر مہنگے لباس میں اندر سے غریب اور غریب لباس میں اندر سے امیر لوگ دیکھتا ہوں۔ بہت برے لگتے ہیں اسٹیٹس کونشس لوگ۔“

36 ''موبائل فون نہ اٹھانے پر کیا بہانا کرتے ہیں؟''
''اول تو اٹھا لیتا ہوں۔ بہانا نہیں کرتا...... جب بات نہ کرنی ہو تو بتا دیتا ہوں...... یا تو سو رہا ہوتا ہوں یا پھر نماز پڑھ رہا ہوتا ہوں۔''
37 ''کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟''
''ان لوگوں کے لیے جن کو واقعی میری ضرورت ہے۔''
38 ''ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟''
''ماں باپ کی دعائیں فقیر کو بادشاہ بنا دیتی ہیں۔ اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میں یہ دعائیں لوں۔''
39 ''آپ کو نفرت ہے؟''
''جھوٹے، دوغلے، نان پروفیشنل اور دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنے والے لوگوں سے۔''
40 ''کبھی غربت میں وقت گزارا؟''
''جب 2018ء میں جدوجہد کر رہا تھا ایک ڈرامے کے لیے کہ چانس مل جائے تو اس وقت تھوڑا ٹائم غربت میں گزرا۔''
41 ''ڈرائیونگ کے وقت کون سا گانا زیادہ سنتے ہیں؟''
''Serhat Durhums، Schiller ڈریمرز کے سارے سانگ۔''
42 ''حکیم، ڈاکٹر، ہومیو پیتھک کس پر زیادہ یقین ہے؟''
''پہلے تو اللہ پر بھروسا ہے پھر ''حجامہ'' پر کیونکہ حجامہ کروانے سے بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد ہومیو پیتھک پر۔''
43 ''کیا دل سے اترا ہوا شخص دوبارہ اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے؟''
''میں معاف کر دیتا ہوں...... سب اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر دوبارہ بھروسا نہیں کر سکتا۔''
44 ''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''
''فی الحال تو ''ماسک'' اور سینیٹائزر فری ملنے چاہئیں۔''
45 ''محفل میں بیٹھ کر موبائل استعمال کرنے والوں کے لیے کیا کہیں گے؟''
''جو لوگ ایسا کر رہے ہوتے ہیں در حقیقت وہ بور ہو رہے ہوتے ہیں اور اگر میرے دوست سنجیدہ ڈسکشن کے دوران ایسا کرتے ہیں تو میں ان سے ان کا فون چھین لیتا ہوں۔''
46 ''ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟''
''اپنی فیلڈ سے متعلق آفر آئے تو میں وہاں کام کرنا پسند کروں گا۔''
47 ''غصے میں آپ کا ری ایکشن؟''
''میری آواز اونچی ہو جاتی ہے۔''
48 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''
''ٹاک شو شوق سے نہیں دیکھتا، اس لیے کوئی خاص پسند بھی نہیں ہے۔''
49 ''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''
''کوئی نصیحت بری نہیں لگتی۔ کیونکہ نصیحت ہماری بھلائی کے لیے ہوتی ہے۔''
50 ''جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟''
''سنگل بہتر ہے۔ اکاؤنٹ اپنا اپنا۔''
51 ''ایک ڈیٹ جو آج تک یاد ہے؟''
''اپنی سالگرہ کی ڈیٹ۔''
52 ''ایک کھانا جو کسی بھی وقت کھا سکتے ہیں؟''
''پزا۔''
53 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟''
''جو کمی مجھے نظر آتی ہے وہ کبھی کسی کو نظر نہیں آئے گی کیونکہ انسان اپنی غلطیاں خود بہتر سمجھ سکتا ہے تو جو مجھے کمی نظر آتی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''
54 ''ریموٹ کس چینل پہ رک جاتا ہے؟''
''اسپورٹس چینل پہ۔''
55 ''پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟''
''ایکشن جیکسن۔''
56 ''کھانا پسند ہے یا کوکنگ؟''
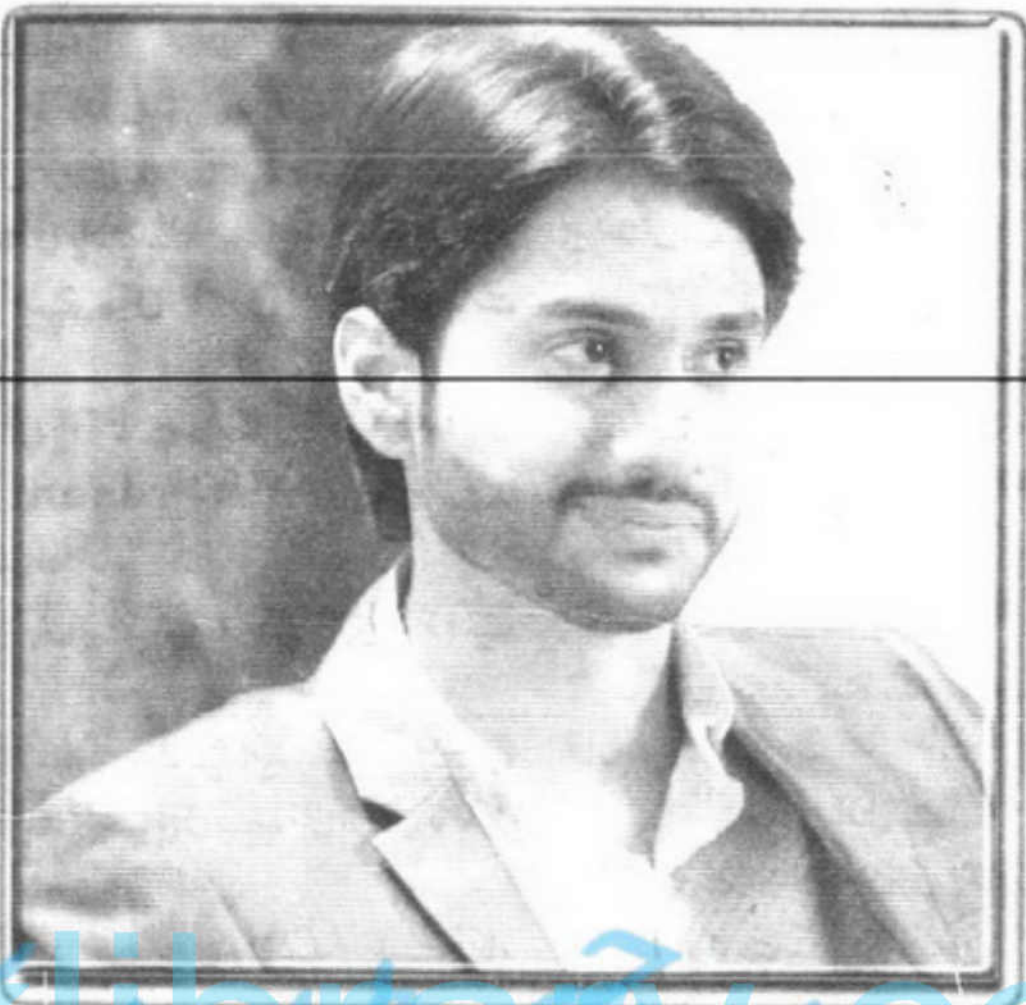
''کھانا پسند ہے کوکنگ نہیں۔ جنک فوڈ زیادہ پسند ہیں۔''

57 ''اس فیلڈ میں اپنا استاد کسے مانتے ہیں؟''

''کافی سارے نام ہیں۔ آپ ضرور لکھیں پلیز...... دلاور ملک صاحب، شہزاد کاشمیری صاحب، عظیم سجاد صاحب، عدیل قمر خان، کامران احمد اکبر، انجلین ملک'' اور ندا فاطمہ زیدی صاحبہ۔''

58 ''کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟''

''مجھے صرف اور صرف نیگیٹو رول کرنے کی خواہش ہے۔''

59 ''آپ کا ناقابل فراموش کردار؟''

''عاطف (ڈرامہ سیریل ثبات) خرم (ڈرامہ سیریل قربتیں)۔''

60 ''کسی کردار کو کرنے سے انکار کیا؟''

''نہیں......کام، کام ہے کسی رول سے انکار نہیں کرتا۔''

61 ''کس سیاست داں کا کردار کرنا چاہتے ہیں؟''

''کسی کا بھی نہیں۔''

62 ''چاند پر پہنچ کر دنیا میں سب سے پہلا پتھر کسے ماریں گے؟''

''کسی کو نہیں، کیونکہ میرے سارے معاملات کا حل میرا اللہ وقت کی مار دے کے نکال دیتا ہے۔''

63 ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''

''بس مرنے سے پہلے ماں باپ کو حج کرانا اور ایک مسجد تعمیر کروانا ہے۔''

64 ''کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟''

''صرف ایکٹنگ کرنے کے لیے بہت سوچتا ہوں۔''

65 ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''

''مجھے تو بس پیزا پسند ہے۔''

66 ''آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟''

''بہت زیادہ۔''

67 ''کیا شادی کرنا ضروری ہے؟''

''بالکل ضروری ہے اور ہمارا مذہب بھی کہتا ہے کہ شادی جلدی ہونی چاہیے۔''

68 ''اپنے ماضی کو سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟''

''اپنا کل یاد آتا ہے۔ مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے حال (Present) کو بہتر کروں۔ کیونکہ گزرا ہوا کل بدلا نہیں جاسکتا۔''

69 ''سگنل پہ کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟''

''جو چھوٹے چھوٹے بچے بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں، انہیں دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ بس ان ہی کا جائزہ لیتا ہوں۔''

70 ''بچپن میں فلم، ٹی وی کے کون سے فنکار پسند تھے؟''

''بچپن میں بس فلمیں دیکھنے کا شوق تھا اور زیادہ تر ''بالی ووڈ'' کی فلمیں دیکھتا تھا۔''

71 ''خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟''

''کوئی ایک نہیں ہے سب ہی میرے لیے قابل احترام ہیں۔''

73 ''شاپنگ پہ جاتے ہیں تو سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟''

''سب سے پہلے تو کچھ کھانے کا خیال آتا ہے بعد میں کچھ خریدنے کا۔''

74 ''کب اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا؟''

''جب میں پہلی بار ایک ـــــ کمرشل کے لیے بنکاک گیا تھا۔''

75 ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''

''نہیں نہیں بالکل نہیں...... ایسی عادت ہی نہیں۔''

76 ''اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟''

''سب سے پہلے اللہ کی راہ میں...... پھر ماں باپ کو دیتا ہوں اور پھر اپنے وارڈ روب کے لیے اور ہیر اسٹائل کے لیے کچھ خریدتا ہوں۔''

77 ''کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''

''نہیں...... بالکل نہیں کیونکہ یہ میرے مذہب میں شرک کہلاتا ہے۔''

78 ''اگر کسی سیلیبریٹی کا انٹرویو کرنا پڑے تو کس کا کریں گے؟''

''Heath Ledger کا وہ فلم ''ڈارک نائیٹ'' میں ''جوکر'' بنے تھے، مطلب جوکر کا کردار کیا تھا۔''

79 ''نیند کتنی پیاری ہے؟''

''بہت...... اور اگر میری نیند پوری نہ ہو تو میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔''

80 ''آپ کے علاوہ کون اس فیلڈ میں ہے آپ کے گھر میں؟''

''میرے بڑے بھائی عمران اشرف اس فیلڈ میں ہیں۔''

81 ''بچت کس شکل میں کرتے ہیں۔ سونا، جائیداد یا پرائز بانڈ؟''

''بچت کیش کی شکل میں ہی رکھتا ہوں۔ نہ بانڈ نہ ہی جائیداد۔''

82 ''شادی میں کون سی رسم کے خلاف ہیں؟''

''سب رسموں کے خلاف ہوں۔ سادگی سے نکاح اور رخصتی بس۔''

83 ''ٹی وی کے کس پروگرام کو بند ہو جانا چاہیے؟''

''میں زیادہ ٹی وی نہیں دیکھتا ہوں۔''

84 ''آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟''

''فکر آج کی بھی اور کل کی بھی...... مگر میں سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔''
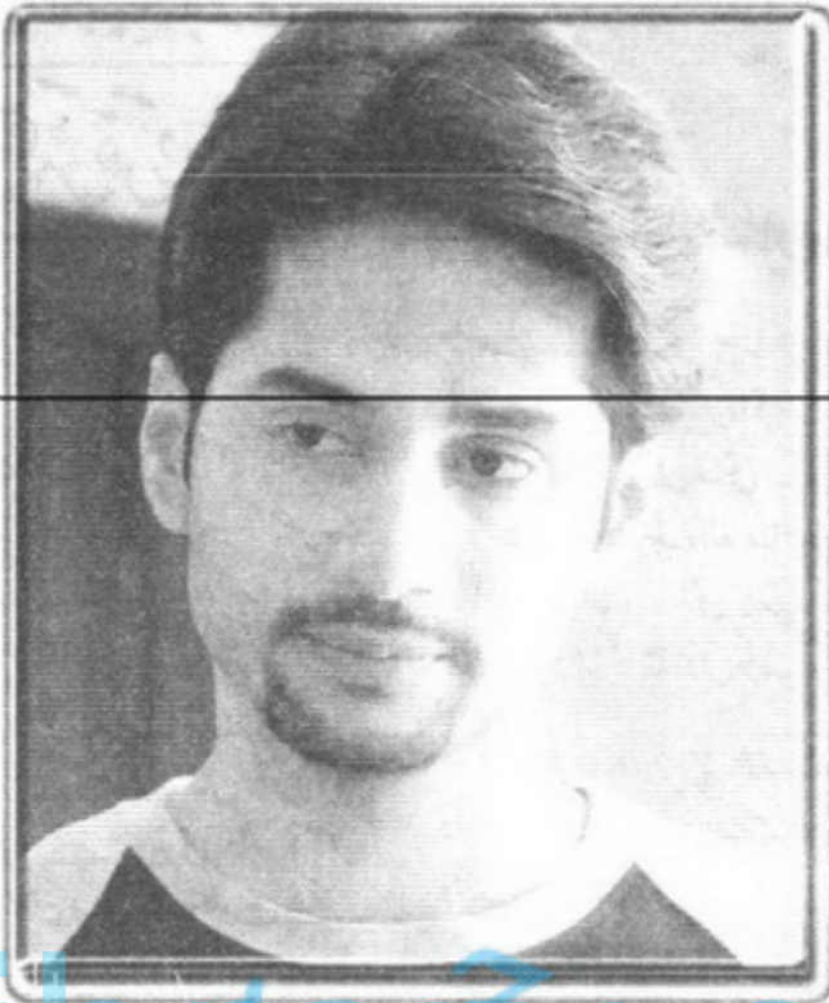
85 ''فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟''
''میرے والد صاحب سب سے زیادہ مزاج کے گرم ہیں۔''
86 ''کس عمر میں آپ کو موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی؟''
''اٹھارہ سال کی عمر میں سیل فون ملا تھا۔''
87 ''غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟''
''غصے میں سوائے گالی کے کوئی بھی لفظ پہلے نہیں نکلتا ہے۔''
88 ''پسندیدہ تہوار؟''
''عید کے تہوار۔''
89 ''مرنے کے سین کرنا کیسا لگتا ہے؟''
''مرنے کے سین بہت مشکل ہوتے ہیں کیونکہ اس سے آپ کے کافی اموشن (جذبات) جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔''
90 ''اپنے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا دوسروں کے؟''
''اپنے تجربے سے سیکھتا بھی ہوں اور فائدہ بھی اٹھاتا ہوں۔''
91 ''کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''پانی۔''
92 ''مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟''
''باہر کا کھانا بہت زیادہ کھاتا ہوں۔''
93 ''کیا لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''
''موبائل فون۔''
94 ''کھانا کہاں کھانا پسند کرتے ہیں۔ اپنے بیڈ پر، چٹائی پر یا ڈائننگ ٹیبل پر؟''
''اپنے بیڈ پر۔''
''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''
''میں اپنی اوقات میں رہتا ہوں اور میرا یہ ماننا ہے کہ اوقات میں رہنے والے کو اللہ کبھی زوال نہیں دیتا۔ اللہ دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی۔''

☆

چائلڈ اسپیشلسٹ

ڈاکٹر فرید الدین سے ملاقات

شاہین رشید

''کیا حال ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''الحمدللہ۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''میرا نام ڈاکٹر محمد فرید الدین ہے...... میرے والدین کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ والد صاحب کا آج سے بارہ سال قبل انتقال ہوگیا۔ جبکہ والدہ الحمدللہ حیات ہیں۔ ہم دو بہن بھائی ہیں...... میری چھوٹی بہن ڈاکٹر جاز یہ پہلے آسٹریلیا میں رہتی تھی اور اب دبئی میں رہتی ہے۔ میری بیگم اسکن اسپیشلسٹ ہیں۔ ان کا نام ڈاکٹر سطوت ہے۔ ہمارے ماشاء اللہ دو بچے ہیں اور دونوں ماشاء اللہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے ''ایم بی بی ایس'' بقائی یونیورسٹی سے کیا جو پہلے بقائی میڈیکل کالج تھا...... جناح اسپتال کے ساتھ جو بچوں کا اسپتال ہے Nich وہاں سے ہاؤس جاب کی...... ہاؤس جاب کے بعد میں نے انڈس اسپتال جوائن کیا...... اور یہاں بہ حیثیت Paediatric سروسز ہوں اور شام میں میری پریکٹس میمن اسپتال میں ہوتی ہے اور بچوں کی اسپیشلٹی میں مجھے بیس سال کا تجربہ ہوگیا ہے الحمدللہ۔''

''کیسے طالب علم تھے...... بچپن کیسا گزرا؟''

''میں کوئی بہت پڑھا کو قسم کا طالب علم نہیں تھا...... ہاں ایوریج ضرور تھا، مگر اسکول کالج جانے کا بہت شوق تھا اور باقاعدگی کے ساتھ جاتا تھا...... کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا، کھیل کود سے لگاؤ تھا۔ اسکول کی گیمز ٹیم میں تھا۔ ٹیبل ٹینس، ہاکی اور کرکٹ بہت شوق سے کھیلتا تھا اور اب بھی جب موقع ملتا ہے تو اسکواش اور بیڈمنٹن وغیرہ ضرور کھیلتا ہوں...... اور پڑھائی کے سلسلے میں جیسا کہ میں نے کہا کہ ایوریج تھا تو پڑھائی کے سلسلے میں امی سے مار بھی پڑتی تھی...... اور آج جو کچھ ہوں، امی کے جوتوں اور ڈنڈوں کی بدولت ہوں۔ جبکہ والد صاحب کا غصہ ہمارے لیے کافی ہوتا تھا...... امی جب کہہ دیتی تھیں کہ نہیں پڑھو گے تو ابا کو بتا دوں گی۔ تو بس وہی ہمارے لیے کافی ہوتا تھا اور ہم پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ والدین نے پڑھائی کے سلسلے میں بہت گائیڈ کیا...... والدین نے ہماری تربیت میں دو چیزوں پر بہت توجہ دی۔ ایک غذا پر اور دوسری تعلیم پر، دونوں نے بہت دل کھول کر ہم پر خرچ کیا...... بس خواہش کرنے کی دیر ہوتی تھی کہ وہ چیز حاضر ہو جاتی تھی۔''

''میڈیسن کی طرف رجحان تھا یا دلایا گیا؟''

''میرے بیالوجی میں ہمیشہ اچھے نمبرز آتے تھے تو کبھی کبھار خیال آتا تھا کہ میڈیسن سائیڈ پر چلا جاؤں۔ لیکن دوسری طرف انجینئرنگ کی طرف میرا زیادہ رجحان تھا اور میں نے اپنے والدین سے بھی بہت اصرار کیا کہ آپ مجھے انجینئرنگ میں داخلہ لینے دیں۔ لیکن چونکہ والد صاحب بینکر تھے تو ان کی خواہش تھی کہ میں ان کی فیلڈ کی طرف یا انجینئرنگ کی طرف نہ جاؤں بلکہ ڈاکٹر بنوں اور میرا اپنا ایک کلینک ہونا چاہیے...... اور یہ بہت زیادہ باعزت پروفیشن ہے اور اس پروفیشن میں بہت زیادہ دعائیں بھی ملتی ہیں...... اور اس وقت مجھے لگتا تھا کہ ان کا فیصلہ غلط ہے...... لیکن ڈاکٹر بننے کے بعد احساس ہوا کہ ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا...... اور واقعی مجھے اس پروفیشن میں بہت دعائیں ملتی ہیں...... اور والدین کا ہر فیصلہ

اولاد کے لیے درست ہوتا ہے...... میری شادی کا فیصلہ بھی والدین کا تھا اور میری خالصتاً ارینج میرج ہے۔"

"چائلڈ اسپیشلسٹ بننے کا خیال کیسے آیا؟"

"مجھے بہت شروع میں ہی یعنی جب میں تھرڈ ایئر میں آیا تو جب پہلی بار میں بچوں کے وارڈ میں گیا تو بس اسی وقت ذہن میں سوچ لیا کہ مجھے بچوں کا ہی ڈاکٹر بننا ہے۔ سب نے کہا کہ سرجری میں چلے جاؤ، اس میں پیسہ بہت ہے تو میں یہی کہتا تھا کہ مجھے پیسے کے لیے کام نہیں کرنا۔ میں تو وہ کام کروں گا جہاں میرے دل کو تسلی ہوگی اور ویسے بھی مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے بہت شفقت ہے...... اور میں بہت خوش ہوں کہ میں نے بہت اچھی فیلڈ کا انتخاب کیا ہے۔"

"بچوں میں کون سی بیماریاں "کامن" ہیں؟"

"بچوں میں جو کامن بیماریاں ہیں، ان میں سانس کا مسئلہ ہے یا پھر پیٹ کے مسائل ہیں......اور بہت ہو تو پھر ٹائیفائیڈ، ملیریا جو کہ موسم کے حساب سے چل رہی ہوتی ہیں۔ فلو کے مسائل اور مریض زیادہ آتے ہیں......اور آج کل چونکہ موسم ہر لمحے بدلتا رہتا ہے تو بچے اس سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں......

جب میں بہ حیثیت ڈاکٹر کے پریکٹکل لائف میں آیا تھا یعنی جب ہاؤس جاب کر رہا تھا تو بچوں کے اسپتال میں ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی دس بائی بارہ کے کمرے میں تقریباً بارہ بچے ایک ساتھ موجود تھے اور ان میں زیادہ تر بچے ڈائریا کے ساتھ آئے تھے......اور مجھے اس وقت یہی گمان ہو رہا تھا کہ پتا نہیں میں ان کا علاج ٹھیک طریقے سے کر بھی پاؤں گا کہ نہیں۔ اس لیے کہ مجھ سے بچوں کا رونا نہیں دیکھا جاتا......اور اس وقت سب بچے رو رہے تھے......

لیکن پھر وقت نے بہت کچھ سکھا دیا اور یہ بھی سکھا دیا کہ ان کے رونے کو دل میں بٹھا کر ڈپریشن میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ان کے لیے کچھ کام

کریں۔ مطلب اپنے جذبات اور پیار کو قابو میں رکھ کر ان کا علاج کریں تاکہ یہ جلدی ٹھیک ہوجائیں......

اسی جذبے کے تحت کام کیا اور اللہ نے بہت ساتھ دیا......اور اس مقام پر ہوں۔"

"دیکھا گیا ہے کہ بچوں کی ذرا سی بھی تکلیف والدین کو پریشان کر دیتی ہے......اور وہ فوراً ڈاکٹر کی طرف بھاگتے ہیں تو کیا ایسا ہی کرنا چاہیے؟"

"موسمی تبدیلیوں کے ساتھ طبیعت میں جو تبدیلیاں آتی ہیں۔ جیسے نزلہ، زکام، بخار اس پر والدین کو بہت جلدی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر بچے کو بخار ہوا ہے۔ تو والدین چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بخار ختم ہوجائے اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہیں کرتے۔ فوراً

اینٹی بائیوٹک شروع کر دیں گے۔ فوراً انجکشن لگوانا شروع کر دیتے ہیں......اور اس وقت ایسے والدین کے لیے سب سے بہترین ڈاکٹر وہ ہے، جس کی ایک خوراک سے بچہ ٹھیک ہو گیا ہو یقین مانیے ایسی کوئی بیماری نہیں ہوتی جو ایک خوراک سے ٹھیک ہوجائے۔

ہاں یہ صرف اسٹرائیڈ (steroid) کا ہی کمال ہو سکتا ہے اور یہ غلط طریقہ علاج ہے......

میں اینٹی بائیوٹک کے سخت خلاف ہوں اگر وائرل بیماریوں میں دی جائے تو...... ہمارے یہاں بچوں میں قوت مدافعت ذرا کم ہوتی ہے اور ان کو ٹھیک ہونے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ وائرل بیماری میں دو تین دن لگتے ہیں کہ باڈی اپنی قوت مدافعت کو بہتر کرتی ہے اور پھر دوا کا رزلٹ آتا ہے...... قوت مدافعت کو بڑھانے کے لیے بچوں کی خوراک کا خیال رکھیں۔ ان کی خوراک میں پروٹین کا استعمال کریں جیسے دودھ، انڈا گوشت، دالیں ضرور دیں......

ہمارے یہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اینٹی بائیوٹک سب کے پاس سے مل جاتی ہیں۔ فارمیسی میں مل جائیں گی...... میڈیکل اسٹور سے مل جائیں گی اور پرچون اور پانی والی دکان سے بھی مل جائیں گی اور کسی prescription (نسخہ) کے بغیر با آسانی مل جاتی ہیں...... اور ہمارے پاس اکثر لوگ اینٹی بائیوٹک لے کر آتے ہیں یا استعمال کر کے آتے ہیں تو یہ بہت غلط رجحان ہے۔ جب اس کے اثرات غلط ثابت ہوتے ہیں یا سائیڈ افیکٹ ہوتے ہیں پھر مجبوراً یا تو انجکشن دینے پڑتے ہیں یا پھر اسپتال میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ خود سے اینٹی بائیوٹک کا استعمال خطرناک ہے۔''

''کون سی بیماریاں موروثی ہوتی ہیں اور کون سی پیدائشی ہوتی ہیں؟''

''ہم موروثی بیماری اسے کہتے ہیں جو ہماری جینز میں ہوتی ہیں...... یعنی ایسی بیماریاں جو خاندان کے اندر چلی آرہی ہیں...... اور یہ ہم ان خاندانوں میں زیادہ دیکھتے ہیں جہاں کزنز میرج ہوتی ہیں......

خاندان کے اندر یا برادری میں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے تھیلیسمیا ہے، یہ بہت کامن بیماری ہے اور اب تو یہ لاء بھی پاس ہو چکا ہے کہ شادی سے پہلے آپ کو اپنا ٹیسٹ کروالینا چاہیے کہ ان کے اندر کہیں تھیلیسما کے جراثیم تو نہیں مگر آپ دیکھ لیں کہ یہ ٹیسٹ کوئی نہیں کرواتا۔ اس ٹیسٹ میں یہ دیکھتے ہیں کہ ماں اور باپ یعنی لڑکی اور لڑکے میں اگر تھیلیسما کے جز اگر موجود ہیں تو سمجھ لیں کہ 25 فیصد چانس ہیں کہ آپ کے بچے کو یہ بیماری ہو سکتی ہے...... اور اس بیماری میں ساری زندگی یا تو خون لگنا ہے (چڑھنا ہے) یا ساری زندگی دوائیں کھانی ہیں۔ یہ موروثی بیماری کی ایک مثال ہے اور بعض بیماریاں پیدائشی ہوتی ہیں۔ جن میں ڈلیوری میں پیچیدگی یا بچہ دیر سے رویا...... یا پیدائشی نمونیہ ہوا جو بچے پیدائش کے فوراً بعد نہیں روتے، ان کے دماغ کو آکسیجن دیر سے پہنچتی ہے جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی کے لیے مفلوج بھی ہو سکتے ہیں۔''

''آج کل کی مائیں فوراً ہی بچے کو فیڈر لگا دیتی ہیں یہ کس حد تک درست ہے؟''

''ہمارے مذہب میں اور قرآن پاک میں بھی ہے کہ مائیں دو سال تک بچے کو اپنا دودھ پلائیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب مائیں بچوں کو فیڈر دینے کا کہتی تھیں تو نانی، دادی بہت برا مانتی تھیں کہ یہ کس طرح کی ماں ہے کہ جو بچے کو اپنا دودھ نہیں پلا رہی...... لیکن اب ٹرینڈ بدلتا جا رہا ہے۔ کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ ایک نانی سے میری اسی بات پر بحث ہو رہی تھی جب وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ بچے کے لیے اوپر کا دودھ لکھ کر دیں۔ لیکن اب بھی ہم تو یہی کہتے ہیں۔ بچے کی بہترین غذا ماں کا دودھ ہے اور اب گائیڈ لائن تھوڑی سی بدل گئی ہے کہ اب ماں اگر بچے کو فیڈ کروا رہی ہے تو چھ ماہ تک اپنا ہی فیڈ دے اور اگر ماں کو لگتا ہے کہ بچے کو مدر فیڈ سے زیادہ کی ضرورت ہے تو پھر آپ نرم غذا کے ساتھ اپنا فیڈ کرائیں...... ماں کی غذا ٹھیک نہیں ہو گی تو ماں کی فیڈنگ ٹھیک نہیں ہو گی۔ ماں کی غذا میں ماں کو ہر چیز کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں دیکھا گیا ہے کہ کہا جاتا ہے ماں اگر کھچڑی کھالے گی یا چاول کھالے گی تو بچے
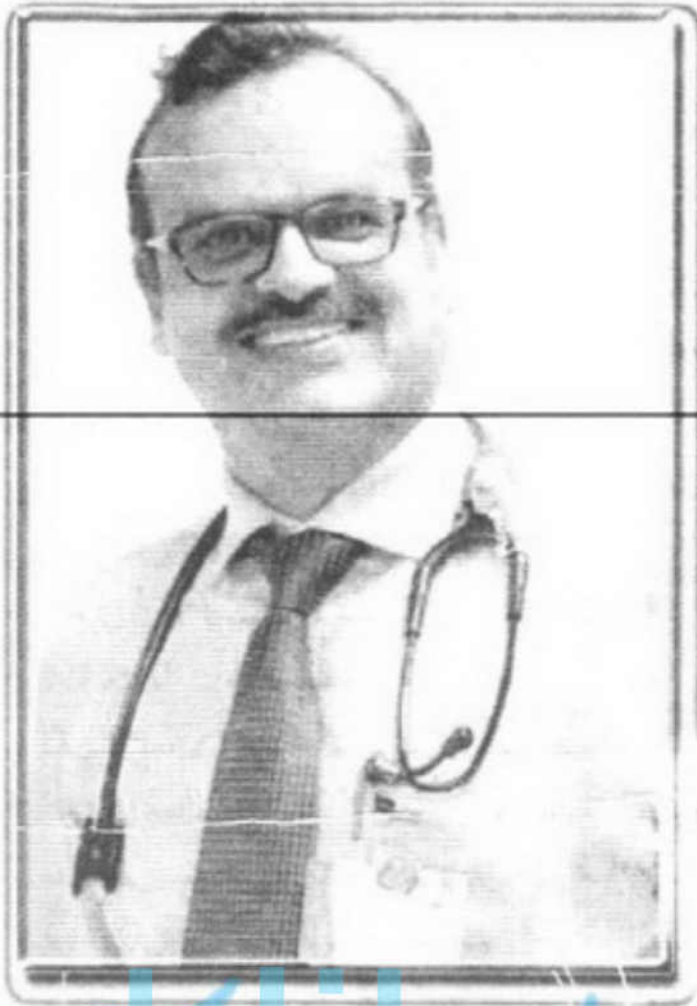
کو سانس کا مسئلہ ہو جائے گا۔ ماں نے ٹھنڈا پانی پی لیا یا کیلا کھا لیا تو بچے کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔ اس کو ٹھنڈک لگ جائے گی۔ یہ سب کی سب غلط باتیں ہیں......

سب اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اور ہم اس کی نعمتوں کو ٹھکرا رہے ہوتے ہیں۔ بچے کو غذا میں سب کچھ دیں۔ کھچڑی، دلیا، سوجی، چاول، کیلا سب کچھ جب بچے کو اچھی غذا دیں گے تو بچہ طاقت ور ہوگا...... اور جو بھی غذا دیں، دیسی گھی اور مکھن کا استعمال ضرور کریں۔"

"جو بچے گونگے بہرے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کیا وجہ ہوتی ہے؟ اور اگر ایک بچہ ایسا ہی ہے تو کیا دوسرا بھی ایسا ہو سکتا ہے؟"

"جو بچے گونگے بہرے پیدا ہوتے ہیں، اس کی کچھ بیماریاں اور وجوہات ہیں اگر حمل کے دوران ماں کو کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ سے بھی بچے گونگے بہرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کچھ غلط دوائیاں استعمال کرنے سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ آج کل ایک پروگرام شروع کیا ہے، ہم نے انڈس اسپتال میں اور میمن اسپتال میں اسے ہم "نیو بورن ہیرنگ اسکرین" کہتے ہیں یعنی بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ایک آلہ کان میں لگا کر چیک کر لیتے ہیں کہ بچے میں سننے کی صلاحیت ہے کہ نہیں اور اگر نہ ہو تو پھر ایک اور ٹیسٹ کرتے ہیں کنفرم کرنے کے لیے...... اور اگر ایک بچہ ایسا ہے تو دوسرے بچے کے وقت ہم ماں کے ضرور ٹیسٹ کرواتے ہیں...... اور دوران حمل ماں کی صحت و خوراک کا بہت خیال رکھیں تاکہ بچے صحت مند پیدا ہوں۔"

"کھانے کے معاملے میں مائیں بچوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہوتی ہیں...... تو بچوں کو کیا غذا دیں کہ وہ شوق سے کھائے؟"

"عمر کے حساب سے بچے کے لیے ہر طرح کی غذا بہت ضروری ہے۔" جو موسم کا پھل ہے جو موسم کی

سبزی ہے وہ بچوں کو دینا بہت ضروری ہے۔ ڈائیٹ کا بیلنس رکھیں اور دودھ، انڈا، گوشت، دالیں، سبزیاں، پھلی سب کچھ دیں اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی غذاؤں پر زیادہ توجہ دیں۔ یہ جو ڈبوں میں پیک غذائیں ہوتی ہیں جو کہ نہ جانے کب سے پیک ہوتی ہیں اور جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ بچوں کی پہلی غذا...... ان سے اپنے بچوں کو دور رکھیں...... بچوں کی پہلی ٹھوس غذا پہلے بھی کھچڑی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی اور یہ غذا گھر میں آرام سے بن سکتی ہے اور ایک اہم بات کہ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے پر توجہ دیں اور عادت بھی ڈالیں...... تاکہ بچہ آپ کو کھاتے ہوئے دیکھے تو اسے کھانے کے آداب بھی آئیں۔ طور طریقے اور تمیز بھی آئے۔

بچوں کی غذا میں تیز مرچوں کا استعمال نہ کریں اور بازار کے کھانوں خاص طور پر فاسٹ فوڈ سے دور رکھیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے بھی بچوں کی صحت کے بہت پرابلمز آ رہے ہیں۔ کولڈ ڈرنکس اور بازار کے

جوسز جو ڈبوں میں پیک ہوتے ہیں، ان سے بچوں کو دور رکھیں۔ تازہ پھلوں کا جوس دیں۔

"بعض بچے بڑے قد کاٹھ کے نہیں ہوتے تو یہ کوئی پریشانی والی بات ہے؟"

"اگر ماں یا باپ پانچ فٹ کے ہیں تو ان کا بچہ چھ یا ساڑھے چھ فٹ کا نہیں ہوگا...... بچے کی نیند اور غذا کو بیلنس رکھیں...... ہمارے جسم میں ایک خاص ہارمون ہے جو گروتھ ہارمون کہلاتا ہے اور جو ہماری باڈی میں secrete اس وقت ہوتا ہے جب ہم گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں اور یہ secrete ہوتا ہے رات بارہ بجے سے رات دو بجے تک اور اگر اس ٹائم میں آپ کا بچہ گہری نیند میں نہیں گیا ہے تو ظاہری بات ہے، بچے کا قد چھوٹا رہے گا...... اور اسی لیے میں سب سے کہتا ہوں کہ بچوں کو نو یا زیادہ سے زیادہ دس بجے تک سلانے کی عادت ڈالیں......

ہمارے یہاں بہت فخر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا بچہ تو سب کو سلا کر سوتا ہے۔ یا یہ کہ بچے کے والد رات کو دیر سے آتے ہیں تو جب تک بچہ ان کے ساتھ ایک گھنٹہ کھیل نہ لے، وہ سوتا نہیں ہے۔ کبھی یہ ظلم نہ کریں۔ اس کے علاوہ بچے کو اسٹریس سے دور رکھیں گھر کی باتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ لڑائی ہو رہی ہوتی ہے اور بچے کے سامنے ہو رہی ہوتی ہے۔ بچے ان باتوں کا بہت اثر لیتے ہیں ذہن میں بٹھاتے ہیں۔ اس طرح نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں۔ صحت پر برے اثرات پڑتے ہیں اور ذہنی نشوونما میں رکاوٹ آتی ہے...... لیکن اگر بچے کا وزن ٹھیک ہے، صحت مند بھی ہے اور کوئی پرابلم بھی نہیں ہے تو پھر بھی قد نہیں بڑھ رہا اور پھر کچھ ٹیسٹ کروانے کی ضرورت ہوتی ہے......

اور ضرورت پڑنے پر دوائیں بھی دیتے ہیں...... اور انجکشن بھی دیتے ہیں...... اور بچے بہتر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے اپنے گھر میں وجہ تلاش کریں اور وجہ تلاش کرنے کے بجائے ہم کسی بھی طریقے سے قد بڑھانے کا سوچیں تو یہ غلط ہوگا۔"

"ماؤں کو بہت فکر ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ کھاتا نہیں ہے، پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہوتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہوتی ہے؟"

"میں عام طور پر ساری ماؤں سے یہ کہتا ہوں کہ ایسا کوئی ٹانک نہیں ہے کہ جس سے بچہ ایک دم سے کھانا شروع کر دے گا۔ اگر ایسے ٹانک ہوتے تو آج کوئی بھی بچہ کمزور نہیں ہوتا۔ سارے بچے موٹے تازے ہوتے...... ہاں ملٹی وٹامنز ایسے ہیں کہ اگر بچے کی غذا میں کچھ کمی ہو رہی ہوتی ہے تو وہ پورا کر لیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی بچے کی خوراک میں فولاد کی کمی ہے تو ہم فولاد کا شربت دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر بضد ہو جاتے ہیں کہ جب تک بچے کو بھوک کا شربت نہیں دیں گے۔ بچہ کھانا نہیں کھائے گا...... یہ سب نفسیاتی اثرات ہیں۔ تو جتنا نیچرل طریقے سے دے سکتے ہیں دیں، یہی بہتر طریقہ ہے۔"

"آپ گھریلو ٹوٹکوں پر یقین رکھتے ہیں؟"

"مجھے گھریلو ٹوٹکوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن کچھ ٹوٹکے پرابلم کری ایٹ کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد شہد دینا ہے، بالکل ٹھیک، میں مانتا بھی ہوں اور سنت بھی ہے لیکن اس بات کا ضرور خیال کر لیں کہ شہد اصلی بھی ہے کہ نہیں...... شہد کے ساتھ نوزائیدہ بچوں کو بہت خطرناک قسم کے انفکشن بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ ایک سال کی عمر تک کے بچوں کو شہد نہیں دیا جاتا......

اسی طرح بچے کی ناف سرمہ لگا رہا ہے کوئی ناف پہ کوئلہ لگا رہا ہے تو کوئی "ناف پہ" نسوار لگا رہا ہے تو آپ کو بتاؤں کہ اس سے بھی بہت خطرناک قسم کے انفکشن ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات بچے کی جان بھی چلی جاتی ہے۔ ہم تو آنکھوں میں سرمہ بھی لگانے سے منع کرتے ہیں کہ اس سے بھی انفکشن ہونے کے چانس ہوتے ہیں......

میں کھانے پینے کی چیزوں سے کبھی منع نہیں کرتا ...... آپ ادرک اور شہد دیں۔ آپ قہوہ ضرور دیں۔ بچوں کے لیے چائے پہ میں ضرور اعتراض کرتا ہوں۔ کیونکہ بچوں کو چائے پلانے سے خون میں فولاد کی کمی پیدا ہوجاتی ہے اور جو پھل جس موسم میں آتا ہے وہ ضرور کھلائیں۔ کہتے ہیں کہ "آم" کی تاثیر گرم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پتا ہے کہ گرمیوں میں ہی آم دینا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو پتا ہے کہ کینو کی تاثیر ٹھنڈی ہے۔ مگر وہ سردیوں میں ہی آتے میں آم آپ نے دسمبر میں اور کینو آپ نے جون میں نہیں کھایا ہوگا۔"

"بچوں کے لیے ماں اور باپ کا بہترین تحفہ کیا ہے؟"

"میرے نزدیک بچوں کو بہترین تحفہ اگر کوئی ماں دے سکتی ہے تو وہ ہے ماں کا دودھ اور بہترین تحفہ اگر باپ دے سکتا ہے تو وہ پیدائش کے بعد بچوں کو پیدائشی ٹیکوں کے لیے لے کر جائے ...... اس سے بہتر کوئی تحفہ آپ بچوں کو دے ہی نہیں سکتے ...... ماں کا دودھ قوت مدافعت کو بڑھاتا ہے اور ٹیکے بچوں کو بیماریوں سے بچاتے ہیں۔"

"بہت باتیں ہوگئیں۔ اب کچھ نجی مصروفیات کے بارے میں بتایئے؟"

"مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ میں بھی ایک عام انسان ہوں اور مجھے بھی اچھا لگتا ہے کہ باہر جا کر فیملی کے ساتھ کھانا کھاؤں دوستوں کے ساتھ بیٹھوں۔ میں گوشت خور زیادہ ہوں مگر پھر بھی ساری چیزیں کھالیتا ہوں ...... اور فیملی کو ٹائم دینے کا مسئلہ یہ ہے کہ میں صبح پونے آٹھ بجے گھر سے نکل جاتا ہوں رات نو ساڑھے نو بجے گھر واپسی ہوتی ہے ...... اور پھر وہ ٹائم فیملی کے ساتھ ہی گزرتا ہے ...... اب تو سنڈے کو بھی کام چل رہا ہوتا ہے ...... اب بچے بڑے ہوگئے ہیں تو ان کے ساتھ ہماری ایکٹویٹی رہتی ہے۔ خاندان بھر میں بھی کافی آنا جانا رہتا ہے اور اب تو دور موبائل کا ہے تو سب کے ساتھ فون پر اور واٹس ایپ پہ بھی رابطہ رہتا ہے ...... فیس بک پہ بھی رابطہ رہتا ہے ......

میں تھوڑا سا فن لوونگ بھی ہوں۔ دوستوں میں ہوتا ہوں تو گانے بھی گا رہے ہوتے ہیں۔ ہلا گلا بھی ہوتا ہے ...... مجھے ڈرائیونگ کا بہت شوق ہے۔ گھومنے پھرنے، ٹریولنگ کا شوق ہے۔ آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکا ہوں ...... آج کل تو کہیں نہیں جا پا رہے ...... اپنے اسپتال میں بھی چھوٹی موٹی ایکٹویٹی کرتے رہتے ہیں ...... بس دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس قابل کردے کہ ہم کسی کے کام آسکیں۔ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے جئیں تو اس سے بڑھ کر کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ میں شفا دیے رکھے۔ آمین۔ بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب آپ کا۔"

☆

سراپا محبت

امت الصبور

اب وہ آئینہ صفت لوگ کہاں سے لائیں
سلسلے ختم ہوئے انجمن آرائی کے

اس عظیم و پراسرار کائنات میں انسان اب تک بہت سی باتیں سمجھ نہیں پایا ہے۔ زندگی کا سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں پہنچا دیتا ہے، یہ کون جانے، مسافر کے حصے میں تو سفر ہی آتا ہے۔ نہ سوچنے کی مہلت ہے نہ سمجھنے کی ...... راہ میں ساتھی بچھڑتے جاتے ہیں اور زندگی کی رونق ختم ہوتی جاتی ہے۔ تنہائی کا دکھ بھرا احساس گہرا ہوتا جاتا ہے۔

انسان ہوش سنبھالتے ہی خود کو بہت سے رشتوں میں منسلک پاتا ہے۔ کچھ رشتوں کا انتخاب وہ خود کرتا ہے۔ اپنی پسند، اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک رشتہ ہوتا ہے۔ رفاقت کا رشتہ ...... طویل رفاقتیں ہماری زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہو پاتا۔

خالدہ جیلانی کے ساتھ میرا رفاقت کا رشتہ تھا۔ رفاقت بھی وہ جو بہت سالوں پر محیط تھی۔ ہم نے بے شمار وقت ساتھ گزارا ...... بہت سے خوش گوار پل، بہت سے دکھ بھرے کٹھن لمحے ......

یادوں کی راہ گزر پر دیکھوں تو بہت سے لمحے روشن نظر آتے ہیں۔

وہ دن جب خواتین ڈائجسٹ جوائن کیا تھا۔ میں سارا دن بیٹھی مختلف رسالے پڑھتی رہتی تھی جو کمرے میں رکھے ایک ریک میں سجے تھے۔ خالدہ جیلانی آتیں، کچھ دیر بیٹھتیں اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتیں۔ مجھے وہ پہلی نظر میں بہت اچھی لگی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ خوب صورت تھیں لیکن نہیں۔ خوب صورت تو بہت لوگ ہوتے ہیں وہ سب کہاں اچھے لگتے ہیں، ان کی شخصیت میں خوب صورتی سے ہٹ کر بھی کچھ تھا۔ وقار، سادگی اور پاکیزگی۔ مجھے ان کا نام بھی نہیں پتا تھا۔ نہ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا پھر ایک دن جب وہ کمرے میں آئیں تو میں نے ان سے کہا۔

''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔''

انہوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا، مجھ سے ایسی تعریف کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔ مہناز جس نے میرے ساتھ ہی جوائن کیا تھا۔ وہ بعد میں بہت ہنسی اس نے مجھے سمجھایا بھی کہ ایسے ہر بات منہ پر نہیں کہتے۔ لیکن میری یہ عادت آج بھی نہیں بدلی۔ جو دل میں آئے، صفائی سے اس کا اظہار کر دینا۔

بعد میں وقت نے ثابت کیا کہ میں نے ان کو جیسا سمجھا تھا۔ وہ اس سے بڑھ کر اچھی تھیں۔ بس ایک بات غلط ثابت ہوئی۔ وہ قد و قامت سے ظاہری طور پر جتنی سنجیدہ اور بردبار نظر آتی تھیں۔ اندر سے ایک معصوم بچی تھیں، ان میں بچوں کی سی معصومیت اور سادگی تھی۔ پہلی نظر میں ان سے جو تعلق قائم ہوا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ ان کے اور میرے شعبے مختلف تھے، وہ شعبہ اشتہارات سے منسلک تھیں میں ایڈیٹوریل میں تھی۔

وہ پسینے میں نہائی، پرچوں کے بنڈل تھامے کمرے میں داخل ہوتیں۔

''امتل! پتا ہے آج ہمارے ساتھ کیا ہوا......؟''

''کیا ہوا خالدہ؟'' میں ان کے خوف زدہ اور پریشان چہرے پر نظر ڈالے بغیر اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہتی۔

''تمہیں پتا ہے آج پھر رحیم بدتمیز نہیں آیا۔

میں رکشہ کے انتظار میں ایک گھنٹہ کھڑی رہی۔"

"رحیم بدتمیز" ڈرائیور تھا اور چھٹیاں کرنا اس کی عادت تھی۔ رکشہ انہیں کیوں نہیں ملتا تھا اس کی وجہ مجھے کافی عرصہ بعد پتا چلی۔ میری دوست کی شادی تھی اس کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔ میں نے خالدہ سے کہا میرے ساتھ صدر چلیں وہاں سے کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ رحیم حسب عادت غیر حاضر تھا۔ خالدہ تھوڑا سا ہچکچائیں لیکن پھر راضی ہو گئیں۔ ایم اے جناح روڈ سے صدر تک دس منٹ کا راستہ تھا لیکن انہوں نے آدھا گھنٹہ رکشہ والے کے انتخاب میں گزار دیا، کسی کی آنکھیں ان کو غلط لگتیں کسی کی مونچھوں پر اعتراض ہوتا، کوئی انہیں شکل سے شریف نظر نہ آتا۔ بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے میں نے انہیں بٹھایا۔

واپسی میں جو گزری وہ ایک الگ کہانی ہے۔

چھوٹی چھوٹی باتیں، ان کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ میں کام میں مصروف ہوتی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی ہوتیں تو پرچا اٹھا لیتیں پڑھنے کے لیے نہیں دیکھنے کے لیے۔ سب سے پہلے اشتہار دیکھتیں، پرنٹنگ ٹھیک نہ ہوتی تو شکایت کرتیں۔

"دیکھو امتل! انہوں نے سارا اشتہار خراب کر دیا۔"

"خالدہ آپ دوسرے پرچے دیکھیں، ان میں ٹھیک چھپا ہے۔" میں بنا دیکھے کہتی وہ مطمئن ہو جاتیں۔ انہیں مجھ پر ایسا ہی اعتماد تھا۔ آفس میں کوئی بھی بات ہوتی، مجھ سے مشورہ ضرور کرتیں ان کے مسائل بھی ان کی طرح معصوم سے ہوتے۔

ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے لیے بول نہیں سکتی تھیں؛ کوئی انہیں کچھ بھی کہہ دے جواب نہیں دے سکتی تھیں اور میرا مسئلہ یہ تھا بلکہ آج بھی ہے کہ اگر میں کسی بات کو غلط سمجھوں یا کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھوں تو خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید مزاج کا یہی تضاد تھا جو ہمیں قریب لے آیا تھا۔

آفس میں کام ہوتا تو ہمیں دفتر میں دیر تک رکنا پڑتا۔ خصوصاً جب آخری کاپی پریس جانا ہوتی۔ خالدہ میرے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ کئی بار میں ان سے کہتی آپ چلی جائیں لیکن وہ بڑی محبت سے کہتیں نہیں امتل ساتھ چلیں گے۔ میں کام میں مصروف ہوتی تو مجھے وقت کا پتا نہ چلتا لیکن اس طرح خالی بیٹھنا بہت صبر آزما کام تھا۔

بہت افسوس ہوتا کہ یہ میری وجہ سے بیٹھی ہیں۔

وہ مارکیٹنگ کے شعبہ سے منسلک تھیں۔ انہوں نے اس شعبہ میں بڑے باوقار طریقے سے اپنا مقام بنایا تھا۔ سب ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ کبھی کسی کے منہ سے ان کے متعلق کوئی معمولی سی بات بھی سننے میں نہ آئی۔ ان کی شرافت اور وضع داری مثالی تھی۔ اتنے طویل ساتھ میں شدید غصے کی حالت میں بھی میں نے ان کی زبان سے کوئی بری بات نہ سنی۔

پتا نہیں ان کا مزاج ہی ایسا تھا یا وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھیں اس لیے بچپن کی معصومیت میں پناہ لی تھی لیکن بے شمار باتوں کے دوران کبھی کبھی ان کے منہ سے کوئی نہ کوئی ایسا جملہ نکل جاتا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خالدہ زندگی کی سچائیوں سے ناآشنا نہیں۔

زندگی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان کے حصے میں سکھ سے زیادہ دکھ ہی آئے لیکن وہ بہت باہمت تھیں، ہنس ہنس کر ان کا مقابلہ کرتی رہیں کبھی کسی کے سامنے اپنی کسی محرومی کا اظہار تک نہیں کیا۔ شاید وہ اپنی ذات سے کسی کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتی تھیں۔

انتہائی سادگی سے زندگی گزاری، ان کی پوری زندگی کفایت شعاری اور سادگی کا نمونہ تھی۔ کھانے پینے سے لے کر لباس تک...... کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ پورا پورا دن ایک چائے کی پیالی اور بسکٹوں پر گزار دیتی تھیں۔ اتنے طویل ساتھ میں میں نے انہیں کبھی کوئی قیمتی لباس پہنے نہیں دیکھا۔ سفید شلوار کے ساتھ معمولی سی لان کی پرنٹڈ قمیص اور سفید جارجٹ کا دوپٹا...... میک اپ کے نام پر کاجل یا ہلکی سی لپ اسٹک تک نہیں۔

ایک مشقت بھری زندگی گزار کر وہ دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے آمین۔

☆

بہت یاد آئیں گی

ادارہ

باوقار زندگی

ہاجرہ عبدالقہار

ان دنوں مجھے یہاں آئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا، افتاں و خیزاں ایک صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

''امتل! آج تو بہت برا ہوا۔ ہم پندرہ منٹ تک روڈ کراس کرنے کے لیے کھڑے رہے۔ اتنی مشکل سے روڈ کراس کیا۔ اتنے عجیب عجیب سے لوگ تھے وہاں۔''

میں نے حیرت سے اس بھاری بھرکم بچی کو دیکھا۔ جو قد وقامت وہ رکھتی تھیں، اس سے یہ بدحواسی لگا نہ کھاتی تھی۔ یہ تھیں خالدہ جیلانی۔ جن کے اندر ایک معصوم سی بچی ہمیشہ زندہ رہی۔

ایک ہاتھ میں ڈھیر سارے پیپر کے ڈبے تھامے، بڑا سا دوپٹا سر سے اوڑھے، ہاتھوں میں خوب صورت انگوٹھیاں پہنے وہ آفس میں داخل ہوتیں۔ نفاست طبع لباس سے جھلکتی، چہرہ مسکراہٹ سے سجا ہوتا، سب سے بہت محبت سے ملتیں۔ امتل سے بہت قریب تھیں۔ ان دونوں کا دیرینہ ساتھ تھا۔ خالدہ اپنے کام پر مکمل دسترس رکھتی تھیں۔ کبھی کام کے حوالے سے کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔

اکثر معصومانہ باتیں کرتیں اور امتل سے خوشی خوشی ڈانٹ کھاتیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے ابتدائی دور سے وہ ادارہ خواتین سے وابستہ تھیں۔ محمود ریاض صاحب نے کچھ لوگ کمائے تھے۔ ان میں سے ایک خالدہ جیلانی بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے ادارے کو اور اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ فائدہ پہنچایا۔

ہم سب کی یہ ملنسار، خوش مزاج ساتھی آج ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ان کی بے شمار یادیں ہم سب کی یادداشتوں میں روشن ہیں۔ انہوں نے ایک باعزت اور باوقار زندگی گزاری۔ کبھی بلاوجہ کسی کے معاملات میں مداخلت نہ کی۔ وہ ہمیشہ ہماری یادوں میں زندہ رہیں گی۔

نفیس مزاج

سیما رضا

تم گزر جاؤ گے چپکے سے زمانوں کی طرح
یہ تو سوچا ہی نہیں تھا میرے پیارے لوگو!

اس دنیائے فانی سے جانا ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ رب کائنات نے اشرف المخلوقات کو بہت پیار، محبت، مروت، اخلاص، اور پیار کی مٹی سے گوندھا ہے۔ اس کی شخصیت میں تمام خصوصیات ڈال کر اسے دنیا کے محاذ پر بھیج دیا جاتا ہے کہ جاؤ دنیا کو سر کرو......

خالدہ جیلانی کا دنیائے فانی سے رشتہ کیا ٹوٹا ہے کہ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ ان کے ساتھ گزاری جو یادیں ہیں، ان یادوں کی کرچیوں کو سمیٹتے ہوئے بہت دور تک پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑ رہا ہے یاد کے کئی دریچے میرے سامنے آ گئے ہیں۔

سوچ رہی ہوں، کیا لکھوں اور کس یاد کو آواز دوں۔ کس واقعہ کو تحریر کروں۔

خالدہ کا سادہ سا وجود آج بھی میرے دل ودماغ میں اسی طرح تروتازہ ہے جب انہیں پہلی بار دیکھا۔ ان سے ملی، ان سے گفتگو کی۔ سفید جارجٹ کا دوپٹہ جس پر کروشیہ کی بیل لگی تھی سر پر اوڑھے ہوئے وہ کرن کے دفتر میں داخل ہوئیں تو میں ان کو کئی لمحوں تک دیکھتی رہی...... ہلکے انگوری رنگ کے پھولوں

والی قمیص اور سفید شلوار میں ملبوس بہت نفیس لگیں۔ مسکراتا چہرہ، مسکراتی گفتگو، ناک میں لونگ...... وہ شعبہ اشتہارات سے وابستہ تھیں۔ بہت مخلص اور سرگرم......

بہت کم عرصہ میں میری ان کے ساتھ بے تکلفی ہوگئی تھی۔ مزید ان سے دوستی کا رشتہ ان کی بھانجی عاصمہ نے ہموار کردیا تھا۔ اکثر ان کے گھر میرا آنا جانا رہا...... بہت مہمان نواز تھیں...... میں اور عاصمہ جب بات کرتے کرتے، دل کھول کر قہقہے لگاتے تو خالدہ بہت سرزنش کرتی تھیں کہ ہنسو مگر آہستہ...... ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی جدوجہد کی کہانی سنی۔ نہ جانے کتنے واقعات...... اف بہت مشکل ہے بتانا...... کیا کہوں، کچھ کہا نہیں جاتا......

مارکیٹنگ کی دنیا میں یوں تو بہت سی خواتین کو کام کرتے دیکھا ہے مگر جو سراپا خالدہ جیلانی کا دل میں جذب ہو چکا ہے وہ انداز ہی کچھ اور ہے۔ یہ نشست برخاست بہت کم خواتین کے حصہ میں آتی ہے۔ اشتہارات کی دنیا میں ان کی کامیابی کا سہرا خود ان کی اپنی باوقار شخصیت کے سر ہے۔

ان کا میں نے ہمیشہ احترام کیا۔ میرا انہیں خیال کہ تعلقات کے معتبر حوالوں میں کبھی کوئی اختلافی پہلو سامنے آیا ہو۔ بہت نرم مزاج خاتون تھیں۔ اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی...... وہ نیکی اور احساس کے معاملے میں پیش پیش تھیں۔ ان کی بیماری کا سن کر کئی بار دل چاہا ان سے ملنے جاؤں۔ افسوس نہ مل سکی...... اور وہ سپرد خاک ہوگئیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین اور جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

افراح سکندر...... کینیڈا

خالدہ جیلانی صاحبہ کا سنا۔ بے حد افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند کریں اور ان کی مغفرت فرمائیں۔ آمین۔ ان کے گھر والوں کو صبر عطا کریں۔

عفت سحر طاہر...... گجرات

خالدہ جیلانی صاحبہ کے بارے میں سنا بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔ آمین۔

قرۃ العین خرم ہاشمی...... لاہور

خواتین ڈائجسٹ کے ادارے کی ساتھی خالدہ جیلانی کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ ایک مدت سے ان کا نام دیکھ رہے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ درجات بلند کرے۔ آمین۔

سانحہ ارتحال

ہماری اور آپ کی پسندیدہ مصنفہ ساجدہ حبیب کے بھائی راجہ معروف افضل اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم ساجدہ حبیب کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

فہمیدہ جاوید...... ملتان

نئے سال کا سرورق اف واہ کیا کمال کر دیا۔ پرانے وقت جیسے زیورات اور سبز گوٹے والا دوپٹہ اور جوڑے کا پرانا ہمارے وقت کا اسٹائل بھئی۔ رئید عالم و آصفہ زہرہ سے باتیں بالکل بھی پسند نہ آئیں۔ راحت کے ناول میں نرمین کا کردار اچھا ہے اور اس کے بھائی کا مینڈک سے کھیل کر نرمین کو تنگ کرنا مزہ دے گیا۔

عفت سحر کے ناول کے صفحات کی صورت حال ویسی ہو گئی ہے جیسے نبیلہ جی کے رقص بسمل کی تھی۔ رقص شرر میں کیا حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں ثمرین نے، بھئی اس قسط نے کمال کر دیا، ثابت ہو گیا کہ موسیقی کیسے منفی اثرات ڈالتی اور خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔ ثمرین تم اگلی بار جلدی ہی آنا، نعیمہ ناز میری پسندیدہ مصنفہ ہیں ناول بھی متاثر کن رہا۔ نعیمہ اب تم سے التجا ہے کہ تاریخی کہانیاں بھی لکھو طویل سی۔ نازیہ رزاق کا ناول مجھے سچ کہوں تو سمجھ میں نہ آیا کہ کون کس کا کیا لگتا ہے کردار زیادہ تھے۔

حمیرا شفیع کا افسانہ اچھا رہا۔ حمیرا تمہارا ناولٹ شبو کا دولہا مجھے بڑا ہی پسند آیا تھا۔ جھونکا ہوا کا بھی ٹھیک تھا۔ "میں بھی بیٹی ہوں" نمبر ون افسانہ تھا۔ "آپ کا باورچی خانہ" میں بہن صفیہ مہر سے ملاقات پسند آئی اور خاص کر ان کا صبح کا ناشتہ کاش شہری لوگ بھی گاؤں جیسی غذا کھائیں (مجھے بھی باورچی خانہ اور خاموشی کو بیان میں جگہ دیں) اب بات ہو جائے "حالم" مجھے بالکل بھی پسند نہ آیا حقیقت سے دور۔ یہ تحریر عجیب و غریب سی۔ نمرہ اب حقیقی موضوع پر لکھنا پلیز۔

مشرف تمیز، ریحانہ زیدی، وحیدہ نسیم، بلقیس کنول اور اس وقت کی رائٹرز کی جیسی پیاری تحریریں (جب ناول کی ہیروئن کا نام ہی ناول کا نام ہوتا تھا) پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ کبھی وہ پرانے طرز والے انداز میں ناول لگا دیا کریں، جب تانگے پر سواری کرتے تھے روپیہ ملنے پر جب کتنی خوشی ہوتی تھی۔ یا جب لکھنو میں مسلمان و ہندو پیار سے رہتے تھے اس دور کی وہ ساڑھی غرارہ پہناوا، خطوط لکھنا۔ بڑے دروازے والی حویلیاں، نولکھا ہار کو پہننے والی خواتین کے دور کی کہانیاں بھی لگا دیا کریں کہ اچھی لگتی ہیں پرانی ماضی کی یادیں۔

ج: پیاری فہمیدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے تین ماہ سے آپ خط لکھ رہی ہیں اور آپ کا ایک بھی خط شائع نہیں ہوا۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔

آپ نے ہر تحریر پر بہت تفصیل سے اور بہت جامع تبصرہ کیا۔ بہت اچھا لگا۔ نمرہ کا ناول ہماری بہت سی قارئین کو بہت پسند آ رہا ہے، ویسے ہم نے نمرہ سے کہا ہے کہ اگلا ناول وہ حقیقی زندگی سے متعلق لکھیں۔

سالگرہ نمبر کے متعلق آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔

ثناء اسلم رانا...... کلور کوٹ

ڈائجسٹ ابھی پورا نہیں پڑھ سکی لیکن جس وجہ سے خط لکھ رہی ہوں وہ نمرہ احمد اور سمیرا حمید ہیں۔ نمرہ کے نمل، جنت کے پتے کے بعد حالم بھی بیسٹ تھا ویل ڈن نمرہ! اب ایک اور اچھا سا ناول ملے گا ان شاء اللہ! سمیرا حمید کا "یارم، بورشے" سے زیادہ مجھے تو "راہ نور" نے انسپائر کیا ہے ویل ڈن سمیرا! عمیرہ احمد کا "آب حیات اور امر بیل" سب سے زبردست ہیں اور اتنے اچھے ناول خواتین ڈائجسٹ

کی وجہ سے ملے ہیں۔ پڑھنے پر پابندی تو نہیں لیکن ڈانٹ بہت پڑتی ہے۔ ایف ایس سی کے دوران تو نمل کتاب میں رکھ کر پڑھا لیکن اب بی ایس سی کے بعد فری ہوں تو آزادی سے پڑھتی ہوں امی کو ''مصحف'' اور ''راہ نور'' سنا کر ڈائجسٹ کا حامی بنا چکی ہوں۔ اب کچھ اپنے بارے میں بتادوں گھر میں سب سے بڑی اور شہر کلور کوٹ کی ذہین لڑکی ہوں (ہاہاہا)۔ ہمارا شہر چھوٹا ہونے کے باوجود ہر سہولت ہے۔ تعلیم اور ذہانت یہاں کا پلس پوائنٹ ہے۔

ج: پیاری ثناء! آپ کا خط پڑھ کر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ کا کلور کوٹ واقعی تعلیم اور ذہانت کے معاملے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

آئندہ بھی ہمیں خط لکھتی رہیے گا۔

ارم ابرار...... کینیڈا

میں 1989ء سے آپ کے رسالے کی خاموش قاری ہوں، تقریباً بیس سال سے کینیڈا میں رہ رہی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ ایک بہترین رسالہ ہے اور مجھے بے انتہا پسند بھی ہے۔ میں نے آپ کے رسالے میں ایک ناول پڑھا تھا جس کا نام تھا ''ایک خواب تھا کوئی'' اس میں کچھ غلط معلومات دی گئی تھیں، کینیڈا میں صوبے ہیں اسٹیٹس نہیں ہیں اور یہاں کسی صوبے کا نام ورک شائر نہیں ہے۔ میں رائٹر تو نہیں ہوں لیکن میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کسی بھی ملک کے بارے میں لکھنے سے پہلے معلومات لے لیا کریں۔ ویسے کہانی بہت خوب صورت تھی۔ جو نیا ناول آپ نے شروع کیا ہے، وہ بھی بہت اچھا ہے بلکہ آپ کا پورا ڈائجسٹ بہت ہی زبردست ہے۔

ج: پیاری ارم! آپ نے اتنی دور سے ہمیں یاد کیا، بہت خوشی ہوئی۔ غلطی کی نشان دہی کے لیے شکریہ۔ بہت ساری باتوں کا ہمیں علم ہوتا ہے لیکن جب ہم کہانی لکھتے یا پڑھتے ہیں تو کہانی کی بنت میں الجھ کر ان چھوٹی چھوٹی جزیات پر توجہ نہیں دے پاتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری قاری بہنیں بہت ذہین ہیں، وہ نہ صرف یہ غلطیاں نوٹ کرتی ہیں بلکہ خط لکھ کر نشان دہی بھی کرتی ہیں ہم آئندہ خیال رکھیں گے کہ ایسی غلطیاں نہ ہوں۔

رشیدہ یاسر...... محب بانڈہ ضلع نوشہرہ

محب بانڈہ جو دریائے کابل کے کنارے 300 سے زائد گھروں پر مشتمل ایک خوب صورت گاؤں ہے۔ زندگی کی تمام سہولیات میسر ہیں۔ ایک عدد ڈسپنسری بمعہ ڈاکٹرز، سرکاری و پرائیوٹ اسکولز، ڈاک خانہ، پکی سڑکیں، کھیت، بجلی، گیس ہر چیز موجود ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے اور دوسروں کو شریک کرنے والے ہیں۔

ہم پانچ بہن بھائی ہیں، میں بڑی ہوں۔ باقی چاروں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ ہم پشتو اسپیکنگ ہیں۔ شادی کو پونے دو سال ہوگئے ہیں اور ایک بچی لیہا جانی کی مما بھی بن چکے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ سے تعلق ساتویں جماعت سے ہے لیکن بے قاعدہ طور پر۔ گھر میں اجازت نہیں تھی اور کوئی لانے والا بھی نہیں تھا اب شادی کے بعد شوہر صاحب باقاعدہ لاتے ہیں تو ابھی پچھلے ماہ ہی بی۔ اے کا رزلٹ آؤٹ ہوا ہے اور ماشاء اللہ سے پاس بھی ہوگئی ہوں۔ اس لحاظ سے خواتین اور ہمارا ساتھ سات سال پرانا ہے۔ خواتین اور شعاع دونوں رسالوں سے ہم نے بہت سیکھا۔ جینے کا ہنر، رشتوں کو برتنا، تہذیب و اخلاق بلکہ مجھے تو صحیح سے اردو بولنا اور لکھنا ان ہی نے سکھایا۔ یہ اصلاحی رسالے ہیں اور بہت خوب صورتی سے وہ بات بھی سمجھا دیتے ہیں۔ جو ایک ماں کے سمجھانے کی ہوتی ہے۔

اب آتے ہیں سال نومبر کی طرف۔ سب سے پہلے ہم نفسیاتی ازدواجی الجھنیں پڑھتے ہیں۔ عدنان بھائی کے مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ''باورچی خانہ'' صفیہ مہر کا اچھا لگا۔ ''کہنی سُنی'' مدیرہ سے متفق ہیں۔ ''کرن کرن روشنی''، علم اور عمل کو آسان بناتا ہے اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ''سروے'' سب کے جوابات اچھے تھے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ اک جھونکا ہوا کا ریحانہ چوہدری کی بہترین کاوش تھی۔ مبارک باد۔ یہ کیا ناولٹ ایک بھی نہیں، خیر اس طرح بھی ہوتا ہے۔ مکمل ناول میں نازیہ رزاق کا ''اک خواب تھا کوئی'' اچھا تھا لیکن شکوہ ہے نازیہ رزاق اور فرزانہ کھرل سے یہ اتنا مشکل کیوں لکھتی ہیں؟ اتنا گھما پھرا کر اتنا دماغ پہ زور ڈالتے ہیں تب کہیں جا کر سمجھ میں آتا ہے۔ ابھی نمرہ احمد کی والدہ کے انتقال کی خبر پڑھی سچ میں بہت دکھ ہوا۔ اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اب آتے ہیں اپنے سلسلے کی طرف تو بھئی سب کے مراسلے اور آپ کے جوابات بہت ہی اچھے

ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فریال خان آپ ڈاکٹر ہو کر اتنی مزاحیہ کیسے ہو؟ ریحانہ جی اپنے باغیچے کی سبزی ہمیں بھی چکھا دیں نا۔ گوشی جمال بہن اللہ آپ پر اپنی رحمت فرمائے اور آپ کی مشکلات آسان کرے۔ آپ ربیعہ نسرین کے بتائے گئے وظائف پڑھا کریں۔

ج: پیاری رشیدہ! ہم آپ کا خط ایڈٹ کر کے شائع کر رہے ہیں، تعارف کے لیے سلسلہ ہے "میری خامشی کو زباں ملے" آپ اپنا اور اپنے گاؤں کا تعارف علیحدہ لکھ کر بھجوائیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صوفیہ کنول...... تحصیل جام پور ضلع راجن پور

پچھلے تین سالوں سے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع پڑھ رہی ہوں۔ جنوری کا شمارہ بہت زبردست لگا۔ کہی سنی اور کرن کرن روشنی بہت ہی پسند آیا۔ آصفہ زہرا اور رشید عالم سے ملاقات اچھی لگی۔

راحت جبیں کا ناول، زندگی ہم تجھے گزاریں گے، بہت بہت پسند آیا۔ نازیہ رزاق کا مکمل ناول "ایک خواب تھا کوئی" بہت اچھا لگا۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول "میں تم سے نہ پوچھوں" اچھا تھا ریحانہ چوہدری کا افسانہ ایک ہوا کا جھونکا بہت ہی پسند آیا۔ عفت سحر کا ناول رنگ ریز سیرے کی قسط ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھی۔ قارئین بہنوں کے خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ گوشی جمال کا خط پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ گوشی جمال ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔

حرامانی (دو بول والی) کا انٹرویو ضرور شائع کیجیے گا۔

ج: پیاری صوفیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

عفیفہ اقبال...... حیدر آباد

"خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے شناسائی تو بچپن سے ہے۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد امی جان نے پورا ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

ناول کی دنیا میں قدم رکھتے ہی 'ماہ نور' سعد سلطان، کھاری، اریبہ اور شمشیر علی نے خوش آمدید کہا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو آج کے ناول کی دنیا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی لگنے لگتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آج کے لکھنے والے اچھا نہیں لکھ رہے لیکن جانے کیوں وہ پرانی چاشنی کہیں مفقود ہو گئی ہے شاید کچھ 'اردو ادب' میں ایم اے کا بھی اثر ہے۔ پریم چند، غلام عباس، انتظار حسین اور شوکت صدیقی کو پڑھنے کے بعد اب سب کچھ پھیکا لگتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ آج کی کچھ رائٹرز جن میں آمنہ ریاض، افشین نعیم، سائرہ رضا، صائمہ اکرم، نمرہ احمد اور چند اور نام جو کہ اب بہت کم خواتین ڈائجسٹ میں نظر آتی ہیں۔ ان سب میں قاری کو اپنی تحریر سے باندھ کر رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہم فرحت اشتیاق کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

ابن انشا کو پڑھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ تحریر ایک عرصہ پرانی ہے، ان کا لکھا ہر حرف تازہ گلاب کی طرح مہکتا ہے۔ ان کا ہر خیال عرض حال معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ہر جملہ شگفتگی کی بہترین مثال ہے۔

لکھنے کے سفر کا آغاز میں خواتین ڈائجسٹ سے کرنا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری عفیفہ! یہ قدرتی بات ہے کہ انسان کو ماضی ہمیشہ خوش گوار لگتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری پرانی مصنفین نے بہت اچھے ناول لکھے اور وہ پڑھنے والوں میں مقبول بھی ہیں لیکن آج کی مصنفین بھی بہت اچھے ناول لکھ رہی ہیں آمنہ ریاض، عمیرہ احمد کے ناول ابھی کچھ عرصے پہلے ختم ہوئے ہیں۔ بہت اچھے تھے۔ اور بہت پسند کیے گئے، تنزیلہ کا عہد الست بہت اچھا ناول تھا۔ اب ان کا ناول نور القلوب شعاع میں شائع ہو رہا ہے۔ خواتین میں نمرہ اور راحت جبیں بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

آپ خواتین سے اپنے سفر کا آغاز کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔

گوشی جمال...... منڈی یزمان

جنوری کا شمارہ اپنی تمام تر خوب صورتیاں سمیٹے، فرینہ اعجاز کی دیدہ زیب مسکراہٹ سے سجا۔ کسی ٹائٹل پر ماڈل کو فل قہقہے بکھیرتی ہوئی بھی لائیں، اچھا تاثر پڑے گا۔ کہی سنی، بہت خوب صورت الفاظ سے نئے سال کی ابتدا۔

"کرن کرن روشنی سے فیض یاب ہو کر" تمام خطوط

بقیہ صفحہ نمبر 248 پر

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بینک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

نرمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکر قندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

نرمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ نرمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لادے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے نرمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ نرمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ نرمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالی آرہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں نرمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔

ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔

نرمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جوتا خریدنے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ جس چیز کو دیکھتی ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔

افشاں رکھ لیتی ہے لیکن نرمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔

مراد کاکے سے کہتا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاکا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔

ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔

تیسری قسط

خدا خدا کر کے روٹیوں کا ڈھیر پورا ہوا۔ پھاتاں نے آگ باہر کھینچ دی۔ جلتی بھٹیوں پر پانی کا چھینٹا دیا۔ تو دھوئیں اور راکھ کا مرغولہ سا اٹھا اور رشیداں کی تھکی تھکی نظروں میں پھاتاں کا چہرہ دھندلا گیا۔

غفور نائی کا لڑکا لوہے کا تسلہ لے کر بھاگا آیا اور ساری آگ اس میں بھر کے اپنی لوئی کے ساتھ اٹھا کر باہر کی طرف لے چلا۔

''اوئی...... ہائے مر گیا...... جل گیا......''

''تیری لوئی جل جائے گی...... مرن جوگیا...... ابھی پورا سیال (سردی کا موسم) باقی ہے۔ کہاں سے لے کر دے گا تیرا پیو۔''

پھاتاں کی دہائیاں اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیں۔ پھاتاں نے اٹھتے اٹھتے رشیداں کو دیکھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ دبا رہی تھی۔

''تو مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔ جا گھر، جا کے ساہ لے لے...... دوبارہ آ جائیں۔ ابھی تو ساری رات ڈیوٹی دینی ہے۔ دیکھ ابھی سے دھند اتر رہی ہے۔ کورا (کہر) پڑنے لگا ہے۔ بندہ سیال گزار کے ٹھنڈے میٹھے موسم میں ویاہ رکھے۔''

وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

رشیداں خاموشی سے ہاتھ دباتے ہوئے راکھ ہوتی آگ کو دیکھتی رہی۔ کچھ لمحوں پہلے تک چولہا کیسے بھڑک رہا تھا اور اب...... راکھ کی تہہ میں چنگاریاں دم توڑ رہی تھیں اور کسی بانجھ عورت کی کوکھ کی طرح ویران ہوتا چولہا دیکھ کر رشیداں کو وحشت سی ہونے لگی۔

''پاگلے! چولہے کو دیکھ کر وحشت کھا رہی ہے۔ اس کا تو مقدر ہی ہر روز جلنا ہے، ہر رات ویران ہوتا ہے۔ جیسے تو...... ہر دن اپنی زندگی کی بھٹی سلگاتی ہے اور ہر رات اجڑ کر سو جاتی ہے۔''

اس نے بکھرے وجود کو تاگا تاگا جوڑا اور ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اندر پنجابی گانوں کے پھڑکتے بولوں کی گرمی تھی۔

اس سے پہلے ٹیپو اور گدے کی تالی تھی۔

بعد میں بڑی بوڑھیوں کے بے سُرے راگ اور سرالیوں کی ٹانگ کھینچنے والے گیت...... وہی گیت جو رشیداں کی شادی میں بھی اسی طرح گائے گئے تھے۔

کسی بھولی بسری یاد نے اس کے ہونٹوں پر باسی سا پھول کھلا دیا۔

پہلی شادی...... پہلا شوہر اور پہلی رات...... جسے راس آ جائے اس کے لیے بعد میں سب سمجھوتا ہوتا ہے۔
وہ سمجھوتا جو رشیداں کئی سالوں سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ اب تو شمار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دوسری شادی...... دوسرا شوہر اور کئی فرض سمجھ کر گزاری راتیں...... اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ان ہی سوچوں میں الجھتی، ماضی کی گھمن گھیریاں جن میں روشنی اور تاریکی کا تناسب ایک سا تھا۔ وہ دالان عبور کر کے بڑے کمرے کے جہازی سائز دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

جہاں نصیبو لعل "منجیاں" توڑ رہی تھی۔ اور ثریا کی "اڈیاں" زمین ہلا رہی تھی۔

رشیداں ہکا بکا بت ہو گئی۔ ایسی ادائیں...... ایسے ہلکورے، ایسی بے باکی...... دوپٹا اتر کر قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ لڑکیاں، عورتیں تالیاں پیٹتی مزا لیتی، ایک دوسرے کے پلوؤں میں منہ دے رہی تھیں۔

"ہائے نی مرجانیے، تو تو صائمہ لگ رہی ہے...... صائمہ!"

ملکانی نے تکیے کے نیچے ہاتھ گھسایا اور دس کے نوٹوں والی گڈی نکال کر سر پر سے وار دی۔ رشیداں کے اندر کی عورت جسے وہ ہمیشہ کمینی عورت کہتی تھی، تالیاں پیٹ پیٹ کر ثریا کو داد دے رہی تھی۔

مگر ثریا کی سوتیلی ماں رشیداں کے لیے اگلا لمحہ پہلے سے زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ ثریا نے نیچے بیٹھ کر وہ نوٹ سمیٹنے شروع کر دیے تھے۔ ساری عورتیں ثریا کی اس حرکت کو مذاق سمجھ کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ مگر رشیداں جانتی تھی۔

ثریا نے یہ حرکت مذاق میں نہیں کی۔ وہ یہ نوٹ سمیٹ کر لے آئے گی۔

رشیداں الٹے قدموں وہاں سے بھاگی۔

پہلے شوہر کے پڑھائے سبق بھولتے نہ تھے۔

اور دوسرا...... اس کی کہی ہر بات وہ دل پر لکھتی۔ مگر دل اب تھا کیا بس سلیٹ تھی، جس پر لکھا وہ جب چاہتی تھوک لگا کر مٹا دیتی تھی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس۔" انور حسین کی آنکھوں میں لکھا سوال ثمینہ نے پڑھ کر سنایا۔

"میرے ہیں...... میں نے کمائے ہیں۔" نرمین نے بڑے فخر سے جواب دیا۔ اس کا چہرہ فخر سے تمتما رہا تھا۔ پہلی کمائی کی خوشی ہی الگ تھی۔

انور حسین نوالہ چبانا بھول گیا۔

بیٹی پڑھنے جاتی تھی یا کمائی کرنے......

"نمو! کیا فضول بولے جا رہی ہے۔ کہاں سے آئے پیسے...... کسی سے ادھار لیے ہیں۔ کیوں پریشان کر رہی ہے۔" ثمینہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی تیز آواز ہوتی آواز پر بچے کھانا چھوڑ کر دیکھنے لگے۔

"نہیں نہیں...... کسی سے لیے نہیں ہیں۔ میں بتاتی ہوں۔" نرمین نے جلدی سے سب بتانا شروع کیا۔ فرخ سے کہنا، اس کا ٹیوشن ڈھونڈ کے دینا۔ غلام رسول نمبردار کے گھر جانا اور ایڈوانس ٹیوشن فیس......

دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

وہ جیسے کسی اور ہی دنیا کی کہانی سنا رہی تھی۔ دروازہ بھی ماں سے پوچھ کر کھولنے والی نرمین کیسے کسی کے گھر جا سکتی ہے۔ ثمینہ نے ڈرتے ڈرتے انور حسین کو دیکھا۔ اس نے بدقت اپنا منہ بند کیا۔ آہستہ آہستہ نوالہ چبایا۔ بچوں کو بھی لگا آپا نے کچھ غلط کر دیا۔ اب ابو جی جوتا اٹھائے ہی اٹھائے گا۔ حالانکہ ابو جی نے کبھی نرمین پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔

''زمین! تُو کیا پاگل ہوگئی تھی؟ بھوکی مر رہی تھی...... یا کپڑے نہیں مل رہے تھے؟ کون سی خواہشیں پوری کرنی تھیں جو تو کمانے چل پڑی۔ یہ تیرا ابا پ سارا دن ہڈیاں توڑتا ہے کس کے لیے؟'' ثمینہ پھٹ پڑی۔
''ہاں تو کیوں اکیلے ابو جی ہڈیاں تڑوائیں۔ ہمارے کیا ہاتھ پیر ٹوٹے ہیں اور دیکھیں...... ذرا سی محنت سے پیسے مل گئے نا۔''
''زمین! تُو لڑکا نہیں ہے۔'' ثمینہ نے ماتھا پیٹا۔
''میں آپ کو ویڈیو دکھاؤں، میں نے افشاں کے پاس دیکھی ہے۔ اس آدمی نے اپنی ساری بیٹیوں کو الیکٹریشن بنا دیا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر دکان چلاتی ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں جا کر وائرنگ کرتی ہیں۔ ان کے باپ نے تو نہیں کہا کہ وہ لڑکے نہیں ہیں۔''
کیسے ٹر ٹر بول رہی تھی، ثمینہ کا ہاتھ اٹھ جاتا کہ انور حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے بولا۔
''کل میں تمہارے ساتھ جا کر خود نمبردار صاحب سے ملوں گا۔ اچھے لوگ ہوئے تو پڑھاتی رہنا۔''
ثمینہ ہکا بکا رہ گئی۔ زمین جوش میں باپ سے لپٹ گئی۔ یہ دیکھ کر چاروں بچے بھی ایک دوسرے سے لپٹ کر مبارک باد دینے لگے۔
''ابو جی! یہ اس آدمی کو واپس کر دینا۔ ہمیں اس کے پیسے نہیں چاہئیں۔'' انور حسین نے نوٹ پکڑا۔ چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر بیٹی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔
''وہ پانچ سو کا نہیں، لاکھوں کا کھاتہ ہے، اسے اپنے خرچے کے لیے رکھ لو۔'' اس نے برتن ہٹائے اور جوتا پہن کر گھر سے نکل گیا۔
ثمینہ نے اداسی سے ادھورے کھانے کو دیکھا۔
''امی! لاکھوں کا کھاتہ کیسے کلیئر ہوگا۔'' زمین کے لہجے میں فکرمندی تھی۔
''تمہاری ٹیوشن فیس سے تو نہیں ہوگا۔'' ثمینہ برتن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

ماں کا انتظار کرتے کرتے اور مطالعہ پاکستان کا رٹا لگاتے لگاتے اقصیٰ تھکنے لگی۔ باہر کہر میں ڈوبی گہری تاریک رات، اقصیٰ نے آگ جلا کر کمرے میں رکھ دی تھی۔ تب ہی کمرے میں ہلکی سی گرمائش کا احساس ہو رہا تھا۔
''کتنی رونق ہوگی، کیا تھا جو اماں مجھے بھی لے جاتیں۔'' اس نے یاسیت سے سوچتے ہوئے رضائی اپنے اردگرد دبائی۔ یہ ماں کے جہیز کی رضائی تھی، جس کی روئی اب اندر سے ٹوٹنے لگی تھی۔ مگر رشیداں کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ اسے ادھیڑ کر دوبارہ بھروا سکے۔
''تیری ماں کہاں مرگئی ہے؟'' وہ باپ کی آواز پر کانپ گئی۔ باپ کی آواز اونچی تھی اور کمرے میں گہری خاموشی......
''ابا! روٹی دے دوں۔''
''کیا پکا ہے؟'' آواز پیٹیوں کے ساتھ پڑی چارپائی سے آئی تھی جس پر دو لحاف پڑے تھے جن کے اندر کہیں رفیق تھا۔ بیماری اور سردی نے اسے بے حال کر دیا تھا۔
''آلو گوبھی......''
''تیری آلو گوبھی کی تو......'' وہ سوتیلا باپ تھا۔ کبھی باپ نہ بنا، بس سوتیلا ہی رہا۔ دوسری طرف رشیدہ تھی، اس کی بیٹی کی ماں بننے کی کوششوں میں ہلکان ہوتی رہی مگر کہلائی وہ بھی سوتیلی......

''مرن جوگی، خود وہاں مرغ مسلم کھا رہی ہوگی...... اور میرے لیے پکا گئی آلو گوبھی...... سب پتا ہے، میرے ساتھ تو زبردستی نکاح کی گئی ورنہ دل میں تو اب بھی وہی رہتا ہے علی بخش ترکھان......''

اقصیٰ کو ان گالیوں کی عادت تھی، اس لیے بےزاری سے کمرے کے بند دروازے کو گھورتی رہی۔ خود اس کا باپ اتنی چھوٹی عمر میں مرا تھا کہ اقصیٰ کو اس کا چہرہ تک یاد نہ تھا۔

''جا...... دفع ہو...... پتا کر، گھر کب مرے گی۔''

''ابا! باہر بہت اندھیرا ہے۔''

''تجھے کھا جائے گا...... جاتی ہے یا......'' اس نے لحاف کے اندر سے ہاتھ نکال کر اپنی لاٹھی ٹٹولی تو اقصیٰ ڈر کر اٹھی۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ سرد ہوا اس کے کمزور بدن کو چیرنے لگی۔

''اللہ میاں جی...... اماں کو بھیج دے یا ثریا آپا کو۔''

وہ دوسرے کمرے میں بھی نہ جا سکتی تھی کہ اماں نے رفیق کے کمرے میں رکنے کی خاص تاکید کی تھی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔

''ہائے...... ہائے......'' رفیق کی ٹانگ میں یقیناً درد اٹھ رہا تھا۔

ابھی کچھ ماہ پہلے کی بات تھی۔ جب اقصیٰ نے رفیق کے پاؤں دباتے ہوئے انگوٹھے کے نیچے سیاہ دھبہ دیکھا تھا۔ اقصیٰ نے تجسس میں انگوٹھے کو دبایا تو اگلا لمحہ بہت خوف ناک تھا۔ انگوٹھے کی جلد پھٹی اور اس میں سے مواد بہہ نکلا تھا۔ خوف سے چیختی ہوئی اقصیٰ وہاں سے بھاگ کر ماں کی بکل میں چھپ گئی۔ مگر ماں کی بکل میں بہت سے چھید تھے، تب ہی تو وہ پکڑی گئی۔ دونوں ماں بیٹی کو پیٹ کر وہ گھبراہٹ میں گھر سے نکل گیا تھا۔

''شوگر نے اس کا پیر کھا لیا ہے۔'' غفور نائی کے پاس اپنی حکمت اور شوگر کا شرطیہ علاج تھا۔ کئی دن وہ گھر آ کر زخم کی صفائی کر کے پٹیاں بدلتا رہا۔ مگر بات اس کے بس سے باہر کی تھی...... ہار کر رفیق کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ جس نے آپریشن کر کے انگوٹھے کی ہڈی نکال دی تھی۔

اس دن اقصیٰ کا دل چاہا، وہ رفیق کے دوسرے پیر کو بھی اسی طرح دبا دے۔

☆☆☆

ٹینٹ کے آخری اندھیرے کونے میں وہ سردی سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ شادی کے شوق میں کڑھائی والا ریشمی سوٹ پہنا تھا۔ اندر تو زیادہ محسوس نہ ہوا کہ انگ انگ میں بجلیاں کوندتی تھیں اور یہاں کڑاکے ٹھنڈ نے بجلیوں کے سارے کڑاکے نکال دیے تھے۔

''کہاں مر گیا کم بخت!''

ٹینٹ کے اندر ماحول پورے عروج پر تھا۔ رانی کھسرے کا ڈانس اور مردوں کا ٹھرک پن، ان کا شوہدا پن، چھلک چھلک کر باہر آ رہا تھا۔ اس نے ٹینٹ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی، مگر کہیں کوئی درز نہ تھی۔

تب ہی غفور نائی کا لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ ہاتھ میں شاپر تھا۔

''تجھے کہاں موت پڑ گئی تھی، سردی سے میری قلفی جم گئی۔'' ثریا نے شاپر جھپٹ کر پکڑا اور کھولا۔ ساتھ ہی منہ بنا لیا۔

''کوئی چار پیس مچھلی کے اور ڈال لیتا۔'' شاپر کھلتے ہی مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو ان کے چار سو پھیل گئی تھی۔

''اتنی مشکل سے تو پار کیے تھے۔''

''بندہ چوری کرے تو سوار (اچھی طرح) کے تو کرے۔'' ثریا نے ناک چڑھا کر کہا۔

''چل بھاگ......'' اور وہ بھاگ گیا تھا۔ ثریا عقب میں آہٹ محسوس کر کے تیزی سے پلٹی تو پیچھے کھڑے

بشیر سے ٹکرا گئی۔
"سنبھل کے میری جان۔"
"دفع ہو۔ اندھا ہے نظر نہیں آتا۔ یہاں میں کھڑی ہوں۔" ثریا نے جلبلا کر سامنے کھڑے لمبے پتلے گہری رنگت والے پرکشش مرد کو دیکھا۔ ملگجی روشنیوں میں وہ کھل کر ہنسا۔
"تم ہی تو نظر آتی ہو۔"
"پر اب تو مجھے دکھائی نہیں دیتا۔" ثریا کے لہجے میں اداسی در آئی۔
دونوں ایک دوسرے کے لیے پاگل ہو گئے تھے۔ دبی دبی زبان میں قصہ دہرایا جانے لگا تو رفیق نے ثریا کو مار پیٹ کر کمرے میں بند کر دیا۔ بشیر نے رشتہ بھیجا تو انکار بھی ہو گیا۔ غیر برداری، غیر ذات...... بشیر مایوس ہو کر لاہور چلا گیا۔ وہ راج مستری تھا۔ ہر قسم کی ٹائلز لگانے کا ماہر، ہاتھ میں اتنی صفائی کہ بڑی بڑی کوٹھیوں، بنگلوں کے ٹھیکے آرام سے مل جاتے۔ اس لیے پیسے کی تو کمی نہ تھی مگر کمی قسمت میں تھی تب ہی تو ثریا نہ ملی۔
"اب کوئی اور مل گیا ہے؟"
"کاش مل جاتا تو تجھے ہی بھول جاتی۔" وہ ریشمی دوپٹا لپیٹتی جانے کو پلٹی کہ بشیر نے اس کی کلائی پکڑی۔ اس کے ہاتھ لمبے، کھردرے اور سانولے تھے مگر گرفت میں نرمی، محبت اور حلاوت تھی۔
ثریا نہ چاہتے ہوئے بھی پگھل گئی۔
رشیداں جب زردے بریانی کا شاپر سنبھالے آئی تو ثریا کی چہکاریں اور کھنکتی آواز صحن میں کِھلکِھل رہی تھی۔ اندر مچھلی، تکے اور بریانی کی خوشبو گڈمڈ ہو رہی تھی۔ رفیق لحاف کی بکل مارے تازہ دم ہو بیٹھا۔ اس کا بنا انگوٹھے والا پیر لحاف سے باہر تھا۔ ثریا اس کی پائنتی کی طرف گرم چادر اوڑھے چائے پی رہی تھی۔ کمرے میں بس کھانے اور تازہ جلی آگ کی باقیات تھیں۔ اقصیٰ ماں کی چارپائی پر اونگھ رہی تھی۔
"لے آگئی تیری ماں۔ میٹھے لونے (نمکین) چول (چاول) لے کر۔" ثریا کے لہجے میں طنز تھا۔ رفیق قہقہہ لگا کر ہنسا تو اقصیٰ نے مندی مندی آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا۔ رشیداں کمینی نے مڑ کر بڑا کرارہ جواب دیا تھا (پتا نہیں رشیداں اپنے اندر بولتی عورت کو کمینہ کیوں کہتی تھی حالانکہ وہ تو صرف سچ بولتی تھی...... شاید اسی لیے...... یا شاید اس لیے کہ منہ پر نہ بولتی تھی)
"میں نے تو اپنی جوانی، بیوگی اور تیرے باپ کی بیماری بھی سنبھال لی اور تجھ سے تو اپنی جوانی نہ سنبھالی گئی۔"
رشیداں نے تھکے تھکے ہاتھوں سے شاپر رکھے، پاس پڑے مچھلی کے کانٹوں اور چوڑی ہوئی ہڈیاں دیکھ کر اسے ثریا کا خیال آ کر جھرجھری آ گئی۔
"رزق حلال اور حرام میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ حرام آسانی سے کمایا اور اڑایا جاتا ہے۔ اشتہا انگیز اور وافر ہوتا ہے جبکہ رزق حلال کے لیے ہڈیاں گھسانی پڑتی ہیں۔ جوڑ جوڑ درد سہنا پڑتا ہے۔ جنوری کی کہر زدہ راتوں میں ٹھنڈے پانی سے سینکڑوں برتن دھونے پڑتے ہیں۔ تب جا کر یہ چند سو اور میٹھے لونے چول کمائے جاتے ہیں۔ اسی لیے تو رزق حلال کو عبادت کہا گیا تھا۔"
کتنا آسان تھا بستر پر پڑے بیمار شوہر کو بھول کر تلی ہوئی مچھلی اور تکے بریانی کمانا۔ مگر وہ محو عبادت تھی۔
رشیداں یہ بات ٹھٹھا اڑاتی ثریا کو نہ سمجھا پائی۔
اس نے تو پوری کوشش کی تھی مگر دنیا، رفیق اور ثریا نے اسے ماں بننے نہ دیا۔ وہ سوتیلی تھی...... سوتیلی ہی رہی۔

☆☆☆

''اب کیا جواب دو گے؟'' ثمینہ نے پائنتی پر بیٹھتے انور حسین سے پوچھا، جو بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا ہوا تھا۔

''کس کو؟'' انور حسین نے بازو ہٹا کر اپنی وفاشعار اور صابر بیوی کو دیکھا۔

''اسی گینڈے کے منہ والے منشی کو۔'' وہ تنفر سے گویا ہوئی۔

''ظاہر ہے، جواب ہی دینا ہے۔'' انور حسین اٹھ بیٹھا۔ ''دکان تو اب ہاتھ نہیں آئے گی۔ وہ خبیث سود پر سود ڈالے گا تنگ کرنے کو۔''

''یہ انصاف تو نہیں، ہماری بیٹی ہے۔ ہم رشتہ دیں نہ دیں۔''

''غریب کے لیے انصاف نہیں ہوتا ثمینہ!'' اس کا ٹوٹا ہوا لہجہ ثمینہ کو تڑپا گیا۔

''اچھا فکر نہ کرو، دال، دلیہ چل ہی رہا ہے۔ باقی اللہ خیر سکھ رکھے تو ہمارے بیٹے جوان ہو کر تمہارا بازو بنیں گے ان شاءاللہ۔''

''ہاں۔'' مستقبل کے خوش کن تصور سے انور حسین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تم نے نرمین کو کیوں اجازت دی؟'' ثمینہ نے گلہ کیا۔

''تم نے دیکھا نہیں، وہ کتنی خوش تھی۔ میرا دل نہیں مانا کہ وہ اداس ہو اور کتنے دن کرے گی، چار دن کے بعد جوش ٹھنڈا ہو جائے گا تو خود ہی چھوڑ دے گی۔ میں جاتا ہوں، خود ملتا ہوں نمبر دار صاحب سے...... ویسے تو فرخ نے بڑی یقین دہانی کروائی ہے کہ جانے بوجھے لوگ ہیں، ورنہ وہ کیوں نرمین کو وہاں بھیجتا۔'' انور اٹھ کر چپل پہننے لگا۔ ''اسے اسکول سے لے کر خود وہاں جاتا ہوں۔''

''ہاں جوان لڑکی اب انجان لوگوں کے گھروں میں جایا کرے گی۔'' ثمینہ بڑبڑانے لگی۔

''بچی ہی تو ہے۔'' وہ کہہ کر خود ہی گڑبڑا گیا۔

منشی اس کے کان میں قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

(''باپ کی نظر سے دیکھتے ہو، اس لیے بچی لگتی ہے۔'')

☆☆☆

''یہاں جانا ہے۔'' نرمین جس گھر کے سامنے رکی، وہ کالونی کی آخری گلی میں تھا۔ تین منزلہ پرانا مگر اچھا بنا ہوا گھر...... جس کی دونوں بالکونیوں میں رکھے گملوں میں لگی بیلیں زردی مائل نظر آ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے باہر کی طرف کھلتے دروازے کے عین سامنے بجلی کا کھمبا تھا، جس پر کیبل کے جھولتے تاروں نے گھر کی خوب صورتی کو ماند کر دیا تھا۔

''جی ابو! یہی گھر ہے۔'' نرمین نے بیگ ایک کندھے سے دوسرے پر منتقل کیا۔

''میں نہیں جا رہا۔'' انور بدک کر پیچھے مڑا۔

''لیکن کیوں؟'' نرمین پریشان ہو گئی۔

''تجھے نہیں پتا ان کا بابا بہت ڈاڈھا اور کپتا (غصے والا) ہے۔''

انور حسین یہ گھر کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جب شروع شروع میں اس نے ریڑھی لگائی تو ریڑھی کے ساتھ ایک عدد گدھا بھی تھا۔ وہ صبح صبح منڈی سے سبزی لا کر اسی کالونی میں بیچا کرتا۔ اسپیکر پر اس کی آواز اور سبزی کی اقسام سن کر عورتیں اپنے کام ادھورے چھوڑ کر بیرونی دروازے کی طرف لپکتیں۔

اب نہ انور حسین کو پتا تھا اور نہ اس کے گدھے کو کہ جس وقت وہ اسپیکر پر آلو لو...... گوبھی اتنے روپے کلو......

مٹرا تنے روپے پاؤ کی گردان کرتا، گدھا بھی سُر کے ساتھ سُر ملانے لگتا۔ عین وہی وقت نمبردار صاحب کے قرآن پڑھنے کا تھا۔ ٹھکانا بھی عین بیٹھک کی بیرونی کھڑکی کے ساتھ رکھا پلنگ تھا۔

بس ایک دن جلال میں آ کرانہوں نے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ پوری کالونی نے دیکھا۔ انور حسین کو اپنا صافہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

''شیطان کی اولاد، آج کے بعد تیری یہ منحوس آواز سنی تو گدھے کی جگہ تُو اور تیری جگہ تیرا کھوتا بیٹھا ہوگا۔ کم بخت کو یہ نہیں پتا کہ میں یہاں بیٹھا سبق پڑھ رہا ہوں۔ میرے سر پر آ کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے۔''

نرمین منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

''نہیں ابا جی......! دادا جی تو بہت اچھے ہیں۔''

''کون سے دادا جی؟''

''اندر تو چلیں۔'' نرمین نے بیٹھک کھٹکھٹائی تو عثمان نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

انور حسین نے بصد احترام اپنا جوتا دروازے میں ہی اتار دیا۔ نمبردار صاحب دوپہر کا کھانا کھا کر محو قیلولہ تھے۔ چونک کر جاگے۔

''دادا جی! یہ میرے ابو ہیں۔''

''اچھا اچھا......'' انہوں نے ہاتھ نکالا۔ انور حسین نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور سمٹ کر صوفے کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بچے دوسرے کونے میں بیگ لے کر آ گئے تو نرمین انہیں پڑھانے لگی۔

''کیا کام کرتے ہو برخُودار؟''

انور کی رکی سانس بحال ہوئی گویا وہ اسے پہچان نہ پائے تھے۔

''ریڑھی لگاتا ہوں......'' پھر ذرا توقف کے بعد وضاحت دی۔ ''مونگ پھلی اور شکر قندی کی۔''

''ٹھیک...... اسپیکر وسپیکر تو نہیں لگایا ریڑھی پر۔''

''ناں جی۔''

''اچھی بات ہے۔ یہاں تو سارا دن سبزی والے گزرتے ہیں۔ نہ نماز کا وقت دیکھتے ہیں نہ قرآن کا...... بس لگے ہیں دنیا کمانے۔ ایک کم بخت تو عین میری کھڑکی کے سامنے آ کر اسپیکر آن کرتا تھا۔ ادھر میں نے قرآن پاک کھولا، ادھر اس کی منحوس آواز......بس پھر ایک دن کیا ہوا کہ میں نے......'' نمبردار صاحب شروع ہو گئے۔

انور حسین نے ماتھے پر آیا پسینہ صافے سے صاف کیا۔

''میں نے تو جی کبھی زندگی میں سبزی نہیں بیچی۔''

نرمین اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ کر بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہم مسجد میں ادب اور قمیض سے بیٹھتے ہیں۔'' رامین رٹا لگا رہی تھی۔

کوئی بیس بار دہرانے پر قمیض ''تمیز'' میں بدلی تو وہ عائزہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو ای فار مرغی کا انڈا یاد کر رہی تھی۔

آج تیسرے دن بھی مرغی کا انڈا EGG میں نہ بدلا تھا۔ دادا دادی پنجابی، ماں باپ اردو اور اسکول انگریزی...... چوں چوں کا مربہ تو بننا ہی تھا۔

نرمین کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا کہ باپ نے نمبردار صاحب سے ملنے کے بعد ٹیوشن جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

''فرخ! ایک دو اور ٹیوشن ڈھونڈ دو نا۔''
خدیجہ خالہ کے لیے ڈھیر سارا لہسن چھیل کر کوٹ کر ڈبی میں اسی آس میں ڈالا تھا کہ اسے فرخ سے بات کرنے کا موقعہ ملے۔ وہ خود ٹیوشن پڑھ کر آیا تھا۔ سامنے بیٹھی نرمین کو دیکھ کر کھل سا گیا۔ اسے نرمین اچھی لگتی تھی۔ خدیجہ فرخ کے کھانے کو کچھ لینے کچن میں چلی گئی تھیں۔
''سلام نہ دعا..... بس فرخ ٹیوشن ڈھونڈو۔ خود کس وقت پڑھو گی۔'' فرخ نے ہاتھ میں پکڑا جرنل اور کتابیں میز پر پھینکیں۔
''پڑھ بھی لوں گی۔'' نرمین جھنجلا گئی۔
''ایسی ٹیوشنز روز روز نہیں ملتیں۔ وہ تو بچے چھوٹے ہیں جو انہوں نے انڈر میٹرک کو پڑھانے پر لگا دیا۔ ورنہ کون کرتا ہے۔'' فرخ نے سچ ہی بولا تھا۔ نرمین چپ کر گئی۔
''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔'' خدیجہ میکرونیز سے بھری پلیٹ لے کر آئیں۔
''اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ جتنا اچھا پڑھو گی، اتنی ہی اچھی نوکری ملے گی۔''
''اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔'' وہ میز کے پاس نیچے قالین پر بیٹھی تھی۔ اٹھ کر اوپر صوفے پر بیٹھ گئی۔
''تو تجھے جلدی کس بات کی ہے؟'' خدیجہ نے مسکرا کر اور پیار سے اس دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔ جو ایک ہی دن میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔
''مجھے لاکھوں جمع کرنے ہیں۔'' فرخ نے چونک کر صوفے کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتی نرمین کو دیکھا۔
''اوئی ماں۔ تمہیں لاکھوں کی کہاں ضرورت پڑ گئی؟'' خدیجہ نے حیرت سے ٹھوڑی پر انگلی جمائی۔
''ابو کو ضرورت ہے۔ انہیں قرضہ ادا کرنا ہے۔''
''ارے، ابو کی ذمہ داریاں ابو پر چھوڑ دو۔ لو چھوٹی سی جان، کیسے خود کو ہلکان کر رہی ہے۔''
''چلتی ہوں خالہ! ابھی اسکول کا کام بھی کرنا ہے۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔
''اپنی ماں سے کہنا وہ بھی پیروں سے مہندی دھو لے۔''
''امی کے تو گھر کے کام ہی ختم نہیں ہوتے اور تم.....'' خدیجہ کو جواب دے کر اس نے بے حد ناراضی سے فرخ کو دیکھا جو کیسے مزے سے میکرونی پر کیچپ ڈال ڈال کر کھا رہا تھا۔ مجال ہے جو ایک بار بھی صلح ماری ہو۔
''ایسی الا بلا چیزیں کھاتے ہو، تب ہی تو سیخ سلائی ہو۔ خالہ! اسے مکھن اور دودھ دیا کریں۔''
''خبردار، جو میری اسمارٹنس کو نظر لگائی۔ خود کھا لو مکھن اور دودھ۔''
فرخ کو تاؤ آ گیا۔ اپنے بے حد لمبے قد اور دبلے پن کی وجہ سے وہ ویسے ہی احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا۔
''ہمیں تو ملتے ہی نہیں، ورنہ تمہیں دکھاتے، کیسے کھاتے ہیں مکھن ......اور کیسے پیتے ہیں دودھ......'' کہہ کر خدیجہ کو سلام کرتی یہ جا وہ جا۔
خدیجہ ہنسنے لگیں۔
''وہ مجھے اتنی باتیں سنا گئی اور آپ ہنس رہی ہیں۔''
''ٹھیک تو کہہ گئی ہے۔ لڑکیوں اور چڑیوں کی طرح چوگے نہ چگا کر۔ ڈٹ کر کھایا کر مردوں کی طرح۔ تیرے لیے کتنا کچھ بنا کر رکھتی ہوں۔ بہنیں ہوتی تھیں تو سب چٹ کر جاتی تھیں۔''
خدیجہ بیاہی بیٹیوں کا ذکر کر کے خود ہی اداس ہو گئیں۔ کیسی رونق سی آنگن میں لگی رہتی تھی۔ اب تو کبھی کبھار بچوں کی اسکول کی چھٹیوں میں ہی چکر لگتا تھا۔ یادوں سے ہاتھ چھڑاتے انہوں نے پیار سے نوجوان بیٹے

کو دیکھا اور چپکے سے دل میں سوچا۔
(جلدی سے پڑھ لکھ کر نوکری لگ جائے، میں بہو لے آؤں...... میرے گھر میں بھی رونق ہو جائے۔)
''امی! زرمین اچھی لڑکی ہے۔'' فرخ کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونک کر مسکرائیں۔
''ہاں...... اچھی بھی ہے اور ہمت والی بھی۔ ورنہ ماں تو بالکل بزدل ہے۔ اللہ کرے اچھا پڑھ لکھ جائے تو ماں باپ کا سہارا بنے۔ لڑکے تو بہت ہی چھوٹے ہیں۔ حق ہا...... اچھے بھلے حالات تھے بے چاروں کے...... بس مصیبتوں نے گھر ہی دیکھ لیا۔''
زرمین کے گھر کی داستان سن کر رفیق القلب فرخ کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔
☆☆☆
دھند کا سلسلہ ختم ہو کر دھوپ نکلنے لگی۔ کچھ دنوں تک بارشوں کے سلسلے کی پیشن گوئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ افشاں بھائی کے موبائل پر ایک مووی ڈاؤن لوڈ کر کے لے آئی۔ بھائی نے کن منتوں کے بعد کچھ دیر کے لیے موبائل اس کے حوالے کیا تھا مگر زرمین کو مووی سے زیادہ ان عورتوں کی ویڈیوز دیکھنے میں دلچسپی تھی جنھوں نے کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنا کاروبار کیا تھا۔ ہمسائیوں کے وائی فائی کے سگنل ان کی چھت تک آتے تھے۔
افشاں بور ہونے لگی۔ باہر کسی رکشے کی آواز آئی تو افشاں بھاگ کر منڈیر پر لٹک گئی۔
''کیا ہوا؟'' زرمین نے چونک کر سر اٹھایا۔
''میں سمجھی وہ ہے......'' وہ مایوس ہو کر پاس آ بیٹھی۔
''وہ کون؟''
''تمہارا احد رضا میر۔''
''وہ کون ہے؟'' زرمین کی آنکھوں میں حیرت اتری۔
''دفع ہو۔ کبھی فلمیں، ڈرامے بھی دیکھ لیا کر۔''
''ٹائم ہی نہیں ہوتا۔'' اس نے اداسی سے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔
''ایک بات تو بتا۔'' افشاں اس کی بے نیازی پر مشکوک ہوئی۔
''تو ٹیوشن پڑھانے ہی جاتی ہے نا......''
''اس بات کا کیا مطلب؟'' زرمین بدکی۔ ''پتا نہیں تیرا دماغ اتنا الٹا کیوں چلتا ہے۔''
''اچھا، ناراض نہ ہو۔'' افشاں صلح جو لہجے میں بولی۔
''مجھے تو لگتا ہے اس نے مایوس ہو کر تیری گلی ہی چھوڑ دی ہے۔''
''اچھا ہے نا۔'' زرمین اب بات کی تہہ تک پہنچی اور واقعی حیرت کی بات تھی۔ وہ روز اسی کی گلی سے گزرتی تھی مگر وہ کبھی دکھائی دیا نہ اس کا رکشہ......
''کہیں شہر تو نہیں چھوڑ گیا۔''
''اچھا ہے میری بلا سے دنیا چھوڑ جائے۔'' اس نے چڑ کر سوچا پھر دہل گئی۔ ''نہیں اللہ جی...... غلطی سے منہ سے نکل گیا۔ شہر چھوڑ دے، مگر دنیا نہیں۔ اس کے بھی تو ماں باپ اور بہن بھائی ہوں گے۔''
''مگر فرخ نے کہا تھا وہ اکیلا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے ماں باپ دوسرے شہر میں رہتے ہوں اور وہ ان سے ہی ملنے گیا ہو۔''
''اچھا، اب بس کر۔ کب تک اسی کو سوچتی رہے گی۔'' افشاں نے ٹہوکا دیا۔
''کس کو؟'' وہ بے خیالی میں گویا ہوئی۔

''اپنے احد رضا میر کو۔''
''اس کا نام مراد ہے مراد۔''
''ہائے۔'' کس بے خیالی میں منہ سے نکلا تھا۔ افشاں تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔
مارے شرمندگی کے نرمین کا چہرہ لال ہوگیا۔
''تو کمینی ہے کمینی...... '' وہ اسے مارنے کو بھاگی۔
''تیرے دل کا چور پکڑا گیا نا......'' پوری چھت پر افشاں آگے تھی اور وہ پیچھے، پھر افشاں اپنی چھت پر کود گئی۔
''اب اگر تو نے اپنی منحوس شکل بھی دکھائی تو جان نکال لوں گی۔''
دھمکی دے کر چارپائی پر بیٹھ کر اتھل پتھل سانسیں سنبھالنے لگی۔ تب ہی دیوار کے پاس افشاں نمودار ہوئی۔
''نرمین......!''
نرمین نے جھک کر پتھر اٹھایا۔ تو افشاں چلا اٹھی۔
''نہ ماریں...... نہ...... بس موبائل دے دے۔ بھائی کا ہے۔''
''خود ہی اٹھالے۔'' وہ غصے میں نیچے اتر گئی۔
''اب بتا کمینی تو ہے یا میں۔'' افشاں پیچھے سے چلائی۔
اور مراد کی غیر موجودگی کو صرف ان لوگوں نے ہی نہیں، چائے خانے کے لوگوں نے بھی بری طرح محسوس کیا۔ وہ پڑھا لکھا تھا، اچھی بات کرتا، اس میں غریب لوگوں والی بے حسی بھی نہیں تھی۔ لوگ اسی لیے اسے پسند بھی کرتے تھے۔
دو دن کی غیر حاضری میں لوگ حیران ہوئے تو کاکا پریشانی میں اس کے گھر تک چلا آیا۔ وہ بخار میں دھت پڑا تھا۔
''حد ہوگئی...... بندہ ایک فون ہی کھڑکا دے۔''
''کچھ نہیں، بس ہلکا سا بخار ہے۔ سردی تھی تو کہیں نکلنے کو دل ہی نہیں چاہا۔''
وہ بدقت ٹیک لگا کر بیٹھا۔ بخار کی حدت سے چہرہ دہک رہا تھا۔
کاکے نے اسے زبردستی چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کھلائی۔ ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ فرخ کو پتا چلا تو گھر سے کھچڑی بنوا لایا۔ چائے خانے والے باری باری خبر گیری کے لیے آتے رہے۔ ان کی محبتوں پر مراد کی آنکھیں بھر آئیں۔
ورنہ دو تنہا راتیں کسی عذاب کی طرح گزریں۔
ایسی تنہا راتیں جس میں نہ ماں کے ہاتھ کا لمس تھا۔ نہ کسی کی چاہت کا احساس۔
علی بخش بھی یوں ناراض ہوا کہ پھر کسی خیال سے اس کا گزر تک نہ ہوا۔
''زندگی اکیلے نہیں گزرتی مراد علی! بس اب بیاہ کی تیاری کر۔'' کاکے نے سنجیدگی سے کہا۔
''چاچا ٹھیک کہہ رہے ہیں مراد بھائی! جلدی سے لڑکی پسند کر کے شادی کر ڈالیں۔'' فرخ بھی خوش ہوگیا۔
''لڑکی تو کب کی پسند کر چکا، اب تو بس رشتہ ڈالنا ہے۔'' کاکے نے مراد کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
''بس پھر دیر کس بات کی؟''
''دیر اپنے ہیرو کے ٹھیک ہونے کی ہے۔''
''میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' مراد بے ساختہ بولا تو دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

وہ بس آدھا گھنٹہ لیٹ تھی مگر پتا تھا ماں کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوں گی۔

تب ہی تیزی سے ڈاک خانے کی عمارت کو عبور کیا۔ عمارت پر تالا لگا تھا اور ارد گرد خشک پتوں کے ڈھیر میں آوارہ کتے منہ مارتے پھر رہے تھے۔ کالونی کی خاموش سڑک پر اس کا اسکول کا جوتا کھٹ کھٹ بجتا تھا۔

گرم چادر لپیٹے دوائیوں کا شاپر ہاتھ میں لیے وہ دوسری گلی کے موڑ سے سامنے آیا۔ نرمین رکی۔ نہ اسے دیکھا، بس ناک کی سیدھ میں چلتی گئی۔

مراد نے اسے دیکھا بھی اور ٹھٹک کر رکا بھی۔

سنسان گلیوں نے بڑھاوا دیا تو وہ تیزی سے اس کے برابر آ گیا۔

''نرمین......!'

کیسا نرم سا لہجہ تھا مگر نرمین جیسے پتھر کھا کر رکی۔

''تم سے بات کرنی ہے؟''

بیگ کے اسٹریپ پر گرفت مضبوط کرتے وہ ہوا ہوئی۔

''فاصلہ بہت تھوڑا ہے، بات اس سے بھی مختصر...... پلیز سن لو۔''

''میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' نرمین کی آواز میں گھبراہٹ اور خوف تھا۔

''پیچھا نہیں کروں گا نہ راستے میں آؤں گا۔ بس اتنا کہنا ہے، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے گھر رشتہ بھیج رہا ہوں...... پلیز انکار نہ کرنا۔''

''تم پاگل ہو۔'' وہ ڈر کر رک گئی اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''کیوں، تم سے شادی بس پاگل کر سکتا ہے۔''

''مجھے نہیں کرنی شادی۔''

''دیکھو، میں کوئی برا انسان نہیں ہوں۔ سگریٹ تک نہیں پیتا۔ آمدنی بھی اچھی ہے۔ پیچھے بھی جوڑ رہا ہوں۔ بہت جلد رکشہ بیچ کر ٹیکسی لوں گا۔ ٹیکسی نہیں کار...... کیوں کہ چھوٹا شہر ہے تو ٹیکسی تو یہاں چلے گی نہیں۔ کار تو رینٹ پر نکل جائے گی۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ میرے پیچھے نہ آنا۔''

وہ اسے پیچھے چھوڑ کر تیز تیز نکل گئی۔

''پیچھے نہیں، رشتہ لے کر گھر آؤں گا۔ تم انکار نہ کرنا۔ وعدہ کرتا ہوں تمہیں رکشہ چلانا بھی سکھا دوں گا۔''

وہ زور سے پکارا۔

نرمین نے دوڑ لگا دی۔

مراد ہنسنے لگا۔ ایویں...... بس خواہ مخواہ...... آج بہت دنوں کے بعد اسے دیکھا جو تھا۔

''نرمین! کہاں رہ گئی تھی۔ پتا بھی ہے، میری جان اٹکی رہتی ہے۔'' ثمینہ نے سکون کا سانس لیا۔

''بچوں کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں تو ٹائم زیادہ لگ گیا۔'' وہ ماں سے نظریں نہ ملا پائی۔ ثمرین بیٹھی فضہ کی پونی بنا رہی تھی۔ ثمینہ نے بچوں کے کپڑے بھگو رکھے تھے۔

''ثمرین! جا بہن کو کھانا نکال دے۔''

''نہیں امی! باجی نے چاول کھلا دیے تھے۔''

وہ سیدھی کمرے میں گھس گئی۔ بیگ پھینک کر چت لیٹ گئی۔ ہاتھ پیر اب بھی قابو میں نہ تھے۔ دل دھڑک

دھڑک کے پاگل ہو رہا تھا۔

''بھاگتی ہوئی آئی ہوں اس لیے۔''

نرمین نے خود کو تسلی دی مگر وہ ساری رات اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا رہا تھا۔

''تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو غور سے دیکھنے لگی۔

''مجھ میں ایسا کیا ہے کہ وہ یوں دیوانہ ہو گیا۔''

شیشہ دھندلا تھا مگر مراد کا عکس اس میں بھی واضح تھا۔

''پلیز، تم انکار نہ کرنا۔''

وہ گھبرا کر بستر میں جا چھپی۔ ساری رات نیند ٹوٹتی رہی۔ چہرا میرا تھا مگر نگاہیں اس کی تھیں، جو اسے سونے نہ دیتی تھیں۔

اگلے دن پورا راستہ وہ چونک چونک کر زرافے کی طرح گردن اٹھا کر دیکھتی رہی۔ کہیں پھر سے راستہ نہ روک لے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ یہ پہلی بات تھی جو اس نے ماں سے شیئر نہیں کی، بلکہ افشاں کو بتائی تھی۔

''اوہو...... میں کہتی تھی نا، تمہارا شہزادہ آ گیا ہے۔''

افشاں نے باقاعدہ لڈیاں ڈالیں۔

''شہزادے رکشوں پر نہیں آتے۔'' نرمین سخت تذبذب کا شکار تھی۔ عمر کا تقاضا تھا وہ خوش ہوتی، مگر حالات بدل کر رہے تھے۔

''ریڑھی والوں کے گھر رکشوں پر ہی آتے ہیں۔''

بے ساختہ اور روانی میں افشاں آئینہ اس کے سامنے رکھ گئی۔

نرمین نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ٹھٹک گئی۔

''بات سنو، کہیں تم اونچے اونچے خواب تو نہیں دیکھنے لگیں۔ تو میں صاف صاف کہہ رہی ہوں، نہ تم کوئی حور پری ہو، نہ تمہارے ابو جی کوئی اعلا افسر۔ اس لیے اپنے خوابوں کی اڑان ذرا نیچی کرو اور اپنی حیثیت کے مطابق دیکھو۔''

افشاں نے بڑی سچائی اور سفاکی سے اس کے سامنے پوری حقیقت کھول کر رکھ دی تھی۔

''افشاں! تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو جو میں ایسے بے وقوفوں والے خواب دیکھوں گی۔ پر میں شادی کے بارے میں نہیں...... اپنے گھر کے بارے میں سوچتی ہوں۔ مجھے تو اپنے ابو جی کا بازو بننا ہے۔ ان کا سہارا، ان کا بیٹا بننا ہے۔'' نرمین زخمی لہجے میں بولے گئی۔

''بڑی مہربانی۔ تم ان کی بیٹی بن کر آرام سے اس گھر سے رخصت ہو جاؤ۔ تمہارے ابو جی پر احسان ہوگا۔ ان کا ایک بوجھ، ایک ذمہ داری کم ہو گی۔''

''بیٹی بوجھ ہوتی ہے؟''

''ہاں جی۔ اور اب یہ بوجھ مراد علی خوشی خوشی اٹھانے کو تیار ہو گیا ہے۔ اس لیے تم بس رخصتی کی تیاری کرو۔''

افشاں نے بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔

نرمین بھی خاموش ہو گئی۔

مہینے کا پندرہ سو کما کر وہ ابو جی کا بیٹا تو نہیں بن سکتی تھی۔

''بہتر ہے شادی کر کے ان کا بوجھ ہی کم کر دوں۔'' نرمین نے دل ہی دل میں سوچا۔

''وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں رکشا چلانا بھی سکھا دوں گا۔''

وہ چپکے سے مسکرادی۔

☆☆☆

''اماں!'' گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ گوبر کی پاتھیاں (اپلے) تھوپ کر لگاتے ہوئے اقصیٰ نے ماں کو پکارا۔ وہ پاتھیاں تھاپ رہی تھی اور اقصیٰ دیوار سے چپکا رہی تھی۔

''ہوں۔''

''مجھے کالج میں داخلہ لینا ہے۔''

رشیداں کا ہاتھ رک گیا۔ بے بسی سے سر اٹھا کر بیٹی کو دیکھا۔ ایک سال پہلے بہت ہی اچھے نمبروں سے اس نے میٹرک کیا تھا۔ تب سے اب تک وہ بیٹی کے داخلے کے لیے پیسے ہی جمع کرتی رہی اور داخلے کی تاریخ گزر گئی۔

''اس کے لیے تو شہر جانا پڑے گا۔''

''اماں! لڑکیاں جاتی تو ہیں ویگن میں بیٹھ کر۔'' اقصیٰ اکتا گئی۔ ''صاف کہو، پیسے نہیں ہیں۔''

''ہاں، نہیں ہیں۔'' رشیداں نے ہار مان لی۔ ''تمہارا ابا زندہ ہوتا تو تمہیں ضرور کالج بھجواتا۔ اسے بہت شوق تھا۔ اپنے بچوں کو بہت سارا پڑھانے کا۔''

''اماں! ابا زندہ نہیں ہے۔''

اس نے غصے میں دیوار سے پاتھی گرادی۔

''تو کیا کروں؟ پیسہ نہیں ہے رشیداں کے پاس اور رفیق کی حالت دیکھ رہی ہے۔ پیسہ ہو تو اس کا علاج نہ کروالوں۔''

اقصیٰ چپ کر کے بیٹھ گئی۔

اندر سے ثریا نکلی۔ اسے کپڑے، لتے اور کھانے پینے کی کبھی تنگی نہ ہوئی تھی۔ رشیداں نے ترچھی نظروں سے اس کے قدموں کی رفتار ناپی اور ڈر گئی۔ بشیر گاؤں آیا ہوا تھا۔

''آپا! کہاں جارہی ہو؟'' اقصیٰ نے پوچھا۔

''اپنے کام سے کام رکھ۔'' وہ تڑخ کر کہتی گوبر سے بچتی نکل گئی۔

ثریا کی معصومیت کو دیمک تو کئی سال پہلے ہی لگ گئی تھی اور اب اس دیمک نے اسے اندر ہی اندر کھانا شروع کردیا تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہونے لگی تھی اور چہرے پر عجیب سا خرانٹ پن دکھائی دیتا تھا۔ تب ہی تو پورے گاؤں میں اس کے لیے رشتہ نہ ملتا تھا۔ رفیق بے غیرت تھا یا بے خبر...... رشیداں کو کبھی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

''اماں! دوسری شادی کرنی تھی تو کسی ڈھنگ کے بندے سے کرلیتی۔ یہ رفیق اور اس کی بری میں آئی بیٹی ملی تھی۔''

''چپ...... باپ ہے تیرا۔''

''میرا باپ تو قبر میں ہے۔ ٹاہلی کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے۔'' اقصیٰ نے تنکے سے لکیریں کھینچنا شروع کردیں۔

''اللہ اس کی قبر کو ٹھنڈا رکھے۔''

''ابا سے بہت پیار کرتی تھی نا۔''

''وہ تھا ہی ایسا...... بڑا غیرت والا۔ تھوڑا کماتا تھا۔ تھوڑا کھلاتا تھا پر عزت بہت دیتا تھا۔'' جب بھی رشیداں اس کے باپ کو یاد کر کے مسکراتی، اقصیٰ کو بہت ہی پیاری لگتی تھی۔

اس کے کالج کا قصہ پھر درمیان میں رہ گیا۔ ماں بیٹی باتوں کی پاتھیاں تھاپ کر دل و ذہن کی دیواریں بھرتی رہیں۔ یہاں تک کہ اندر سے رفیق کی گالیاں سنائی دینے لگیں۔

''الو کی پٹھی...... بیٹھ کر اپنے مرے ہوئے خصم کو ہی یاد کرتی رہے گی۔ تجھے بھی بھیج دوں اس کے ساتھ قبر میں۔''

رشیداں اندر کی طرف بھاگی۔ اقصیٰ بے زاری سے بکھرا وا سمیٹنے لگی۔
رفیق کے پیر میں پھر زخم بن گیا تھا۔ بے حس پیر تھا۔ درد بھی نہ ہوتا...... غفور نائی شوگر کی دوا بتا کر دیتا اور زخم صاف کر کے گلا ہوا ماس کاٹ کر پٹی باندھ دیتا تھا۔ اس کے بعد جو تکلیف ہوتی وہ نا قابل برداشت تھی۔ وہ ساری ساری رات چیختا۔
''ڈاکٹر کے پاس چلا جا......'' رشیداں مشورہ دیتی تو وہ سیدھی چپیڑ اس کے منہ پر مارتا۔
''لا پیسے......''
وہ چپ کر جاتی۔ اپنا آپ تو بیچنے سے رہی۔ اقصیٰ اندر آئی اور نلکا کھول کر ہاتھ پاؤں دھونے لگی۔
رشیداں چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ اقصیٰ اندر جاتے جاتے رک گئی۔
رفیق کی چارپائی دھوپ میں تھی۔ چیونٹیاں ایک قطار میں چارپائی کے پائے پر چڑھتی رفیق کا زخمی پیر چاٹ رہی تھیں۔
شوگر میں سویا پیر بے حس تھا۔ نہ رشیداں کو خبر تھی نہ اس کے پیر کو۔ اقصیٰ خوف سے کانپتی کمرے میں بھاگ گئی۔ رشیداں نے دیکھا تو کسی معمول کی طرح اٹھی۔ رفیق کا پیر صاف کر کے چارپائی کے پائے کے تلے پانی گرا دیا۔ اب چیونٹیاں چارپائی پر نہ چڑھ سکتی تھیں۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ ثمینہ نے دال کو بگھار لگایا اور آٹا گوندھنے لگی۔ تب ہی دروازے پر تیز دستک ہوئی۔
''ثمرین! دیکھنا، کون ہے؟'' ثمینہ نے کچن سے آواز لگائی تو ثمرین نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔
''ابا گھر پر ہے؟''
''نہیں۔'' ثمرین نے متلاشی نظروں سے اس آدمی کے سامنے رکھے ٹوکرے کو کھوجا۔ اوپر بوری بندھی تھی مگر اطراف سے جھانکتے شوخ رنگ کینو دکھائی دے رہے تھے۔
''اچھا...... یہ تو اندر رکھواؤ۔'' ثمرین کچن کی طرف بھاگی۔
''امی جی! کوئی بندہ مالٹے لے کر آیا ہے۔''
''تیرے ابا نے منگوائے ہوں گے۔ اسے کہو، صحن میں رکھ جائے اور خبردار جو ہاتھ لگایا۔''
''بی بی جی! منشی اکرم صاحب نے کینو اور سلام بھیجا ہے۔''
آدمی نے صحن میں ٹوکرا رکھ کر آواز لگائی اور چلا گیا۔ ثمینہ اپنی جگہ پتھر ہوگئی۔
''اوئے مالٹے......''
نرمین کی آواز پر پتھر میں جان پڑی۔ وہ اٹھی اور تیزی سے صحن میں بھاگی۔ نرمین ایک کندھے پر بیگ سنبھالے، جھک کر ایک طرف سے کینو نکالنے کو تھی کہ ثمینہ نے آٹا لتھڑے ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی۔
''نمو......! نہ کر...... یہ حرام ہیں ہم پر۔''
''امی! کیا بات کرتی ہیں۔ کینو بھی حرام ہوتے ہیں۔'' نرمین چڑ گئی۔ کلائی پر آٹا لگ گیا تھا۔
''اچھا، ابو جی نے بیچنے کے لیے منگوائے ہوں گے۔''
''اس منشی نے بھیجے ہیں۔'' ثمینہ کی آواز کپکپائی۔
نرمین نے پریشان ہو کر ماں کو دیکھا۔
''ایک پانچ سو کے نوٹ نے ابا کی کیا حالت کر دی تھی۔ اب یہ ٹوکرا؟'' نرمین نے تھوک نگلا۔
نجانے کیا غضب ڈھائے گا۔ نرمین کا دل چاہا وہ گھر بھر کے جوتے چھپا دے۔ مگر انور حسین دم سادھے سر

جھکائے بیٹھا رہا۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔
"اب کیا کرو گے...... یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔" ثمینہ نے ہاتھ مسلے۔
"ابو! اگر آپ نے اس کا قرضہ دینا ہے تو وہ اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے؟"
زمین کے سوال پر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ کا روزہ رکھ لیا۔
☆☆☆
"میں گرانٹی دوں گا......اس خبیث کی۔" منشی اکرم کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ اور کاکا آج منشی سے ملنے گودام آئے تھے کہ چائے خانے میں تو ایسی بات ہو نہ سکتی تھی۔ خبیث بہت تحمل سے مسکرایا۔
"ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔" کاکا اسے سمجھا بجھا کر لایا تھا۔
"اب جو بھی ہے منشی صاحب! آپ سے زیادہ قابل بندہ تو ہمیں پورے علاقے میں نہیں ملے گا۔ پورا چیچہ وطنی اس بات کا گواہ ہے۔"
کاکے کی بات پر منشی کی گردن اکڑ گئی۔
"آہو تے، ہور کی...... باتیں سچی کرتا ہے تُو۔"
مراد نے دل ہی دل میں ان سچی باتوں پر لعنت بھیجی اور ساتھ ہی سوچا۔
"اللہ ایسی ضرورت کسی پر نہ ڈالے جس میں گدھے کو باپ بنانا پڑے۔"
"اب جو بھی ہو، جیسا بھی ہے لڑکا تو اچھا ہے نا۔ اوپر سے دل بھی دے بیٹھا ہے۔" مراد نے کھنکار کر کاکے کو بریک لگائی۔
"اچھا اچھا...... تو یہ بات ہے۔" منشی نے مدبر بن کو پتلی پتلی مونچھوں کو تاؤ دیا۔
"دل کا کیا ہے، کبھی بھی، کسی بھی عمر میں آ جاتا ہے۔"
منشی کے تصور میں زمین کا سراپا جگمگایا اور اس کی ہلکی سی کرن بھی مراد پر پڑ جاتی تو شاید وہ اس کا گلا ہی دبا دیتا۔
"اسی لیے تو سوچا، مل ملا کر اس کا گھر بسا دیتے ہیں۔ علاقے کا بچہ ہے۔ بس آپ مہربانی کریں۔ ذرا ساتھ چلے چلو۔"
"اس میں کیا بات ہے، چلا چلوں گا۔ کسی کی مجال ہے جو منشی اکرم کو انکار کرے۔"
"یہ ہوئی نا بات۔ کہا تھا نا منشی صاحب بڑے مہربان انسان ہیں۔"
کاکے نے مراد کے گھٹنے پر ہاتھ مارا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ مراد کو منشی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔
"شکریہ چاچا!"
"بس یہ احسان یاد رکھنا۔" کاکے کی باتوں نے غبارے میں ہوا بھر دی تھی۔ سو غبارہ اوپر ہی اوپر اڑ رہا تھا۔
"یاد رکھوں گا۔"
"کب چلنا ہے؟"
"کل...... میں رکشا لے آؤں گا۔"
"تیرے رکشے میں جاؤں گا؟" منشی کے لہجے میں حقارت در آئی۔ کاکے نے گھبرا کر مراد کو دیکھا، کہیں اس کا دماغ ہی نہ الٹ جائے۔
"منشی اکرم کی یہ اوقات نہیں۔"
مراد خاموشی سے مسکراتا رہا۔
"اپنی گاڑی میں جاؤں گا، جہاں لے جانا ہو لے جانا۔"

''جی......''

''اوہ ہاں کچھ پھل، مٹھائی بھی لے جانا۔ خواہ مخواہ میری بے عزتی نہ کروادینا کہ کس بھوکے ننگے کا رشتہ لے آیا ہوں۔ اب جاؤ...... مجھے کام کرنا ہے۔''

''اور کوئی حکم؟'' مراد کھڑا ہوا۔

''کچھ نہیں۔ تیاری کر۔ دونوں اکٹھے شادی کریں گے۔''

''ہیں...... رشتہ دیکھ لیا؟'' کاکے نے چونک کر سوال کیا۔

''ڈال بھی دیا۔ ایک دو دن میں جواب آجائے گا۔''

منشی نے فخریہ بتایا تھا۔

اور شام تک جواب آ گیا تھا۔

انور حسین سر پر ٹوکرا رکھے بے حد خاموشی سے دفتر میں داخل ہوا۔ ٹوکرا اور اس ماہ کی قسط اس کے سامنے رکھی اور مڑ گیا۔

منشی اکرم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''انور حسین......''

وہ رک گیا۔ مڑا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''میں نے کہا تھا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔''

''سوچ لیا...... دکان کے بدلے بیٹی نہیں دے سکتا۔ آپ بڑے لوگ ہو، میں نمانا غریب، ریڑھی والا...... ہمارا کوئی میل نہیں۔ کبھی دھرتی آسمان بھی ملے ہیں۔ مجھے معاف کردیں جی! میری بیٹی بالڑی ہے، اس کے لیے اس کے جوڑ کا ہی ڈھونڈوں گا۔''

دھیمی آواز میں بولتا، سلام کرتا وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی سے واپس چلا گیا۔ منشی اسے گالیوں پر گالیاں دیتا رہا۔

''دیکھ لینا...... تجھے کیسے رولتا ہوں۔ رشتوں کی کمی نہیں ہے مجھے...... کم ذات!''

☆☆☆

بہت دنوں کے بعد زرمین نے بال شیمپو کیے تھے۔ سا شے زندہ باد۔ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنا تھا۔ خدیجہ خالہ نے گھر میں میلاد کھوایا تھا اور سب وہیں جارہے تھے۔ طلحہ اور حذیفہ نے نہا کر سفید کرتے پہنے تھے۔ ثمرین اور فضہ نے گھر کی سلی فراکیں...... جن پر ثمینہ نے بڑے پیاری لیسیں لگائی تھیں۔ خدیجہ نے خاص تاکید کی تھی کہ سب نے آنا ہے۔

''افشاں! اب آجاؤ۔'' زرمین نے صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

''بس...... بس آرہی ہوں۔''

تب ہی باہر رکشے کا مخصوص ہارن سنائی دیا اور عین ان کے دروازے کے پاس آکر خاموش ہوا۔ زرمین حیران پریشان گھر کے بند دروازے کو دیکھنے لگی۔

(''رشتہ لے کر گھر آؤں گا۔ تم انکار مت کرنا۔'')

زرمین کا دل مارے گھبراہٹ کے تیز تیز دھڑکنے لگا۔

''سچ میں آ گیا۔''

ان کی دستک سے ہی پہلے چھت کے راستے افشاں اڑتی ہوئی آئی۔

''زرمین......! وہ آ گیا ہے۔ وہ سچ میں آ گیا ہے...... میں نے خود دیکھا...... اس کے پاس مٹھائی اور پھل بھی ہیں۔''

(آ گیا ہے تو دستک کیوں نہیں دیتا)
دونوں ٹکٹکی باندھے دروازے کو دیکھ رہی تھیں اور باہر مراد کھڑا دروازے کو تک رہا تھا۔
"کیا ہوا؟" کاکے نے اسے بت بنے دیکھ کر پوچھا۔
"ہمت نہیں ہو رہی۔"
"مرد بن۔ یہاں تک بنا ہمت کے ہی آ گیا ہے۔"
انہیں منشی اکرم نہ گھر پر ملا تھا نہ گودام پر۔
"میں نے کہا تھا نا، وہ نہیں کرے گا۔ ہمیں بے وقوف بنا کر خود چوہے کی طرح کسی بل میں گھس گیا ہے۔"
مارے غصے کے مراد کا برا حال تھا۔
"بڑا خبیث نکلا۔"
"ٹھیک ہے۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد مراد نے فیصلہ کن ہنکارا ابھرا۔
"مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔"
"کیا مطلب؟" کاکے نے الجھ کر سامنے دیکھا۔
"یہ میں ہوں مراد علی...... اور مجھے اللہ کے سوا کسی آسرے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ میرے نصیب میں ہوئی تو اس کے گھر والے انکار نہیں کریں گے۔" کاکے نے بہت پیار سے سامنے کھڑے کو مراد کو دیکھا۔
سفید شلوار قمیص جس کے کف اور کالر پر ہلکی سی کڑھائی ہوئی تھی۔ وہ کتنا پیارا اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔
"ان شاء اللہ، وہ تیرا نصیب ہوگی۔" کاکے نے اسے گلے لگا لیا۔
قسمت کے آسرے کا کے کا ہاتھ پکڑ، منشی پر لعنت بھیجتا وہ یہاں تک آ پہنچا تھا۔ اب جو اس کے نصیب کا فیصلہ......

☆☆☆

"اتنا غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے، ایک بار اس سے بات تو کروں۔"
خضاب سے بال رنگتے منشی اکرم نے دوبارہ سوچا۔
"ہر بندے کی قیمت ہوتی ہے، اس کی بھی تو ہوگی۔"
بیمار بیوی نے دولہا کی طرح تیار ہوتے شوہر کو دیکھا اور دل ہی دل میں کلس کر رہ گئی۔ خوب جانتی تھی، آج کل شوہر کن ہواؤں میں ہے۔
"اللہ کرے...... کوڑھ ہو جائے اس کمینی کو۔ جس نے اسے قابو کر لیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں بددعائیں دیتی، منشی کو گھر سے نکلتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

"تمہارے کیوں پسینے چھوٹ رہے ہیں۔"
جتنی افشاں کھلی جا رہی تھی، اتنا ہی نرمین پیلی پڑ رہی تھی۔
ثمینہ کو پتا تھا، کون آیا ہے؟ بس تذبذب میں چائے کا انتظام کرنے لگی۔
"ابو نے اسے بیٹھک میں بٹھا لیا ہے۔"
"تو کیا سڑک پر بٹھاتے۔" افشاں کھلکھلائی۔
"تمہارے کیوں دانت نکل رہے ہیں۔"
"مہندی ہے رچنے والی...... ہاتھوں میں......"
نرمین نے اس کا منہ بند کر دیا۔

انور حسین نے مٹھائی اور پھل طلحہ اور حذیفہ کے ہاتھ باورچی خانے میں بھجوا دیے تھے۔

''امی مٹھائی بھی ہے۔'' طلحہ کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ ''میں دو گلاب جامن لوں گا۔'' لوازمات دیکھ کر ثمینہ کو گویا مقصد سمجھ میں آ گیا تھا۔

اور وہ لڑکا مراد یاد بھی آ گیا۔

فضہ نے بتایا تھا، مونگ پھلی والے بھائی جان آئے ہیں۔

''لڑکا تو اچھا ہے۔'' وہ چائے بناتے سوچ رہی تھی۔

کاکے نے بڑے سبھاؤ سے مراد کا رشتہ دیا۔ کچھ کچھ انور حسین مراد سے واقف بھی ہو گیا تھا۔ اسے مراد پسند تھا مگر داماد کے روپ میں کبھی نہ سوچا تھا۔

اس نے سامنے بیٹھے مراد کو غور سے دیکھا۔

اس کے وجدان نے کہا، وہ زمین کو خوش رکھ سکتا ہے۔

مگر ایک ہی سوچ زبان کو تالا لگائے تھی، لڑکا اکیلا تھا۔ نہ خاندان نہ گھر......

''یتیم تھا مگر بگڑا نہیں۔ اپنی محنت سے یہاں تک پہنچا ہے۔ باقی تو نصیب کے کھیل ہیں۔ ہم نے تو عرضی دے دی، تم اپنی تسلی کر لو۔''

بیٹھک کے کھلے دروازے سے منشی اکرم اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم!''

کاکے اور مراد نے مڑ کر دیکھا۔

''منشی صاحب! آپ کو کیسے پتا چلا ہم نے یہاں آنا ہے۔'' کاکے کو خوشی ہوئی۔ ایک سے دو بھلے۔

انور حسین گڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ منشی نے عجیب سی نظروں سے سب کو دیکھا۔

''تو تم دونوں نے یہاں آنا تھا۔''

''جی...... آیئے بیٹھے۔'' اب آ گیا تھا تو مراد نے بھی غصہ ایک طرف رکھ دیا۔ بیٹھنے کے بجائے منشی انور حسین کی طرف مڑا۔

''اچھا تو یہ تھا وہ لونڈا، جس کی خاطر میرے رشتے سے انکار ہوا تھا۔''

''رشتہ......'' مراد تڑپ کر کھڑا ہوا۔

''کس کا رشتہ؟''

''میرا رشتہ...... پر مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کی لڑکی کا تیرے ساتھ چکر چل رہا ہے۔'' اس کی خباثت بھری ہنسی نے مراد کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

''زبان سنبھال کے منشی!''

''نہیں...... نہیں منشی صاحب! ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا۔ یہ تو خود ہی......''

انور حسین پیلا پڑ گیا۔

''پردے کیوں ڈال رہا ہے۔ بتا دے تُو نے پھنسایا ہے یا تیری بیٹی نے...... ظاہر ہے اس عاشق کے سامنے مجھ جیسے شریف انسان کی کیا ویلیو......''

مراد نے تڑپ کر سیدھا گھونسا منشی کے منہ پر دے مارا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

"لگتا ہے اماں گھر پر نہیں ہیں۔"

کتنی دیر تک دروازہ پیٹنے کے بعد کوئی جواب نہ ملنے پر شمی تو تھک ہار کے وہیں دہلیز پر ہی بیٹھ گئی۔ جب کہ اس کے چھوٹے بھائی مزمل نے پھرتی سے اسکول بیگ کندھے سے اتارا۔ لٹک کر دیوار سے اندر گھر کے صحن میں لڑھکا دیا اور خود گلی میں بھاگ نکلا۔ بہن اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

"شمی! ادھر آ، چابی لے جا۔ تیری ماں نانی کی طرف گئی ہے۔"

اتنے میں ہمسائی خالہ عشرت نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اسے پکارا تو وہ فوراً ہی اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی اور چابی پکڑ کر پوچھنے لگی۔

"خالہ خیر تھی ناں...... اماں نے کچھ تو بتایا ہوگا۔"

"نہیں اور تو کچھ نہیں بتایا اس نے بس چابی دے کر گئی ہے۔"

لاعلمی کا اظہار کرتی ہمسائی خالہ نے بھی سر اندر کر کے کھڑکی بند کر لی۔

گھر تو سارا کا سارا یونہی اوندھا پڑا تھا جیسے وہ صبح چھوڑ کر اسکول گئی تھی۔ اس لیے جلدی سے یونیفارم بدل کر منہ ہاتھ دھوتی کچن میں چلی آئی۔ آٹا اور سالن دونوں فریج میں موجود تھے۔ جیسے تیسے کر کے روٹیاں بنائیں سالن گرم کیا پھر گلی میں کرکٹ کھیلتے مزمل کو بلا کر لائی۔ دونوں بہن بھائی نے مل کر کھانا کھایا۔ مزمل تو کھانا کھاتے ہی وہیں فرش پر ہی سو گیا مگر شمی نے اٹھ کر گھر کی صفائی کے لیے کمر باندھ لی۔ سارے گھر کی صفائی اور برتنوں کی دھلائی میں اسے کافی وقت لگ گیا۔ مزمل کو نیند سے جگا کر ٹیوشن بھیجنے کے بعد اب خود بھی اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی۔

سہ پہر ڈھلنے کو تھی جب اماں گھر میں داخل ہوئیں۔ دائیں بغل میں ایک ڈبہ دابے بائیں ہاتھ میں سبزی کا شاپر لٹکائے وہ عجلت میں اندر چلی آئیں۔

"لے شمی! نانی نے تیرے لیے قلاقند بھجوائی ہے۔"

ڈبہ اسے تھما کر خود اماں جلدی سے کچن میں جا گھسیں۔ ابا اور فیضی کے بھی گھر آنے کا وقت ہو رہا تھا اس سے پہلے انہیں کھانا بھی تیار کرنا تھا۔ سو آتے ہی پہلا کام انہوں نے قیمہ چڑھانے کا کیا۔

وہ شاپر میں سے کریلے نکال کر ٹوکری میں رکھ رہی تھیں کہ ڈبہ ہاتھ میں لیے شمی ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"نانی تو ٹھیک تھیں ناں اماں! جو آپ کو یوں اچانک سے جانا پڑا۔"

"بیمار ہوں اس کے دشمن، مجھے اماں نے ہی فون کر کے بلوایا تھا۔ منصور کی بیوی جو آج کل زیادہ ہی ہواؤں میں اڑنے لگی ہے اس کے پر بھی تو کاٹنے تھے ناں کچھ سبق سکھانا تو بنتا تھا پھر میرا۔"

جس بے نیازی سے وہ بول رہی تھیں شمی بس تاسف سے انہیں دیکھے گئی۔

"منہ زور ایسی کہ میری ماں کو آنکھیں دکھاتی ہے

اس کی اجازت لیے بغیر میکے چل پڑے گی تو کبھی بازار ،ساس بیمار گھر میں پڑی ہے اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ آئے روز شام میں اپنی طبیعت خرابی کا بتا کر ڈاکٹر سے دوائی کے بہانے منصور اور بچوں کے ساتھ موٹر سائیکل پر سیریں ہو رہی ہیں وہ تو اس کے چھوٹے والے واصف نے دادی کے آگے بھانڈا پھوڑا کہ ہم تو پاپا کے ساتھ سیر کو گئے تھے۔ چاٹ اور آئس کریم کھا کر آ رہے ہیں اماں کو ورنہ کدھر پتا چلتا۔ اس کی انہی روز کی من مانیوں سے

تنگ آ کر ہی اماں نے مجھے بلاوا دے بھیجا تھا کہ آج یہ گھر پر ہے۔ کسی طرح بھی پہنچ میں بھی، پھر وہ طبیعت صاف کر کے آئی ہوں کہ یاد رکھے گی۔ استانی ہو گی اسکول میں یہاں تو ہماری ماں کے ہی چلنا پڑے گا۔“

”چھوڑیں اماں، تائی جانیں اور ماموں مامی۔ آپ بھلا بیچ میں کیوں آ جاتی ہیں ہر بار۔“

”ہائے لڑکی کچھ عقل کی بات کر۔“

ثمی نے بات ہی ایسی کی کہ کریلے چھیلتی اماں

کے ہاتھ فوراً سے رکے، اپنے مزاج کے برخلاف بات سننے کی وہ عادی ہی کب تھیں۔ ایک خطرناک سی گھوری اس پر ڈال کر وہ خاصی ترشی سے بولیں۔

”یہ بتا اور کتنی بیٹیاں ہیں میری اماں کی جو ایک میرے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا پھر مجھ سے ہی تو دبتی ہیں اس کی دونوں بہوویں۔ میں بھی نہ جاؤں تو اس بڑھیا کو دن دیہاڑے بیچ کھائیں پہلے ہی وہ اسے دیوار سے لگانے پر تلی ہوئی ہیں دونوں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ نانی کیوں ہر وقت ہنگامہ کھڑا کیے رکھتی ہیں۔ اچھی خاصی تو خدمت گزار ہیں ان کی دونوں بہوویں، آگے پیچھے پھرتی ہیں ساس کے نانی کو اور کیا چاہیے۔ اللہ کا شکر کریں۔ اوپر سے ہماری اماں بھی حد کرتی ہیں نانی کی ایک فون کال پر لڑنے پہنچ جاتی ہیں۔“

لیکن ماں کی ناراضی کے ڈر سے شمی یہ بات دل میں ہی سوچ کر رہ گئی وہ جانتی تھی کہ طیبہ مامی سے تو ویسے بھی اماں کو بلاوجہ کا بیر تھا کچھ تو وہ ان کی خوب صورتی اور قابلیت کی وجہ سے خائف رہتیں۔ ایک اسکول ٹیچر ہونے کے علاوہ سلائی کڑھائی میں بھی خوب ماہر تھیں، اپنے طریقے سلیقے سے گھر کو انہوں نے اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔

”اکو...... اک تو داماد تھا اماں کا...... تیرا ابا...... اسے ایک گھڑی تک تو پہنا نہ سکے تھے شادی پر اس کے پچھلے اور باتیں کرتی ہے نوابوں والی جیسے ہم کچھ جانتے نہ ہوں۔“

”ہائے وہی پرانا شکوہ۔“ شمی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

”آہ! میری اماں اور نانی کا مشترکہ غم، ابا کو گھڑی کا نہ ملنا ہے۔“

حالانکہ منصور ماموں کی شادی کو اتنے برس ہونے کو آئے تھے مگر آج بھی دونوں کا دکھ تازہ تھا ہر لڑائی میں جسے ضرور دہرایا جاتا۔

”میں نے تو کہا ہے اماں سے صاف صاف کہ بلواؤ اس کے باپ بھائیوں کو اور کرو چلتا اسے ان کے ساتھ ہم بھی دیکھیں کتنے دن بٹھا کر کھلاتے ہیں اسے۔“

اماں کا بڑھتا ہوا غصہ، اس کے چکر میں نمک لگے کریلوں کو بھی انہوں نے کچھ زیادہ نچوڑ ڈالا کہ وہ چورا چورا ہو گئے۔

”بس پھر تو لگی مانگنے معافیاں وہ...... شکل دیکھنے والی تھی تب اس چالاکو...... کی۔“

اس بات پر سارا غصہ بھول کر وہ باقاعدگی تالی بجا کر ہنسی تھیں۔

طیبہ مامی کو نیچا دکھا کر اماں تو جیسے کوئی معرکہ سر کر آئی تھیں۔ ان کا بڑھتا ہوا خوش وخروش دیکھ کر شمی نے بھی خاموشی سے اپنا ہوم ورک مکمل کرنے میں عافیت جانی۔

☆☆☆

اماں کا تو ویسے بھی تین تین گھروں میں سکہ چل رہا تھا۔ میکے میں بھابیوں اور سسرال میں ساس نندوں کو خاطر میں نہ لانا ان کا وطیرہ تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی سے معرکہ آرا ہی رہتیں ان کے اسی ہائی مورال کی وجہ سے گھر اکثر دنگا فساد کا مرکز بنا رہتا۔ شمی یہ سب کچھ دیکھ کر بڑی ہوئی تھی۔

ازلی شریف ہونے کی وجہ سے ابا بھی سدا ان سے دبتے ہی آئے تھے۔ کیا مجال ان کی جو عید تہوار کے علاوہ بھی اپنی ماں بہنوں سے مل لیں۔ لہٰذا یہ کام وہ چوری چھپے ہی کر آیا کرتے اور گھر میں کسی کو بھنک تک نہ پڑنے دیتے۔ اماں جیسے طور طریقے لگ بھگ ان کی بڑی بیٹی نیلی میں بھی موجود تھے۔ نتیجتاً وہ بھی آئے روز ساس نندوں سے لڑ جھگڑ کر میکے آ بیٹھتی اور پھر ہفتوں یہیں ڈیرہ جمائے رکھتی، جب تک وہاں سے کوئی لینے نہ آ جاتا۔

فیضی سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا۔ آٹو میکینک کا کام سکھ کر اس نے اپنا آٹو اسٹور بنا لیا۔ لڑکا محنتی تھا کچھ ہی عرصہ میں اس کا اسٹور چل نکلا اور خاصی کمائی ہونے لگی۔ ایک تو کماؤ اوپر سے ماں باپ کا فرماں بردار پھر ماں کا دماغ بھلا کیوں نہ ساتویں آسمان پر پہنچتا۔

آج کل وہ اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی مہم پر تھیں اور کوئی لڑکی ان کی پسند پر پوری نہ اترتی۔ بہر طور پر ان کی نگاہ انتخاب درجنوں لڑکیوں کو دیکھنے

کے بعد ہی ٹھہری تھی۔ سفید رنگت، سرمئی آنکھیں، لمبے بھورے بالوں کے ساتھ مناسب قد کاٹھ وہ جتنی خوب صورت تھی شادی کے بعد اتنی ہی پھوہڑ اور کام چور نکلی۔ میک اپ، سیلفی اور گھومنے پھرنے کی شوقین گھر کا کھانا جیسے بمشکل ہضم ہو پاتا۔

"زہرہ! تجھے مان لیا کمال کی بہو ڈھونڈ کر لائی ہے۔ سچ کہو ادھر ٹیوب لائٹ کیا کرے گی جدھر یہ جا بیٹھے۔"

شروع شروع میں تو اماں بھی خوب صورت بہو کے انتخاب پر محلے والیوں اور رشتہ داروں سے داد بٹورتی، اٹھلائی پھریں اور اس کے تمام عیب نظر انداز کر کے شمی کو ساتھ لگائے خود بھی گھر کے کاموں میں ہلکان ہوئے جاتیں۔ کالج سے واپسی پر بہتیرے کام شمی کے منتظر ہوتے اپنی پڑھائی کو پس پشت ڈال کر جنہیں سرانجام دینے میں وہ ہلکان رہتی مجال جو ایمن اس کی کوئی مدد کر دے۔

مگر ایک روز منہ کے زاویے بنا بنا کر اسے سیلفیاں لیتے دیکھ کر اماں کے اندر کی روایتی ساس نے باہر آنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔

"سرخی پاؤڈر تھوپ کر تو یوں بیٹھی رہتی ہے کوئی ماڈل ہو جیسے۔ چھ ماہ ہوئے تجھے بیاہ کر آئے۔ خیر میں کب سے تجھے میں ہاتھ ڈلوا چکی۔ اتنا نہیں ہوتا اٹھ کے اب کوئی کام ہی دیکھ لے۔"

ساس کا چھوڑا نشتر وہ فی الوقت سہہ تو گئی۔ مارے باندھے کچھ کام کر بھی لیتی تو بیزاری سے۔ "پورا دن برتن دھو دھو کر ہاتھ ہی کالے کرتی پھروں مجھ سے نہیں ہوتے یہ فضول سے کام۔"

دودھ کی خالی پتیلی اس نے سنک میں پٹخی تھی۔

برتن مانجھتی بہو کی بڑبڑاہٹ اماں بھی بخوبی سن چکی تھیں۔ اس لیے فوراً طیش میں آ گئیں۔

"نہ تجھے آتا ہی کیا ہے نخروں کے سوا، کپڑے دھونے میں تجھے مشکل، ہانڈی چولہا کرنے میں تو تھکی، برتن مانجھنے میں ہاتھ کالے ہو جائیں...... آخر تو کرے گی کیا؟"

"وہ زمانہ خواب ہوا اماں کہ بہو سسرالیوں کی خدمت میں اپنی خوب صورتی بھی ختم کر بیٹھے۔ اچھی طرح سن لیں مجھ سے نہ ہوں گی یہ دھلائیاں صفائیاں اور سب کی خدمتیں۔" ساس کی للکار پر ایمن بھی جواب دینے سے باز نہ آئی۔

"تیری ماں تو پھر ہمیں وہ شوکیس دینا ہی بھول گئی جس میں تجھے سجا کر رکھ چھوڑتے۔" بہو کی اس جرأت پر اماں تلملا کر بولیں۔

"یہ پڑا ہے سب کچھ۔" برتن وہیں پھینک کر وہ تن فن کرتی کچن سے باہر نکل گئی۔

"کرتی ہوں تیرا اچھے سے بندوبست۔ آنے دو فیضی کو آج۔" وہ پیچھے سے چلائیں مگر ایمن اتنی دیر میں دھپ دھپ سیڑھیاں پھلانگتی چھت پر بھی پہنچ چکی تھی۔

طبل جنگ بج گیا۔ لیکن بھابیوں اور ساس نندوں کی طرح اپنی بہو پر اماں کا رعب نہ چل سکا۔ وہ سیر تھیں تو بہو سوا سیر نکلی۔ معمولی کھٹ پٹ روز کا معمول بن گئی۔ ایک روز وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الاماں۔ نیلی ماں کی مدد کو کسی بوتل والے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ دونوں طرف سے خوب لفظی گولہ باری ہوئی۔ نوبت تو شاید چھتروں اور مکوں تک بھی آ جاتی اگر فیضی بر وقت آ کر بیچ بچاؤ نہ کروا دیتا۔ بات بالآخر چولہا علیحدہ کرنے پر ہی ٹلی تھی۔

☆☆☆

جس کا سب سے زیادہ شکر شمی نے ہی منایا۔ گھر کے کاموں میں لگ کر جسے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا یہ خوشی اس وقت عارضی ثابت ہوئی جب چند روز بعد ہی نیلی پھر سسرالیوں سے لڑ جھگڑ کر اپنے چاروں بچوں کے ساتھ میکے آ بیٹھی۔

کیسا بلند مورال تھا اماں کا۔ اس وقت بھی بجائے بیٹی کی کھنچائی کرنے، اسے کچھ عقل دینے کے الٹا وہ روزانہ ہی فون کر کے کبھی اس کی ساس یا پھر شوہر کو کھری کھری سنا رہی ہوتیں۔ خود تو نیلی ہل کر پانی بھی نہ پیتی اور سب کاموں کے لیے بہن کو آوازیں لگاتی۔

"اے شمی! سن ذرا۔ چار پانچ آلو کاٹ کے بچوں کو چپس تو تل دے۔ میری جان کھائے جا رہے ہیں۔"

وہ بے چاری یہاں سے وہاں بہن کے حکم کی

تعمیل میں بھاگتی پھرتی۔

"میرے اللہ، سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ ایک کپ ہی بنا دے اور سن ساتھ میں دو پاپے بھی رکھ لانا۔" انٹر کے امتحان بھی سر پر تھے اور شمی اپنی جھنجھٹوں میں مست مگن۔

"شمی! کہاں غائب ہو گئی، سمیع کا فیڈر تو بنا لا جلدی سے، چپ ہی نہیں کرتا۔ بھوک لگی ہے اسے۔"

سب کو کھانا وغیرہ کھلا کر کچن سمیٹ کے ابھی اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ نیلی کی پکار پر اسے وہیں رکھ کے دوڑی۔ واپسی پر بچوں کے ہاتھوں ورق ورق پھٹی کتاب جو ہاتھ آئی تو چند لمحوں کے لیے پتھرا سی گئی۔

پورے کمرے میں اڑتے ہوائی جہاز اور پانی کی کشتیاں بناتے بچے دیکھ کر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ بھاگتی ہوئی جا کر اماں کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔

"جا تو اوپر بھابھی کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ لے، دیکھ میں ان فتنوں کا کیا حشر کرتی ہوں۔"

بالآخر اماں کو رحم آ ہی گیا اور اسے بھابھی کے کمرے میں پڑھنے بھیج دیا۔ اماں، ابا دونوں ہی زیادہ پڑھائی کے حق میں تو تھے نہیں اس لیے انٹر کرتے ہی شمی کو گھر بٹھا دیا۔ خود اماں بھی ساری گرہستی اسے سونپ کر بے فکر ہو گئیں۔

☆☆☆

"توبہ خیر چاندنی چوک کی لڑکیاں۔" ابھی ابھی سلیمہ نے آ کر جو خبر سنائی تھی، وہ سنتے ہی شمسہ نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"کیوں باقی شہر میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا تھا جو ثریا چاندنی چوک میں جا گھسی۔"

"نہ بابا نہ۔ میں تو اس راستے سے بھی نہ گزروں۔ ادھر کی بہو لانے سے بہتر ہے، میں بیٹے کا بیاہ ہی نہ کروں۔" شمسہ کے بعد عذرا نے بھی کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"مت ماری گئی ہے اس ثریا کی ورنہ تو سب کو پتا ہے کہ وہاں کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔ دن میں تارے دکھا دینے والی منہ پھٹ اور لڑاکا سی اپنی شامت کو آواز دے رہی ہے ثریا بھی۔"

سویٹر ادھیڑ کر اس کے دھاگے کا گولہ بناتی رانی نے قدرے فکر مندی سے ثریا کے لیے ہمدردی دکھائی تو شمسہ فوراً سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"اے چھوڑو پرے۔ ہمیں کیا لینا دینا۔ کرتی پھرے وہاں رشتہ ہم تو تب دیکھیں گے جب چاندنی چوک کی لڑکی آ کر ساس کی خاص خدمت کرے گی، پھر ہو گا ناں ہمارا کندھا اس کے رونے کو۔"

شمسہ کی اس بات پر باقی سب بھی چشم تصور میں ثریا کا روتا چہرہ دیکھ کر دوپٹے منہ پر رکھ کر ہنسنے لگیں۔

ثریا نے جب سے اپنے بیٹے عدیل کا رشتہ طے کیا تھا، اس کی آس پڑوس کی ہمسائیوں اور سہیلیوں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا تھا۔ بڑی بے تابی سے وہ اس روز کی منتظر تھیں جب ثریا کی بہو آ کر اسے ناکوں چنے چبوائے گی۔ مگر ایسا کچھ تو نہ ہوا بلکہ وہ ہو گیا جس کا کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔

اسے بہو کے ہاتھوں خوار ہوتا دیکھنے کی خواہاں یہ چاروں عورتیں اس وقت ساکت رہ گئیں جب کدو رنگ کی لان کا جوڑا پہنے (کچے ٹانکے کی ہم رنگ کڑھائی کے ساتھ جس پر کہیں کہیں شیشے بھی ٹانکے گئے تھے) ثریا باہر سبزی لینے نکلی۔ بالوں کی چٹیا بنائے سلیقے سے دوپٹا اوڑھے اجلی سوبر سی ثریا کو دیکھ کر یک لخت ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو جیسے۔ اسے تکتی سلیمہ تو شاید نالی میں ہی گر جاتی، عذرا اگر اسے بروقت نہ تھام لیتی۔

یہاں تو الٹی گنگا بہہ نکلی تھی۔ کہاں تو سارا دن گھر کے کاموں میں الجھی، خود سے بے نیاز میلی سی ثریا، کپڑے بدلنے یا بال بنانے کی اسے فرصت ہی کب تھی اور اب یہ عالم کہ اس کے نکھرے روپ پر سے نظریں نہ ہٹیں۔

اس کی بہو شمی نے بیاہ کر آتے ہی گھر کے تمام کاموں کی ذمہ داری خود جو سنبھال لی تھی اور ساس کو ان تمام فکروں سے آزاد کر دیا۔

"اماں! یہ رقم اب آپ کی ہے۔" ساس کا دل تو اس نے سسرال آتے ہی جیت لیا۔ جب میکے اور سسرال دونوں طرف سے ملنے والی سلامیوں کی تمام

رقم اس نے ساس کے حوالے کی تھی۔

ثریا بھی گھی مکھن سا لہجہ لیے اسے ثمی میری دھی (بیٹی) کہتے نہ تھکتی۔

اپنی شادی کے شروع دنوں میں ہی روایتی دلہنوں کی طرح ناز اٹھوانے کے بجائے اس نے جھاڑو اٹھا لیا۔ وہ گھر جہاں صفائی کی اشد ضرورت تھی۔ کچن سمیت پورے صحن میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کا راج تھا۔ جب تک گھر کا کونا کونا نہ چمکا لیا، ثمی چین سے نہ بیٹھی۔

"ابھی تو میٹھے میں بھی ہاتھ نہیں ڈالا تو نے۔"

ساس نے جھاڑو پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا مگر وہ بھی دھن کی پکی نکلی، چند روز میں ہی گھر کا حلیہ بدل کے رکھ دیا۔

"میں غلطی سے کسی اور گھر میں تو نہیں آ گیا، یہ میرا ہی گھر ہے ناں؟" عدیل ایک شام کام سے لوٹا تو جگمگ کرتا گھر دیکھ کر ادھر دروازے پر ہی کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔

"میں نے زندگی میں کوئی نیکی کی ہے، جس کا تم انعام ہو ثمی۔ اس گھر کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ میرے دل پر بھی قبضہ کر بیٹھی ہو۔ کام پر جا کے بھی دل بس تمہارے خیال میں ہی کھویا رہتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

اس بات پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے ثمی نے اسے یوں دیکھا کہ اس کے شربتی نین کٹورے بھی ساتھ ہنس دیے۔ عدیل نے ہائے کہہ کر وہیں اپنا دل تھام لیا تھا۔

"لے ثریا! تیرا بیٹا تو گیا کام سے۔ میری بات یاد رکھنا پکا زن مرید بنے گا یہ آگے جا کر۔"

بیٹے کو بیوی کے آگے پیچھے پھرتا دیکھ کر اسے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے ثمی کے سسر نے صدا لگائی لیکن اس کے بعد پھر کبھی وہ یہ بات دہرا نہ پائے کیونکہ اگلے روز سے ہی ناشتے اور کھانے کے علاوہ بھی جب بہو کے ہاتھوں دو ٹائم کی چائے انہیں باقاعدگی سے ملنے لگی وہ بھی ملائی مار کے۔ تو پھر کس کم بخت کو پڑی تھی کفران نعمت کی۔ اب تو وہ بھی رات دن ثمی بہو کے نام کی مالا جپے جاتے۔

دونوں نندیں اپنے گھروں کی تھیں وہ جب بھی میکے آتیں ثمی ان کے آگے پیچھے پھرتی۔ دل و جان سے خاطر میں لگ جاتی اور وہ اس پر نہال ہوئے بغیر نہ رہ پاتیں۔ چھوٹے دونوں دیور الگ بھابھی بھابھی کا راگ الاپتے آخر کو وہ بھی تو ان کا خیال اپنے چھوٹے بھائی مزمل کی طرح ہی رکھتی تھی۔

میکہ گرچہ زیادہ دور تو نہ تھا مگر وہ ثمی ہی کیا جو مہینے سے پہلے وہاں قدم رکھ جائے۔ اماں اسے بلاتی رہ جاتیں مگر وہ ہر بار کوئی نہ کوئی مصروفیت بتا کر انہیں ٹال دیتی۔ اس مرتبہ وہ اسے خود لینے چلی آئیں۔

"بہن جی! بے شک یہ دھی (بیٹی) تو آپ کی ہے۔ ضرور لے جائیں پر روٹی میں کسی اور کے ہاتھ کی نہ کھاؤں گا۔ ایسی نرم روٹی تو اس کی ساس سے بھی نہیں بنتی۔ ثمی میرا پتر! جانے سے پہلے چار روٹیاں تو توے سے اتارتی جانا، میں دو دن نکال لوں گا۔"

سمدھی کے منہ سے بیٹی کی تعریفیں سن کر اماں کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا تھا۔

دراصل اخلاقیات تو سسرال میں بھی اس کے میکے سے دو ہاتھ بڑھ کے ہی تھے لیکن شمیلہ عرف ثمی نے اپنی ماں اور نانی کے اطوار سے کچھ سیکھا، نہ ہی بہن اور بھابھی کے راستے پر چلنے کی کوشش کی۔ حقیقت میں وہ تو ان سب کے طور طریقوں سے بےزار اور باغی تھی۔ ہاں البتہ ان ہی کی وجہ سے چھوٹی عمر میں اسے ایک بڑا سبق ضرور ازبر ہو چکا تھا کہ گھر کو میدان جنگ بنانا ہے یا پھر آرام و سکون کا مسکن۔ یہ کسی حد تک ایک لڑکی کے اپنے ہاتھ میں بھی ہو سکتا ہے۔

"جب میکے میں گھر سنبھالتی آئی ہوں، سب کی خدمت کی ہے تو سسرال میں کیوں نہیں۔ یہ تو پھر اب میرا اپنا گھر ہے۔"

بس یہ سوچ کر محبت اور خلوص کی چاشنی کے ساتھ عزت اور خدمت کا ہتھیار بنا کر ثمی نے بھی بنا لڑے یہ جنگ جیت لی اور گھر کو گوشۂ سکون بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے مکینوں کے دل میں بھی گھر کر لیا۔

☆

نعیمہ ناز

اسکول بیگ کی کھلی زپ سے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا کا بہت پیارا سا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اب تو بریک ٹائم تھا۔ فریحہ نے بلا جھجک گڑیا بیگ سے باہر نکال لی۔

"اف کتنی پیاری گڑیا ہے؟" آس پاس بیٹھی ساری ہم جولیوں کی آنکھیں چمک اٹھیں، جتنے رشک اور اشتیاق کے ساتھ وہ گڑیا کو دیکھ رہی تھیں، ویسے ہی رشک کے ساتھ ان ساری چمکیلی آنکھوں نے فریحہ کو دیکھا جس کی ملکیت اور بیگ میں وہ گڑیا تھی۔

"انکل لائے ہیں لندن سے۔ پورا ڈول ہاؤس، ساری چیزیں ہیں اس کی۔ اتنے پیارے ڈریسز ہیں۔ کیا بتاؤں، میں باری باری چیزیں لا کر دکھاؤں گی۔" فریحہ کے لہجے میں کچھ اتراہٹ تھی کچھ جوش، کچھ خوشی، "ایسی پیاری ڈول کسی کے پاس بھی نہیں ہے یہاں۔" فریحہ مزید اترائی۔

"جی نہیں، اب ایسی بھی پری نہیں ہے تمہاری باربی، میرے پاس اس سے پیاری ڈول ہے اور تم سے بھی پیارا ڈول ہاؤس۔" منیبہ عرف مانو نے ایک جھٹکے سے اپنا سر فخر سے اٹھایا۔

"ہیں! سچی؟ تمہارے پاس اس سے بھی پیاری ڈول ہے۔" اور اس سے بھی پیارا ڈول ہاؤس؟ رشک میں ڈوبی نگاہیں مانو پر مرکوز ہوگئیں اور ان نگاہوں میں رشک کے علاوہ حیرت اور دلچسپی تھی۔

"ہاں! میرے پاس ہے اس سے زیادہ پیاری ڈول اور اس سے زیادہ خوب صورت ڈول ہاؤس، میری آنٹی کینیڈا سے لائی تھیں میرے لیے۔" مانو نے اپنی بات پھر دہرائی۔

مکمل ناول

"ٹھیک ہے کل لا کر دکھانا اپنی باربی، دیکھ لیں گے، وہ زیادہ بیوٹی فل ہے یا میری ڈول زیادہ پیاری ہے؟" فریحہ نے اسے چیلنج کیا۔

"دکھادوں گی؟" مانو نے لاپروائی سے اپنے کندھے اچکائے مگر یہ لاپروا انداز شام میں گھر پر امی اور پاپا کے سامنے منت سماجت اور ضد میں ڈھل گیا۔

"مجھے آج ہی سب سے خوب صورت ڈول ہاؤس اور سب سے پیاری باربی ڈول چاہیے۔" مانو کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"تمہیں کس نے مشورہ دیا کہ جھوٹ بولو، کتنی بار سمجھایا ہے کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔" امی نے تو بغیر لحاظ کے اسے ڈانٹ دیا۔

"پاپا! آپ دلا دیں نا۔ سب سے پیارا ڈول ہاؤس اور باربی ڈول۔" مانو نے باپ سے رجوع کیا۔

"مانو! آپ ابھی صرف آٹھ برس کی ہو اور باتیں بڑوں والی کرنے لگی ہو۔ آپ نے یہ جو شیخی ماری اپنی فرینڈز کے سامنے اور جھوٹ بولا اب آپ کے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے میں کچھ نہیں خرید کے دوں گا نہ ڈول ہاؤس نہ باربی ڈول نہ کچھ اور۔" پاپا نے تو امی سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اسے لیکچر اور ڈانٹ دونوں کا ڈوز دیا۔

"اف ف ف......!" مانو پیر پٹختی ہوئی وہاں سے ہٹی تھی۔

☆☆☆

اگلا اور آخری سہارا اور امید زین بھائی تھے۔ جو مانو کو بے حد عزیز از جان سمجھتے ہی نہیں بلکہ رکھتے بھی تھے۔ ہوم ورک میں اس کی مدد کرنا، اس کی غلطیوں کو چھپانا، اس کے ساتھ کھیلنا، اس کے لاڈ اٹھانا۔ ناز نخرے، بدتمیزیاں، برداشت کرنا اور ایسے کئی کاموں کو مانو کے لیے کرتے، جن کی فہرست یقیناً بہت طویل تھی۔ مگر زین بے چارہ بھی مجبور تھا۔

پہلوٹھی کی اولاد، جسے "بہن" کا بہت شوق اور ارمان تھا مگر ہوا کچھ یوں کہ زین کے بعد طلحہ پھر جڑواں حسان اور حسام کی یکے بعد دیگرے آمد نے سارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ زین کے بھی اور اس کی امی کے بھی، جنہیں بیٹی کی شدید خواہش تھی۔

اب حال یہ تھا کہ دونوں ماں بیٹے نے مل کر مانو کو جیسے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا۔ اس کی جائز ناجائز ہر ضد، ہر خواہش پوری کرنا وہ جیسے اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

مانو کو بھی ان کی اس محبت کا ادراک اور احساس تھا جب بھی وہ اپنے والدین سے اپنی ضد منوانے میں ناکام ہو جاتی تو بھاگی بھاگی زین بھائی اور بڑی امی عرف مما کے پاس آجاتی۔

"زین بھائی......" مانو نے بس اتنا ہی کہا اور بھرائی ہوئی آواز حلق میں پھنس گئی اور آنکھوں میں جمع آنسو بہہ نکلے۔

"کیا ہوا مانو، رو کیوں رہی ہو؟" زین ہوم ورک ایک طرف کر کے مانو کو بہلانے اور چمکارنے میں لگ گیا۔ بہت دیر اور بار بار پوچھنے کے بعد مانو نے اپنی مشکل بتائی۔ وہ بھی روتے روتے، یہ تو اسے معلوم تھا کہ رونے سے اس کے اکثر کام ہو ہی جاتے تھے۔

"اچھا تم رونا تو بند کرو، میں کرتا ہوں کچھ۔" زین نے اپنی پیشانی مسلی۔ وہ تیرہ برس کا تھا اور اتنی سمجھ اور عقل تو اسے تھی کہ اس وقت مما کا یا کسی کا بھی بازار جانا ناممکن تو نہیں مگر بے حد مشکل ضرور تھا۔ مگر ان کو بتانا ضروری تھا۔ ورنہ مانو کے مسئلے کا حل کیسے نکلتا۔

مما کے پاس پہنچ کر مانو کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے مگر آہیں اور سسکیاں جاری تھیں۔

"بیٹے! اس وقت میں کہاں سے لاؤں گی تمہاری باربی ڈول؟" مما بے چاری گھبرا گئیں۔

"کل اسکول کا آف کر لو۔" زین نے مشورہ دیا۔

"امی، پاپا کبھی بھی نہیں کرنے دیں گے؟" مانو نے نفی میں سر ہلایا۔

"میری فرینڈز اور کلاس فیلوز میرا مذاق

اڑائیں گی۔"

ایک بار پھر مانو کی آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو آگئے۔

"رومت بیٹا۔ میں کرتی ہوں کچھ۔" مما کو اس کے آنسوؤں کی تاب نہیں تھی۔ انہوں نے مانو کو چمٹا لیا۔

اور اگلے دو گھنٹوں میں مانو کا مسئلہ حل ہو گیا۔ شوہر کے ساتھ جا کر سب سے مہنگی اور جدید وضع کی باربی ڈول اور پورا ڈول ہاؤس خرید کے لے آئیں۔ دیور اور دیورانی ان کی محبت کی قدر کرتے تھے۔ ان کے جذبات کا احترام کرتے تھے۔ پھر بھی دبے لفظوں میں انہوں نے اعتراض کیا اور اس طرح مانو مزید بگڑ جائے گی۔ مگر ان کے اعتراض کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔

"بچی ہے ابھی۔ بڑی ہو گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔" مگر وہ بچی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی۔ مما کے خیال یا امید کو غلط ثابت کرتی جا رہی تھی۔ عادت بھی پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ سہیلیوں کے سامنے شیخی بگھار دیتی۔ جھوٹ بول دیتی پھر جب خود سے کچھ نہ بن پاتا تو بھاگی بھاگی زین کے پاس آجاتی۔ بے چارہ زین کبھی خود سے کبھی مما کی مدد سے اس کا مسئلہ حل کر ہی دیتا۔ کھلونے، کپڑے، جوتے، اسپورٹس سائیکل، منفرد گفٹ آئٹمز کا دور ختم ہوا ساتھ ساتھ اسکول کا بھی۔ اب موبائل، آئی پیڈ ٹیبلٹ اور لیپ ٹاپ کے مسائل شروع ہو گئے تھے۔

"تم لوگ کالج پڑھنے جاتی ہو یا اس قسم کی فالتو باتیں کرنے؟" زین بھائی، اتنی پیاری سی لاڈلی بہن پر غصہ تو نہیں کرتے تھے مگر جھنجلا ضرور جاتے تھے لیکن کبھی کبھی۔

"کلاس میں پڑھتے تو ہیں۔" اب سموسے یا آلو چاٹ کھاتے وقت بھی یہی بورنگ اور خشک باتیں کرتے رہیں؟" مانو نے اپنی خوب صورت سی ناک چڑھاتے ہوئے تنک کر جواب دیا۔

"تعلیم کے متعلق باتیں نہ بورنگ ہوتی ہیں نہ خشک، دلچسپی لینے کی بات ہے بس اور اپنے کلاس فیلوز سے میں بھی پڑھائی میں بہت مدد ملتی ہے۔" زین بھائی ایک پڑھاکو اور سمجھ دار قسم کے لڑکے تھے۔ سب کو عموماً اور مانو کو خصوصاً تعلیم پر لیکچر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

"اس کے لیے فرینڈز کا ذہین ہونا ضروری ہے۔ پڑھاکو ہونا ضروری ہے۔ اپنی مانو تو ایسی سہیلیوں کے جھرمٹ میں رہتی ہیں جو اے پلس اور خالی خولی اے تو کیا بی گریڈ والی بھی نہیں ہیں۔ کسی کا سی، کسی کا ڈی، بلکہ پیپر ہی کلیئر ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔"

طلحہ نہ جانے کہاں سے آن دھمکا تھا اور اسے جلا جلا کے تیل چھڑک رہا تھا۔

"تمہارے ڈفر اور لفنگے دوستوں سے تو لاکھ درجے اچھی ہیں میری سہیلیاں۔"

مانو آستین چڑھا کر میدان میں آگئی۔ اسی میدان میں جہاں پچھلے کئی برسوں سے دونوں ٹام اینڈ جیری کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہتے تھے اور صلح صفائی کے سفید جھنڈے بھی لہراتے رہتے تھے۔ کانا مجھے بھائے نہیں۔ کانا بن سہائے نہیں۔

"کبھی تعارف کرواؤ تو پتا چلے، کون کتنے پانی میں ہے۔ ابھی تو صرف یہی خبر آئی ہے کہ وہ جو ماہ نور صاحبہ ہیں جن کے چہرے پر زلفیں اور لٹیں اتنی بکھری ہوتی ہیں کہ آنکھیں پتا چلتی ہیں نہ ناک کہ کہاں ہیں۔ سنا ہے ان کے منگیتر روٹھ گئے ہیں ان سے اور وہ تم جیسی مخلوق سے انہیں منانے کے نسخے پوچھ رہی تھیں۔ جس کے پاس نہ فیانسی نہ فیانسی کا بھوت۔"

"تم...... تم اول درجے کے ذلیل انسان، تم نے چھپ چھپ کر ہماری باتیں سنی ہیں۔"

مانو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے طلحہ کم بخت کا منہ نوچ لے جو بڑے مزے سے اس کی عزیز از جان سہیلی اور اس کے اتنے سنگین مسئلے پر اتنی بے رحمی سے تبصرہ کر رہا تھا۔

"چھپ چھپ کر کیوں سنتا! جبکہ بلند آواز میں

تمہاری سہیلی باتیں کر رہی تھی بلکہ رو رہی تھی۔ وہ پورے نہیں تو آدھے محلے نے تو سنی ہوں گی۔''

مانو کو چڑانے میں تو طلحہ کو وہ لطف آتا تھا کہ بس، زندگی کا ہر مزا جیسے اس کے آگے ہیچ تھا۔

''زین بھائی، دیکھ رہے ہیں آپ اسے؟ قتل ہو جائے گا کسی دن میرے ہاتھوں۔'' مانو نے ایسی خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا تھا کہ کوئی بھوکا ببر شیر بھی کسی آدم زاد کو کیا دیکھے گا۔

''کر کے تو دیکھو، یہی زین بھائی تمہارے خلاف، پرچہ کٹوا کر پھانسی گھاٹ پہنچائیں گے، پہلے میں دنیا میں آیا تھا۔ پہلے وہ میرے بھائی ہیں۔ پھر تمہارے ہیں۔'' طلحہ اترایا اور جب وہ اس طرح بولتا تھا تو اس کی آنکھیں ایسے چمکنے لگتی تھیں کہ بس آسمان پر سجے ستارے بھی اسے دیکھ کر یہی سوچتے یار اس نے تو ہمیں بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

''زین بھائی...... مانو کی۔'' دھاڑ پر زین کے ہاتھ تو رکے ہی رکے۔ یقیناً اس لیپ ٹاپ کی بھی سانسیں ایک لمحے کو تھم سی گئیں۔ جس پر زین کام کر رہے تھے۔

''اف ف......!'' طلحہ تو دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا باہر بھاگ لیا۔ اور زین بھائی بے چارگی سے مانو کو دیکھنے لگے۔

''مانو، بہت ضروری اسائنمنٹ ہے۔'' یقیناً اس فقرے کا بین السطور مطلب یہی تھا کہ اب آپ بھی یہاں سے تشریف لے جائیں۔ مانو مگر وہ اپنی بات بلکہ اپنا مسئلہ بیان کیے بغیر کیسے یہاں سے تشریف لے جا سکتی تھی؟

''زین بھائی وہ جو ہماری کلاس فیلو ہے نا ماہ گل وہ اتنا اتراتی ہے اتنا اتراتی ہے کہ میں کیا بتاؤں آپ کو۔'' مانو نے تمہید باندھی۔

''مانو پلیز کم ٹو دا پوائنٹ۔'' زین چارہ سچ مچ بہت ضروری کام کر رہا تھا اور اس وقت کسی کی بھی مداخلت اسے گوارا نہیں تھی مگر یہ تو مانو تھی جو اپنے چہرے پر بے چارگی اور معصومیت اکٹھی کیے کھڑی تھی۔

''وہ شیخی بھی بہت مارتی ہے۔ اتنی لمبی چھوٹی ہے کہ بس۔''

''مانو! تم نے کیا کہا اس سے، مجھے بتاؤ۔'' زین بھائی زچ ہو گئے۔

''وہ...... وہ ہے نا اس کے پاپا نے نئے ماڈل کی کرولا خریدی ہے۔ ڈرائیور کے ہمراہ، اس میں بیٹھ کر آتی ہے روزانہ کالج، ہم سب میں بیٹھ کر اتنا شو آف کرتی ہے۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ یہ کرولا پرولا اب کون پوچھتا ہے۔ ہمارے گھر میں تو لینڈ کروزر ہے۔''

''لینڈ کروزر؟ خواب میں دیکھی تھی کیا گھر میں؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں بھی ایک عدد کرولا ہی ہے وہ بھی پانچ سال پرانے ماڈل کی اور ایک عدد آلٹو جو......'' زین اس کی معلومات ٹھیک کر رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے زین بھائی مگر اب کیا کروں، میری عزت کا سوال ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ کل میں اسی پر کالج آؤں گی۔'' مانو نے زین کی بات کاٹتے ہوئے اصل بات کی۔

''اسی پر، یعنی کہ لینڈ کروزر پر اور وہ میں کہاں سے لاؤں؟ مانو تم اب بڑی ہو گئی ہو مگر تمہاری حماقتیں ختم نہیں ہوئیں۔ ایسے اسٹوپڈ قسم کے دعوے کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔'' زین جھنجلا گیا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس کے یا کسی کے بھی لیکچرز سے مانو کی یہ عادت ختم نہیں ہو گی جواب پختہ ہو چکی ہے۔

''کچھ کریں نا زین بھائی پلیز؟'' مانو گڑگڑائی تھی۔

''کیا کروں؟ اب راتوں رات لینڈ کرزور کہاں سے لاؤں، تم بھی حد کرتی ہو۔''

''آپ کے دوست ہیں نا یونی فیلو، جو بہت لینڈ لارڈ ہیں۔ آپ سے ملنے آئے تھے تو لینڈ کروزر میں ہی تو آئے تھے۔'' مانو کا دماغ یا اس کی یادداشت ایسے موقعوں پر خوب کام کرتی تھی۔

''وہ گاڑی اس کے باپ کی ہے۔''
''تو کیا ہوا۔ دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ چند گھنٹوں کی تو بات ہے وہ اپنے ابا سے لے کر آپ کو دے دے، ویسے بھی یہاں بھی تو اس میں بیٹھ کر آیا تھا۔'' مانو نے دلیل پیش کی۔
''اتنی مہنگی گاڑی، کون کسی کو دیتا ہے؟ خدا کو مانو لڑکی۔''
''مانگ کون رہا ہے؟ بس مجھے کالج کے گیٹ پر ڈراپ کروادیں۔ بلکہ آپ بھی ساتھ ہی بیٹھ جایئے گا۔ میرے ساتھ ٹھیک ہے۔ اکیلے تو مجھے ڈر لگے گا۔ اتنی خوفناک مونچھوں والا ڈرائیور تھا آپ کے دوست کا۔ توبہ توبہ!'' مانو کو جھرجھری آگئی۔
''پتا نہیں تم کب سدھروگی؟'' زین نے لاچار ہوکر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں ماں بیٹے اس لڑکی کے آگے یوں ہی بے بس ہو جاتے تھے۔
اپنے دوست کو فون کر کے کچھ سچ جھوٹ بول کر مانو کا کام تو ہو گیا تھا مگر زین بھائی اب سوچ میں پڑ گئے تھے۔ مانو کا یہ رویہ اور یہ انداز شاید بچپن اور لڑکپن تک تو چل گیا مگر اب یہ سلسلہ اور اس طرح کا طریقہ عادت کب تک چلتے رہے؟ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔

☆☆☆

کالج سے گھر واپس آکر سب سے پہلے چینج کر کے۔ فریش ہو کر وہ کچن میں بھاگی آئی۔
''امی! بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں کیا پکایا ہے؟'' وہ آگے بڑھ کر دیکھنے لگی۔ امی چولہے کے آگے کھڑی ہنڈیا بھون رہی تھیں۔ باقی سب برتن دھلے ہوئے رکھے تھے۔
''ذرا صبر کرو، بنا رہی ہوں سالن، ایک تو جمیلہ (ماسی) نے آج چھٹی کرلی۔ اور میری تکلیف بھی آج ہی زیادہ ہوئی تھی۔ اب ذرا ہاتھ پیر کھلے تو کچن میں آئی ہوں۔''
امی کو کچھ عرصے سے جوڑوں کی تکلیف ہوگئی تھی اور خصوصاً سردیوں میں تو صبح اٹھنا ہی محال تھا۔ جب تک دھوپ پھیل کر خوب تیز نہ ہو جاتی ان کے ہاتھ پیر کام ہی نہیں کرتے تھے۔
''کھانا بنانے کے لیے کسی کو رکھ لیں نا، جب کام نہیں ہوتا تو نہ کریں۔'' مانو کئی بار انہیں مشورہ دے چکی تھی۔
''ارے بیٹا! اس بہانے کچھ ہاتھ پیر چلا لیتی ہوں، بیٹھ گئی تو پھر بالکل ہی جسم بے کار ہو جائے گا۔ حرکت میں برکت ہے۔''
اور ان کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ جھاڑو برتن اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی رکھی ہوئی تھی اب اگر کھانا پکانے سے بھی ہاتھ اٹھا لیتیں تو واقعی بالکل ہی بیٹھ جاتیں۔
''چاول نہیں پکائے؟ پتا تو ہے دوپہر میں چاول ہی اچھے لگتے ہیں۔'' مانو کا موڈ آف ہونے لگا۔
''چکن قورمہ بن رہا ہے۔ دال بھی رکھی ہے۔ تھوڑے سے چاول بگھارنے میں کیا ٹائم لگے گا۔ زیرے کا بگھار لگا کر پکنے کو رکھ دو۔ نکالو وہاں سے چاول، جار میں رکھے ہیں۔'' امی نے نصیحت کی پٹاری کھولتے ہوئے اسے راستہ بھی دکھایا۔
''اتنی تھکی ہوئی آتی ہوں کالج سے، اب وہاں سے آکر کھانا پکاؤں؟'' مانو کی تو آنکھیں حلقوں سے باہر آگئیں۔
''بڑے پہاڑ، پتھر ڈھو کر آتی ہو۔ جو تھک جاتی ہو۔ وین لگی ہوئی بھی کوئی بچہ چھوڑ آتا ہے گاڑی پر کون سا میلوں پیدل چلتی ہو؟''
امی کو بیٹی کی نازک مزاجی، ہڈحرامی ایک آنکھ نہ بھاتی، انہیں یہ فکر ہرگز نہیں تھی کہ مستقبل میں پرائے گھر یا چلو سسرال جا کر یہ نیک بی بی کیا کریں گی؟ بلکہ وہ یہ کہتی تھیں کہ کام کرنا تو ہر انسان کے اپنے لیے اچھا ہے۔ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ اپنی صحت، اپنے بدن کی مشین کے لیے کام ضروری ہے۔ اب اتنا آرام، آسائشیں اور سہولیات ہوتے ہوئے۔ ذرا ذرا سے کاموں پر بھی ناک منہ چڑھانا اور ان سے بچنے کی

کوشش کرنا۔ یہ سستی کاہلی خود اپنے لیے نقصان دہ ہے۔ مگر وہ اس طرح کے کئی لیکچرز بیٹی کو دے کر بے نتیجہ ہوتے دیکھ چکی تھیں۔ مگر پھر بھی نہ وہ اپنی روش ترک کرتی تھیں نہ بیٹی اپنی مرضی چلانے سے باز آتی تھی۔ ان کے علاوہ گھر کے باقی سب افراد کا یہی خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ٹھیک ہو جائے گی یعنی کہ سدھر جائے گی۔

"پانچ فٹ چھ انچ کا ہو کر بھی بندہ نہ سدھرے تو پھر کب سدھرے گا؟"

امی باآواز بلند اپنے خیالات کا اظہار کرتیں مگر ان سے اتفاق کرنے والے کم ہی ہوتے تھے۔ ہاں بس ایک طلحہ تھا جو مانو کے خلاف ان کی ہر بات سے اتفاق بھی کرتا تھا بلکہ برابر لقمے بھی دیتا تھا۔ ان کی حمایت میں مانو کے خلاف جو نہ کہے وہ کم ہے۔ تب ہی مانو کی اور اس کی کبھی بنتی ہی نہیں تھی۔

"اوپر جا کر دیکھتی ہوں، مما نے ضرور چاول پکائے ہوں گے۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور نہ ہی یہ کہتے ہی سیڑھیوں کی طرف دوڑ پڑنا، کوئی انوکھا معاملہ تھا۔ بس سو باتوں کی ایک بات کہ سیکنڈ ایئر میں آ کر وہ آج بھی ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں کلاس ون میں تھی۔

"مما، چاول پکائے ہیں یا نہیں؟" اوپر کے کچن میں ڈھکن کھول کھول کر وہ پتیلیاں چیک کر رہی تھی۔

"ارے رے...... اسے نہ کھولنا، ابھی ابھی دم پر لگائے ہیں چاول، ساری بھاپ نکل جائے گی۔" انہوں نے مانو کو روکا۔

"شکر ہے۔ کون سے چاول پکائے ہیں!" مانو نے شکر ادا کیا اور اشتیاق ظاہر کیا۔

"مٹر پلاؤ ہے۔ بس دس، پندرہ منٹ صبر کرو، پھر میں کھانا لگاتی ہوں۔"

بڑی امی عرف مما نے نصیحت تو کر دی مگر مانو میں صبر، تحمل اور ٹھہراؤ نام کے اوصاف تھے ہی کہاں۔ کرسی پر بیٹھ کر پاؤں ہلاتی رہی۔ جھولا جھولتی رہی۔ کٹے ہوئے کھیرے اور گاجر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر ٹونگتی رہی۔ پھر توجہ اس دبلی پتلی لڑکی کی طرف ہو گئی جو کھٹا کھٹ چپاتیاں بنا رہی تھی۔

ابھی چاروں لڑکے کالج اور یونیورسٹی سے آنے والے تھے اور کھانے میں سب کو سالن روٹی چاہیے ہوتا تھوڑے بہت چاول تو مما اپنے اور مانو کے لیے پکوا لیتی تھیں۔ نیچے بھی یہی حال تھا کہ روٹی سالن کھانے والے زیادہ تھے۔ چاول کا شوقین کوئی نہیں تھا سوائے مانو کے اور وہ سیدھی یہیں آتی تھی۔

مما چاول پکائے ہیں؟

"یہ کون ہے؟ اور وہ کہاں گئیں ہاجرہ آنٹی؟" مانو نے پچھلی کام والی کے متعلق استفسار کیا۔

"ہاجرہ کی بیٹی ہی تو ہے۔ وہ کہیں اور کام کرنے لگی ہے۔ اسے اپنی جگہ لگا گئی ہے۔" مما کچن سے باہر آتے ہوئے بتانے لگیں۔

"اتنی چھوٹی سی تو ہے، میرے ہی برابر لگ رہی ہے۔" مانو نے پیچھے مڑ کر ایک نظر اسے دوبارہ دیکھا پھر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کر ریموٹ اٹھا لیا۔

"ہاں، بس تمہاری ہی ہم عمر ہے۔ جلدی شادی کر دی تھی۔ دو سال بعد میاں فوت ہو گیا۔ ایک بچہ ہے۔ میکے آ گئی مگر یوں بٹھا کے کون کھلاتا، باپ تو ویسے ہی نشئی ہے نکما، نکھٹو بیوی کی کمائی پر عیش کرتا ہے ہاجرہ نے ایک گھر اور ڈھونڈ لیا کام کے لیے اسے یہاں لگا گئی کہہ رہی تھی باجی آپ کا گھر تو بھروسے کا ہے۔ سب بچے سامنے ہی پلے بڑھے ہیں۔ بیس بائیس سال ہو گئے دیکھتے ہوئے، کسی نئی جگہ نئے لوگوں کا کیا بھروسا۔"

مما دھیمی آواز میں مانو کو بتا رہی تھیں۔ وہ یونہی دنیا جہان کی باتیں اور اپنے سارے راز و نیاز مانو سے کر لیتی تھیں۔ "اوہ، اچھا" مانو کے چہرے پر کچھ افسوس کے تاثرات آئے اور اگلے ہی لمحے ریموٹ سے وہ ٹی وی آن کر رہی تھی۔

"السلام علیکم ...... السلام علیکم ......!" حسان اور حسام ایک ہی کالج میں تھے۔ وہ ایک ساتھ آئے۔

پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے طلحہ اور زین بھائی بھی وارد ہوگئے۔

''آج پھر بھوکے ندیدے لوگ بیٹھے ہیں۔ لوگوں کو اپنے گھروں میں چین کیوں نہیں ملتا۔ جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔'' طلحہ اس کے قریب سے گزارا اور لفظی گولہ باری کرتا ہوا گزر اتھا۔

''کوئی، کہیں بھی جائے۔ کہیں بھی کھائے، کسی خوامخواہ کو کیا تکلیف ہے؟'' مانو اتنی آواز میں غرائی تھی کہ فریق مخالف تک آگ کے شعلے پہنچ جائیں اور وہ بھج ہی گئے۔ طلحہ کا ایک نام ''مسٹر خوامخواہ'' بھی تھا۔

''کچھ لوگوں کو مفت خوری کی عادت پڑ جاتی ہے۔'' طلحہ وہیں سامنے بیٹھا جوتے موزے اتار رہا تھا۔ اتنا برا بھپکا تھا بدبو کا۔ مانو تلملا کے کھڑی ہوگئی۔

''توبہ توبہ جنگل کے جانور بھی اتنے گندے، غلیظ اور بدبودار نہیں ہوتے۔'' مانو نے اپنی ناک بند کی۔

''کون سے جنگل کے، جہاں سے تم آئی تھیں؟'' کمال معصومیت سے سوال کیا گیا۔ مگر مانو سنی ان سنی کر کے کچن کا رخ کر چکی تھی۔

مسٹر خوامخواہ کی شرارے برساتی یا آگ اگلتی زبان کا مقابلہ کرسکتی تھی مگر یہ بدبو اگلتی ہوئی جرابیں تو بہ توبہ، برداشت سے باہر تھیں۔ وہ تو فوراً ہی کچن میں بھاگ لی۔

''چاول دم پر آگئے؟'' بے صبری سے ڈھکن ہٹا کر چیک کرنے لگی۔

''جی!'' وہ خاموش طبع لڑکی میز پر پلیٹیں لگا رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' مانو نے بھی برتن اور دیگر اشیاء اٹھا کر میز پر رکھنی شروع کر دی۔

''جی...... دعا۔''

''دعا، بہت اچھا نام ہے۔''

مانو نے سلاد کی پلیٹ سے پھر گاجر کا ٹکڑا اٹھایا۔ اتنے میں مما بھی آگئیں اور آگے پیچھے ان کے بچے بھی، مانو تو پلیٹ میں مٹر پلاؤ بھر کے اس پر رائتہ اور سلاد ڈال کر شروع ہوگئی تھی۔ طلحہ بھی ذرا مینرز تہذیب کے دائرے میں تھا۔ زین بھائی اور خصوصاً والدہ ماجدہ کے سامنے اس دائرے میں رہنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ کان کھینچ کر اسے دائرے میں لانا جانتی تھیں۔

☆☆☆

موسم کے تیور ٹھیک ٹھاک بدل چکے تھے۔ خشک اور بے رنگ شاموں کی جگہ سرد ہواؤں میں لپٹی شامیں آگئی تھیں۔ گرد آلود، بے رنگ صبحوں کی جگہ ٹھنڈی ٹھنڈی اوس میں بھیگی ہوئی صبحیں تھیں۔ فقط چند ہفتوں کی بلکہ گنتی کے دنوں کی سردی تھی جسے اہلیان کراچی پوری طرح اپنے دامن میں، اپنے دن و رات میں صبح و شام میں بھر لینا چاہتے تھے۔ بوڑھے اور بیمار افراد کے لیے تو خیر ہر موسم ہی آفت جان ہوتا ہے غضب ڈھاتا ہے۔ مگر باقیوں کے لیے یہ ایسا موسم ہے جس کا انتظار سال کے تین سو تیں چالیس دن کا کیا جاتا ہے۔

ان ہی دیوانوں میں ایک دیوانی مانو بھی تھی۔ ابھی اکتوبر بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ امی کے پیچھے پڑ گئی۔

''ونٹر شاپنگ کے لیے چلیں نا، کب چلیں گی؟ مجھے سردیوں کے کپڑے لینے ہیں جیکٹس، سوئٹر، شال، جینز، ہائی نیک، اتنا پیارا کلیکشن آیا ہوا ہے مال میں۔'' مانو روزانہ ماں کو یاد دہانی کرواتی تھی۔

''بیٹا یہ شہر کراچی ہے ابھی تو فقط اکتوبر کا اینڈ ہے۔ یہاں تو اگر دسمبر میں ٹھنڈی ہوائیں چل پڑیں اور تھوڑی بہت سردی احسان کرتے ہوئے آجائے تو غنیمت جانو۔'' پاپا نے اخبار پڑھتے ہوئے دخل در معقولات کی۔

''گاجر کا حلوہ بنے گا۔ گرما گرم فرائی فش، ڈفرینٹ فلیورز کے سوپ اور آئس کریم، سردیوں میں آئس کریم کتنی مزے کی لگتی ہے نا پاپا۔'' مانو کے منہ میں پانی آرہا تھا۔

''ارے بھئی بیگم صاحبہ! اس بار گڑ کے میٹھے

چاول تو ضرور بنایئے گا۔ پچھلے سال بھی بس ایک آدھ بار ہی کھائے تھے۔ شاید" پاپا جان نے اخبار سے نگاہیں ہٹا کر فرمائش کی۔

"بنا دوں گی۔ دسمبر تو آنے دیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سردیاں تو آنے دیں یہاں تو کبھی دسمبر بھی دھوکا دے جاتا ہے۔ آ جاتا ہے مگر سردی اپنے ساتھ نہیں لاتا۔" بیگم صاحبہ مسکرائیں۔

اور اب دسمبر آ گیا تھا۔ اس کے ہمراہ کچھ سرد ہوائیں اور ٹھنڈ بھی آ ہی گئی تھی۔ گڑ کے میٹھے چاول بنائے جا چکے تھے۔ کھا پی چکے تھے۔ مانو کی من پسند شاپنگ ہو گئی تھی۔ نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات جیکٹس سوئٹرز، اتنا ڈھیر خرید کے لے آئی جیسے یہاں دو چار ہفتوں کی ٹھنڈ نہیں بلکہ چار چھ ماہ کی برف باری ہوتی ہو۔ امی روکتی اور ٹوکتی ہی رہ جاتیں مگر وہ اپنے اکلوتے پن کا فائدہ اٹھانا جانتی تھی۔ اگرچہ اس سے چھوٹے دو بھائی بھی تھے مگر اوپر نیچے دونوں گھرانوں میں تو وہ اکلوتی لڑکی تھی۔ جس کی وجہ سے سب کی لاڈلی بھی خوب تھی۔

چھٹی کا دن، کسی کے لیے یہ دن پیارا ہو نہ ہو۔ مانو کے لیے تو پیارا ہی تھا۔ ناشتہ کر کے اوپر پہنچی تو مما دعا کے ساتھ حسب معمول کچن میں مصروف تھیں۔ کاؤنٹر پر مختلف پیکٹس فریزر سے نکلے رکھے تھے۔ چکن، مٹن، بیف، وہ پیکٹ کھول کر الگ الگ پانی میں رکھ رہی تھیں۔

پھر وہی فرمائشی پروگرام؟ مانو پہلے پہل ہر چھٹی کے دن مما کی کچن میں مصروفیت دیکھ کر ان سے ہمیشہ یہی سوال کرتی تھی کہ آج کسی کی دعوت ہے کیا؟ مگر اب اسے اچھی طرح علم ہو چکا تھا کہ چھٹی کے دن کسی مہمان کی دعوت ہو نہ ہو۔ گھر والوں کی دعوت ضرور ہوتی ہے بڑے ابو اور چاروں لڑکے، سب کی الگ الگ فرمائشیں، مما کا تقریباً سارا دن ہی کچن میں گزر جاتا تھا۔

"کیا آپ سارا سارا دن گرمی میں چولہے کے آگے کھڑی رہتی ہیں؟" مانو ان سے ہمدردی کرتی۔

اسے بڑا ترس آتا تھا مما پر۔

"ارے نہیں بیٹا!" وہ ہنس پڑتیں۔ "گھر والوں کو اور بچوں کو ہم پکا کر نہیں دیں گے تو اور کون پکائے گا؟"

"بازار سے لے آئیں۔ اتنے مزے مزے کی چیزیں ملتی ہیں نہیں تو کوئی کک رکھ لیں۔ ایویں کھپتی ہیں پکا پکا کر۔" مانو کے مشورے ان کے لیے حاضر تھے۔

"اپنے پیاروں کے لیے پکانا، انہیں کھلانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ خوشی ملتی ہے۔ وہ مسکرا کر بولتے ہوئے اپنے کام میں بھی مگن رہتیں۔

"پتا نہیں کیا اچھا لگتا ہے گرمی میں پسینے پسینے ہو کر اتنے پکوان بنانا اور اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟" مانو حیران ہو کر سوچتی۔ "بڑے ابو اور زین بھائی کی تو چلو خیر ہے۔ وہ تو پھر بھی بہت ڈیسنٹ اور معقول ہیں مگر یہ طلحہ نامعقول، نخرے باز، کتنا کچھ ٹھونس لے اس کی بھوک ہی ختم نہیں ہوتی۔ مانو کے خیالات کا دھارا طلحہ کی طرف بڑھا تو اس نے برا سا منہ بنایا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ جب وہ کوئی بات سوچ رہی ہوتی۔ ایویں طلحہ بدتمیز کا خیال آ جاتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو یا مزے دار بریانی کھاتے کھاتے منہ میں نمک کا ڈلا آ گیا ہو۔

"ارے یہ کون ہے؟" کچن سے باہر لاؤنج میں کسی بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ مانو نے جھانک کر دیکھا۔ اس سے پہلے برتن دھوتی ہوئی دعا ہاتھ صاف کرتے ہوئے باہر لپکی تھی۔ جا کر اس نے گاڑی سے بچے کو نکالا اور گود میں لٹا کر اس کے منہ سے فیڈر لگا دی۔

"اوہ تو یہ دعا کا بیٹا ہے۔ مگر ہے کتنا کمزور!" مانو نے بچے کو غور سے دیکھا۔ بہت ہی دبلا پتلا، ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔

"بیمار رہتا ہے پہلے گھر پر چھوڑ آتی تھی۔ وہاں کون ہے دیکھ بھال کرنے والا۔ یونہی پڑا رہتا تھا۔

باپ مرد اد تو خود ہی نشئی ہے وہ کیا دیکھتا۔ بہنیں بھی بس ایسے ہی ہیں۔ ابھی خود ہی چھوٹی ہیں۔ اب بچے کو ساتھ لے آئی ہے۔ ساتھ ہی واپس لے جائی۔" ممانے حسب عادت اسے اپ ڈیٹ کیا۔

"کیا پکار ہی ہیں؟" مانو نے موضوع تبدیل کیا۔

"تہہ والی بریانی، نرگسی کوفتے، گاجر کا حلوہ اور وہ طلحہ کچھ بنائے گا یہ جو الا بلا تم بچے لوگ باہر سے کھا کر آتے زنگر یا شورما۔"

"ہیں......" مانو کی آنکھیں چمک اٹھیں دونوں ہی اس کے فیورٹ تھے مگر طلحہ کے ہاتھوں سے بنے ہوئے؟ توبہ توبہ اسے اگر مانو کے لیے بھی بنانا پڑا تو زہر ہی ملا دے شاید۔

"کیا ہوا۔ کیا سوچنے لگیں!" ممانے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بغور ملاحظہ کیا۔

"کچھ نہیں، !" مانو نے کش کی ہوئی گاجریں تھوڑی سی اٹھا کر منہ میں ڈالیں۔

"طلحہ جو بھی بنائے گا۔ تمہارا حصہ رکھ دوں گی میں کھالینا۔" ممانے مسکراہٹ دبائی ٹام اینڈ جیری کی جوڑی سے اچھی طرح واقف تھیں وہ۔

"بنا ہی نہ دے میرے لیے۔" مانو نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسے ہی چھیڑ خانی کرتا ہے تمہارے ساتھ، دل کا برا نہیں ہے۔" انہوں نے اپنے بیٹے کی صفائی پیش کی۔ "دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ آپ کو کیا پتا اس کے دل کا حال؟" مانو کسی صورت اسے اچھا سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

"چکن ریڈی ہے؟" طلحہ دور سے ہی پوچھتا ہوا کچن میں داخل ہوا۔

"اوہو، روز کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔" کاؤنٹر کی جانب جاتے ہوئے اس نے حسب عادت فقرہ اچھالا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے میرے آنے سے۔"

"مجھے تو کوئی تکلیف نہیں، اللہ رکھے میری مما کا لنگر خانہ سلامت رہے۔ روز ہی آباد رہتا ہے۔" وہ چکن کا معائنہ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ مانو کو بھی سلگا رہا تھا۔

"دیکھ رہی ہیں آپ اس بندر کو، روزانہ کھانے کے طعنے دیتا رہتا ہے مجھے۔" مانو نے مما کی چھتری تلے پناہ لی۔

"صرف روز نہیں۔ روزانہ تینوں ٹائم۔" مما کے کچھ کہنے سے پہلے ہی طلحہ کی زبان پھر چلی۔

"طلحہ! بس کرو، ہر وقت کا بولنا اچھا نہیں لگتا۔" ممانے تنبیہی نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

"اس بلی کی میاؤں میاؤں نہیں سنائی دیتی آپ کو؟ بس میرا ہی بولنا نظر آتا ہے۔"

"میں بلی ہوں؟" مانو نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا اور غرائی۔

"نہیں خیر، بلی تو اچھی خاصی کیوٹ اور معصوم سی ہوتی ہے لیکن اگر میں نے اس جانور کا نام لیا جو سچ مچ تمہاری پرسنالٹی سے میچ کرتا ہے تو مما سے ڈانٹ بہت پڑے گی۔ آج کی دنیا میں سچ کون برداشت کرتا ہے؟" طلحہ جتنے آرام سے چکن کی بوٹیاں الگ الگ کر رہا تھا۔ اتنے ہی سکون سے بول بھی رہا تھا۔

"طلحہ......!" مما کی آواز پھر بلند ہوئی۔

"کبھی اس باگڑ بلی کو بھی آواز لگا لیا کریں۔ مانو، کبھی تو کسی کی مانو۔"

"اچھا بس خاموش ہو کر کام کرو اپنا۔" مانو کے کچھ کہنے سے پہلے ممانے کہا۔

"آلتو فالتو لوگوں کے لیے کچھ نہیں بناؤں گا۔" طلحہ باز نہ آیا۔

"کون مرا جا رہا ہے بدذائقہ اور سڑے بسے کھانوں کے لیے؟" مانو کے صبر کی حد کب سے ہو چکی تھی۔

"یہ تو کھانے والے بتائیں گے۔ کتنے مزے دار، چٹپٹے، زنگر برگر، چکن روسٹ، ساتھ میں فنگر فرائز، اسپیشل کیچپ، واہ واہ، میں تو سوچ رہا ہوں۔

بڑے ہو کر اپنا ایک ڈھابہ ہی کھول لوں۔ شیف طلحہ۔"
طلحہ آنکھیں بند کیے بول رہا تھا۔ آواز اور خوابوں کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔
"ہونہہ شیف طلحہ، پھٹیچر شیف اور اس سے بھی پھٹیچر پکوان۔"
مانو کے تو سر پر لگی تلوؤں پر بجھی، کچن سے احتجاجاً واک آؤٹ کیا اور لاؤنج میں آ گئی۔ موبائل نیچے ہی چھوڑ آئی تھی۔ اب دل میں کھد بد ہو رہی تھی سہیلیوں کے پیغامات آئے ہوئے ہوں گے۔ سب کی نت نئی ایکٹیویٹیز کے اسٹیٹس لگے ہوئے ہوں گے۔ میرے پاس تو کچھ ہے بھی نہیں اسٹیٹس پر لگانے کے لیے۔
"اگر یہ مسٹر خوامخواہ اپنا کارنامہ جلدی انجام دے لے تو اس کی پکس اپ لوڈ کروں۔" حسب عادت وہ سوچتے اور پھرتے پھراتے چھوٹے سے صحن میں آ گئی۔ جہاں واشنگ مشین میں کپڑے گھوم رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مانو وہیں کھڑے ہو کر حیرت اور دلچسپی سے دعا کو دیکھنے لگی۔ کتنی کمزور اور چھوٹی سی لگتی ہے اور کام کتنا کرتی ہے۔
"مجبوری ہے بے چاری کی، کام نہ کرے تو کھائے کہاں سے؟" مما کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ غیر شعوری طور پر دعا کا جائزہ لیتے لیتے اسے اچانک کچھ احساس ہوا۔
"بات سنو۔ تم نے سوئٹر نہیں پہنا؟ اور کپڑے بھی لان کے ہیں۔ سردی نہیں لگتی۔" مانو نے اسے مخاطب کیا۔ جو مشین بند کر کے کپڑے نکال رہی تھی۔
"جی......وہ"
"اچھا ایک منٹ ٹھہرو، میرے پاس پچھلے سال کے گرم کپڑے ہیں کچھ اور سوئٹر وغیرہ بھی۔" "میں لے آتی ہوں۔" مانو کے دماغ میں ایک اور نادر خیال آیا اور دعا کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ فٹافٹ سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آئی۔ جلدی جلدی الماری سے کچھ گرم ملبوسات نکالے جنہیں وہ ریجیکٹ کر چکی تھی اور بڑے اسٹائل سے انہیں بیڈ پر سجا کر تصویر لینے لگی۔ پھر سب کو ہنگر میں لگا کر تصاویر لیں۔
"یہ کیا ہو رہا ہے؟" امی کمرے میں داخل ہوئیں۔
"پکس لے رہی ہوں امی! دعا کو دوں گی یہ سب، بے چاری کے پاس ایسے کپڑے نہیں نا۔" مانو نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔
"اور یہ موبائل اور تصویریں، یہ ضروری ہیں۔ اسٹیٹس پر ڈالو گی ضرور، یہ چھچھورپن دکھانا تو فرض ہے۔" حسب عادت اور حسب توقع امی چراغ پا ہو کر اپنے انداز میں بیٹی کی خبر لے رہی تھیں۔
"یہ تو نیکی کا کام ہے امی! دوسرے لوگ دیکھیں گے تو وہ بھی موٹیویٹ ہوں گے۔" مانو نے امی کو قائل کرنے کی کوشش کی اور یہی غضب کیا۔
"نیکی؟ اپنی ریجیکٹڈ چیزیں کسی کو دے کر بہت بڑی نیکی کر لی اپنے دل سے اتری ہوئی چیزیں جو خود استعمال نہیں کرتیں وہ دوسرے کو دے کر بہت ثواب کما لیا۔ اوپر سے اس کی تشہیر نیکی کا ثواب تو ملے گا ہی، دکھاوے کا اس سے زیادہ ملے گا۔" امی کا طنزیہ لب ولہجہ ایک منٹ میں مانو کی طبیعت صاف کر گیا۔
"امی!" وہ منمنائی۔
"ڈیلیٹ کرو ساری تصویریں اور خبردار جو اسٹیٹس پر یہ سب خرافات لگائیں۔ نادر شاہی حکم جاری کرتے ہوئے امی کمرے سے باہر نکل گئیں۔
"اف، امی تو ایک منٹ میں بے عزتی خراب کر دیتی ہیں۔" مانو نے اپنی رکی ہوئی سانس خارج کی۔ موبائل آف کیا اور کپڑے شاپر میں ڈالنے لگی۔

☆☆☆

جیٹھانی صاحبہ کینو چھیل چھیل کر رکھ رہی تھیں۔ جب آدھے درجن چھیل لیے پھر دونوں دیورانی جیٹھانی نے کھانے شروع کیے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری تھیں۔
"جمیلہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پریشان ہے۔ رشتہ ڈھونڈ رہی تھی۔ کسی نے ایک رنڈوے کا

رشتہ بتایا ہے۔ بیوی فوت ہوگئی ہے۔ چار بچے ہیں۔ چالیس سے اوپر کا ہے۔" جیٹھانی نے ساری معلومات دیورانی کے گوش گزار کی۔

"اے ہائے۔ یہ کیا کر رہی ہے جمیلہ، اس کی بچی ہے ہی کتنی بڑی۔ ارے اپنی مانو کے ساتھ کی ہے۔ ایک تو چھوٹی عمر میں شادی کردی۔ اب وہ بیوہ ہوگئی تو بے چاری کا کیا قصور؟ ایسی بے جوڑ شادی کر کے اسے کیوں جہنم میں دھکیل رہی ہے۔" امی نے پھانک میں نمک لگایا۔

"میں نے بھی یہی کہا تھا کہ دیکھ بھال کے کرنا دوسری شادی، ایسی جلدی کیا ہے۔ مگر وہ تو وہی باتیں کرنے لگی کہ آگے تین بیٹیاں اور ہیں ان کی بھی کرنی ہیں۔ ان سے زیادہ اب دعا کی فکر لگی رہتی ہے۔"

"اللہ نصیب اچھے کرے۔ بے چاری بچی کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔" امی نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"اور آپ سنائیں کب جا رہی ہیں بڑی آپا کے گھر؟"

"بس اگلے ہفتے جائیں گے۔ ابھی تو منہ میٹھا کرآتے ہیں پھر ایک دو ہفتے بعد کچھ کرلیں منگنی یا نکاح۔ سب سے صلاح مشورے سے جو بھی ڈیسائڈ ہو۔ جیٹھانی صاحبہ نے کھٹی میٹھی پھانک چاٹ مسالہ لگا کر منہ میں رکھی۔

"مانو تو کب سے اودھم مچا رہی ہے نئے کپڑے بنانے کے لیے۔ میں نے کہا پہلے کچھ طے تو ہوجائے پھر کرلینا شاپنگ۔" امی مسکرائیں۔

"مانو کا جوڑا تو میں دلاؤں گی۔ تم اس کی فکر چھوڑو اور ایک بات اور کہنی تھی۔ جیٹھانی کا لہجہ ذرا راز دارانہ تھا۔

"ہاں کہو؟"

"وہ بات یہ ہے کہ زین کا رشتہ تو بڑی آپا کے گھر ہوجائے گا۔ زبانی کلامی بات تو کب سے ہوگئی تھی۔ اب ان شاء اللہ باقاعدہ رشتہ بھی طے ہوجائے گا۔" جیٹھانی صاحبہ نے تمہید باندھنے کے بعد ذرا سانس لی پھر آگے بڑھیں۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اب زین کے بعد طلحہ اور مانو کی بھی بات کرلوں، بھائی صاحب کو تو ویسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟"

"میری اور آپ کے بھائی صاحب" کی خیر ہے۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ آپ سے بڑھ کر ہماری بیٹی کا قدر دان کون ہوگا؟ نہ کوئی اور اتنی محبت چاہت سے رکھے گا اسے۔ پھر طلحہ بھی ہمارے سامنے کا بچہ ہے دیکھا بھالا۔ مسئلہ ہمارا آپ کا نہیں ہے مگر پہلے آپ ان دونوں سے تو پوچھ لیں۔ ہر وقت تو ایک دوسرے سے چونچیں لڑاتے رہتے ہیں ایک ذرا سی بات برداشت نہیں کرتے ایک دوسرے کی۔ بعد میں بھی یہی حال رہا تو......"

"ارے نہیں، زہرہ یہ دونوں کون سے سچ مچ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں؟ یہ کھٹ پھٹ تو بس ایک بہانا ہے۔ ان لڑائیوں کے پیچھے اصل میں تو محبت ہے دونوں کی۔" جیٹھانی صاحبہ کے انکشاف پر دیورانی صاحبہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

"طلحہ کا تو خیر کچھ کہہ نہیں سکتی مگر اپنی بیٹی کو جانتی ہوں اچھی طرح، اس کا تو بس نہیں چلتا طلحہ کا بھرتہ بنادے۔"

"آگے چل کے بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ دل کی بہت اچھی ہے مانو۔" جیٹھانی کے لہجے میں مانو کے لیے محبت گھلی ہوئی تھی۔

"پھر بھی میرا خیال ہے ابھی یہ بات کرنے کے لیے موزوں وقت نہیں ہے۔ مانو نے ابھی انٹر کیا ہے۔ کم از کم گریجویشن کرلے۔ پھر بات کر لیجیے گا۔ ہم بھی یہیں ہیں آپ بھی یہیں۔ بچوں کو ذرا عقل شعور تو آنے دیں۔"

"مگر میں نے تو طلحہ سے بات بھی کرلی۔ وہ تو پکا پکا راضی ہے۔" جیٹھانی صاحبہ نے مسکی سامنہ بنا کر انکشاف کیا۔

"افوہ، آپ کو بھی ہر بات کی بہت جلدی رہتی ہے۔ مگر خیر، اب مانو کے سامنے یہ ذکر بالکل نہ چھیڑیے گا۔ نہ اسے کچھ بتایئے گا۔ ابھی زین کی خوشی

کریں پھر کسی مناسب وقت پر میں خود پوچھ لوں گی مانو سے۔" دیورانی صاحبہ نے انہیں سمجھایا۔

"چلیں، آپ کہتی ہیں تو میں ابھی کچھ نہیں کہتی۔ چپ لگا جاتی ہوں۔ طلحہ کو بھی سمجھا دوں گی۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے مانو سے۔" جیٹھانی صاحبہ نے اس بار ذرا عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور مزید کینو چھیلنے لگیں۔

☆☆☆

لوگ زیادہ نہیں تھے۔ بس گھر گھر والے ہی تھے۔ زین کی خالہ کی فیملی تھی۔ یعنی خالہ خالو اور ان کے چار بچے بمعہ دلہن اور ایک عدد دادی، ادھر سے زین کی امی اور ابو، تینوں بھائی اور مانو اپنے امی ابو اور دونوں بھائیوں کے ساتھ۔

الوینہ گلابی شیفون کا بہت خوب صورت سا جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ نازک سی سی جیولری اور ہلکا پھلکا سا میک اپ، وہ سادگی میں اتنی پیاری تھی۔ "اب ذرا سی تیاری میں غضب ڈھا رہی تھی۔

"اللہ الوینہ باجی، کتنی پیاری ہیں آپ، ماشاء اللہ۔" مانو نے محویت سے اس کا چہرہ تکتے کرتے بے اختیار تعریف کی۔

"تم بھی بہت کیوٹ ہو۔" الوینہ نے مسکرا کر اس کا رخسار چھوا۔

زین اور الوینہ دونوں کا منہ میٹھا کیا گیا اور سارے مہمانوں کا بھی پھر آپس میں بات چیت کے بعد اتفاق رائے سے طے کیا گیا کہ ایک ماہ بعد نکاح کی تقریب ہوگی اور ٹھیک ایک سال بعد شادی یعنی کہ رخصتی۔ مانو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نکاح وہ بھی زین بھائی کا، یعنی کہ زین بھائی کی خوشی، مسرت، شادمانی، سارے احساسات چمک اور پھول بن کر چہرے پہ اترے ہوئے تھے۔

"نکاح کسی کا ہو رہا ہے۔ خوش کوئی ہو رہا ہے۔ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ؟ طلحہ کو بالآخر واپسی پر فقرہ اچھالنے کا موقع مل ہی گیا۔

"نہ ہم بیگانے ہیں نہ عبداللہ دیوانے۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کی خوشی، اپنی خوشی سے بڑھ کر ہوتی ہے۔" خلاف توقع مانو نے سوا سیر یا ٹکڑا توڑ قسم کا جواب دینے کے بجائے خاصا لہک لہک کر جواب دیا تھا۔ طلحہ تو مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"تم ...... تم مانو بلی ہی ہو یا اس کی بھٹکی ہوئی روح؟ بھوت تو نہیں ہو کوئی؟" طلحہ نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔

"کاش کہ ہوتی کوئی بدروح کوئی چڑیل، سب سے پہلے تمہارے وجود سے اس دنیا کو پاک کرتی۔" مانو نے فوراً ہی اپنے اصلی روپ میں آ کر اس کی طبیعت صاف کی۔

"اوہ تم ہی ہو۔ مانو، کسی کا کہنا نہ مانو۔" طلحہ نے بچپن کی چڑ، ایک بار پھر دہرائی۔ جسے وہ گاہے گاہے دہراتا رہتا تھا۔

"اچھا تم کیا ہو شیف؟ جو اپنے بنائے کھانے خود بھی نہیں کھاتا، نہ مزا، نہ سرور نہ کیف؟"

"اوہو شاعری پہ اتر آئیں۔ اللہ خیر کرے۔ شاعری کے جراثیم ان ہی لوگوں کو لگتے ہیں جنہیں وہ "والا" بھوت چمٹ جائے۔"

"کون سا والا بھوت؟" مانو نے گھور کر اسے دیکھا۔ بات اگر سمجھ میں آجاتی تو کچا چبا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھتی۔

"ہے ایک بھوت، اکثر خوب صورت لڑکیوں پر آجاتا ہے اور وہ لڑکیاں پھر مجھ سے ہینڈسم اور کول قسم کے لڑکوں کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ اسے عشق کا بھوت کہتے ہیں۔" طلحہ نے ایک ادا سے اپنے نئے ہیر اسٹائل پر ہاتھ پھیرا۔

"مطلب؟ مجھ پر عشق کا بھوت آگیا ہے؟" مانو نے اس کی ساری بکواس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے خود کلامی کی۔

"آج کل تو لوگوں کے فیس بک اسٹیٹس پر بھی رومانٹک شاعری ہے۔" طلحہ نے ان ڈائریکٹ پھر ہٹ کیا اسے۔

”ویسے تمہاری زبان بھی پناہ مانگتی ہو گی کہ کس شخص کے منہ میں آ گئی کبھی سکون کا سانس نہیں لینے دیتا۔“ مانو نے بڑے آرام اور سکون سے جوابی وار کیا تھا۔

”زبان وبان کی پروا کسے ہے۔ ہم تو بس اپنے دل کی پروا کرتے ہیں۔ وہ کیا کہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے۔“ طلحہ نے اس بار اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔

”ہوں۔ پہلے تو کچھ شک تھا مگر اب تو مکمل یقین ہو گیا ہے۔“ مانو نے اپنی کنپٹی سے ذرا فاصلے پر مخصوص انداز میں انگلی گھمائی۔ جس کا مطلب تھا۔ ”پاگل“

”ہائے، یہ دنیا دل والوں کو پاگل ہی کہتی آئی ہے ہمیشہ سے۔“ طلحہ نے بڑی سرد آہ بھری تھی۔

”پکے لوفر لگ رہے ہو“ مانو نے ناک سکیڑی۔

”لوفر؟ ارے لڑکیاں مرتی ہیں اس انداز پر خوب صورت اور حسین لڑکیاں، تمہارے جیسی الو ہیں لڑکی کیا جانے یہ سب جسے خوب صورتی چھو کے نہیں گزری اور حسن جس کے قریب نہیں آیا۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ دماغ کے ساتھ ساتھ تمہاری آنکھیں بھی نہایت ہی کمزور ہیں۔ غور سے دیکھو تو مجھے پتا چلے، مما تو کہتی ہیں کہ میرے جیسی حسین لڑکیاں بہت ہی کم ہوتی ہیں۔“

مانو نے اتراتے ہوئے خود اسے دعوت دی کہ آ بیل مجھے مار، اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ بے نتھا بیل ٹکریں نہ مارتا؟

”بچپن سے ہی دیکھ رہا ہوں غور سے، آج تک کوئی حسین شے نظر نہیں آئی تمہارے اندر، آنکھیں دیکھو تو اتنی بڑی بڑی کہ بے چاری بھینس بھی شرما جائے۔ ناک کچھ عجیب سی، پتا ہی نہیں چلتا۔ کہاں سے شروع ہے کہاں ختم، ہونٹ تو بس، اللہ معاف کرے، اگر رنگ ذرا اور دبتا ہوا ہوتا تو افریقہ والے آ کر خود لے جاتے کہ یہ تو ہماری بچھڑی ہوئی بچی ہے۔ اور قد دیکھو اب ہر بندے کے پاس تو سیڑھی نہیں ہوتی نا کہ وہ لگا کے تمہارے ”لیول“ تک پہنچے۔ آواز ماشاء اللہ ایسی کہ بس لوگ مروت کے مارے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونستے، اگرچہ دل ان کا یہی چاہتا ہے اب آگے اور کیا کہوں۔ اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ہو، زیادہ کچھ کہا تو اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔“

نان اسٹاپ بولتے ہوئے طلحہ نے بالآخر بریک لگا ہی لیا۔ اور آنکھیں پھاڑ کر سنتی ہوئی مانو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی شان میں بیان کیا گیا ہے۔ مما اور زین بھائی نے تو پکا یقین دلایا ہوا تھا کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ خوب صورت بس ایک دو ہی ہیں۔ بڑے ابو اور پاپا بھی کچھ اس سے ملتی جلتی بات کبھی کہہ دیتے تھے۔ جب وہ بار بار اپنے متعلق ان سے رائے لیتی تھی۔ رہیں امی جان تو انہیں ڈانٹنے ڈپٹنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ بیٹی کے حسن کا جائزہ لے کر اس کے قصیدے پڑھتیں۔

”ویسے بال اچھے ہیں تمہارے، بالکل میری طرح ہیں۔ سلکی اور چمک دار بس مجھ سے ایک دو فٹ لمبے ہیں ذرا۔“ طلحہ کو بالآخر اس میں ایک خوبی یا خوب صورتی نظر آ ہی گئی۔

”تم جل ککڑے لگ رہے ہو، خود کو کبھی دیکھا ہے آئینے میں، الو جیسی آنکھیں، گھوڑے کی طرح منہ، مینڈک کی پرسنالٹی بھی تم سے لاکھ درجے اچھی ہے۔“

مانو کا غصہ اتنا شدید تھا کہ بس وہ بے طرح برس ہی پڑی جو منہ میں آیا بول دیا۔ مگر اس کم بخت غصے میں قباحت یہ تھی کہ الفاظ کم تھے اور جذبات زیادہ تھے۔ طلحہ کی طرح ٹکا ٹکا کے مارنے والے جملے اس دماغ میں آ ہی نہیں رہے تھے۔ بس غصہ تھا جس سے دماغ آتش فشاں بنا کھول رہا تھا اور اس کے شعلے اب اس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

”دیکھ لوں گی تمہیں چمگادڑ کہیں کے۔“ دانت پیس کر وارننگ دی گئی پھر وہاں سے واک آؤٹ۔

”مگر چمگادڑ میں بھلا کیا خرابی ہے سوائے الٹا

لٹکنے کے؟'' طلحہ حیران ہو کر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

آج تو ساری ٹیچرز نے جیسے ایکا کر لیا تھا کہ سب کی سب آئیں گی اور پیریڈز بھی لیں گی۔ ایک کے بعد ایک مستقل ڈھیر سارے لیکچرز سن سن کر دماغ سن ہونے لگا تھا۔

کینٹین سے رول، سموسے، برگر، جوس اور سافٹ ڈرنک، لے کر ساری کی ساری ایک جگہ جتھا بنا کر بیٹھ گئیں۔ ایک تو بھوک کے بارے دم نکل رہا تھا۔ لہٰذا پیٹ پوجا کر کے پہلے سانسیں بحال کی گئیں اور جب پیٹ بھرنے کے بعد آنکھوں میں ذرا روشنی آئی تو سب کی زبانیں کترنی کی طرح چل پڑیں۔ ویسے تو سب ہی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تھا مگر الشبہ کا ٹاپک تو ایسا تھا کہ سب کی توجہ ہی اس کی طرف تھی۔ ان کے گروپ کی پہلی لڑکی جس کی منگنی ہو گئی تھی۔ بڑے فخر سے وہ موبائل پر تصویریں دکھا رہی تھی۔ ساری کی ساری سر جوڑ کر دیکھنے میں محو تھیں۔ سب کی نگاہوں میں رشک تھا۔ ایک تو منگنی اوپر سے منگیتر اتنا ہینڈسم۔

الشبہ! تیرا فیانسی جی بھر کے ہینڈسم ہے۔'' ماہی نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''میں خوب صورت نہیں ہوں کیا؟'' الشبہ نے اک ادا سے سوال کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی اچھی خاصی خوب صورت تھی۔

''بہت پیاری جوڑی ہے تمہاری۔'' لائبہ نے توازن برقرار کر کے سراہا۔

''خاندان میں تو سب مارے حسد کے جلے مرے جا رہے ہیں۔ سارے کزنز میں سب سے ویل آف اور کول ہیں فراز، اب یہ تو بھئی نصیب کی بات ہے۔ فراز جیسے لڑکے کہاں ملتے ہیں؟'' الشبہ نے اترانے کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے منگنی کی انگوٹھی والا ہاتھ لہرایا اور اس کی یہی اتراہٹ مانو سے ہضم نہیں ہوئی۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں کہ ایسے لڑکے کہیں اور نہیں پائے جاتے ہمارے زین بھائی اتنے چارمنگ ہیں فواد خان بھی ان کے آگے پانی بھرتا ہے۔''

مانو نے فخر سے بولتے ہوئے اپنے موبائل میں زین بھائی کی تصویر دکھائی۔ منہ میٹھا کرنے کی تقریب کی تازہ ترین تصویر، اس دن تو وہ خوش بھی بہت تھے۔ مسرت کی چمک چہرے پر لیے مسکراتی ہوئی تصویر، سچ مچ بہت ہی متاثر کن تھی۔

''ہائے اللہ، تم لوگوں کے خاندان میں کیسے اسمارٹ اور ہینڈسم کزنز ہیں۔ ایک ہمارے والے ہیں کالے پیلے، ٹیڑھے میڑھے سے۔'' شازیہ نے حسرت سے کہتے ہوئے مانو اور الشبہ دونوں کو ہی مخاطب کیا تھا۔

''ہاں کزنز تو خیر ہر خاندان میں ہوتے ہیں۔ کوئی پرنس چارمنگ کوئی ایوریج، میں تو فیانسی کی بات کر رہی تھی۔ ہینڈسم کزن اور ہینڈسم فیانسی، دو الگ الگ باتیں ہیں۔'' الشبہ نے نخوت سے کہتے ہوئے ڈائریکٹ مانو پہ حملہ کیا تھا۔ جو مانو کی برداشت سے باہر تھا۔

''جی نہیں، یہ صرف میرے کزن نہیں ہیں بلکہ ہماری انگیج مینٹ ہونے والی ہے۔ مانو نے ہمیشہ کی طرح اپنی عادت کے مطابق جھٹ سے جھوٹ بول دیا۔ اس وقت الشبہ کے سامنے اپنی سبکی اسے کسی بھی طرح منظور نہیں تھی۔

''انگیج منٹ؟ مگر تم نے کبھی بتایا تو نہیں؟''

''اور تم تو انہیں بھائی کہہ رہی تھیں۔''

''کتنی چھپی رستم ہو تم، کبھی اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔''

ساری کی ساری اپنی اپنی بولیاں بول کر مانو کے پیچھے پڑ گئیں۔

''بس ہونے ہی والی ہے انگیج منٹ، جب ہو جاتی تو بتا دیتی پہلے سے پہلے ڈھنڈورا پیٹنا اچھا نہیں لگتا اور رہی بات بھائی کہنے کی تو بچپن کی عادت ہے۔ چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹے گی۔'' مانو نے

بہت آسانی سے بات کی وضاحت کردی تھی۔

''ہائے مانو! کتنی لکی ہو تم، تمہارے زین بھائی تو بہت ہی ہینڈسم ہیں سب سے زیادہ اوسم،'' سدا کی پرجوش کومل نے نادانستگی اور اپنی سادگی میں بارود کو فیتہ دکھادیا تھا۔ اوپر سے مانو کی فاتحانہ اور فخریہ مسکراہٹ، الشبہ تو بس بھڑک ہی اٹھی مگر ظاہر نہیں کیا۔

''خالی خولی بولنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں فرینڈز کے درمیان بیٹھ کر میں کچھ بھی لمبی لمبی چھوڑ سکتی ہوں۔ کسی کو کیا معلوم اصل حقیقت کیا ہے۔'' الشبہ نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ مانو پر وار کیا۔

''کیا مطلب ہے؟ میں کیا جھوٹ بول رہی ہو۔ لمبی لمبی چھوڑ رہی ہو؟'' مانو کو تاؤ آ گیا۔

''جب ہم دونوں کی طرف سے تم سب کو ٹریٹ ملے گی نا تو خود ہی پتا چل جائے گا۔'' مانو نے مزید اعلان کیا۔

''دیکھتے ہیں۔ کب ملتی ہے ٹریٹ۔'' الشبہ کی مسکراہٹ تضحیک آمیز تھی۔

''بہت جلد ملے گی۔ کھانے والوں کا منہ کھلے گا اور بولنے والوں کا بند ہو جائے گا۔'' مانو نے ایسا ٹکڑا توڑ جواب دیا تھا کہ کم از کم اس وقت تو الشبہ کا منہ بند ہی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

امی جان خواتین ڈائجسٹ میں مگن تھیں۔ ابو جان ٹی وی پر سیاست اور سیاست دانوں کا زبانی دنگل دیکھنے میں محو تھے۔ نیچے کی صورت حال تو مکمل طور پر انڈر کنٹرول تھی۔ دبے پاؤں اوپر پہنچی تو بڑی مما اور بڑے ابو ڈاکٹر کے جا رہے تھے۔ مسٹر خوامخواہ کرکٹ میچ کھیلنے گراؤنڈ گیا ہوا تھا۔ حسان اور حسام کی خیر تھی۔ ویسے تو دونوں کے دونوں موبائل پر گیم کھیلنے میں غرق تھے۔ نہ بھی ہوتے تو دونوں بڑے بیبا بچے تھے۔ کم از کم طلحہ کے مقابلے میں تو انتہائی سیدھے اور شریف تھے۔ یہ خیالات مانو کے تھے جن سے طلحہ کا متفق ہونا ہرگز ہرگز ضروری نہیں تھا۔ مگر بہر حال حالات بالکل سازگار تھے۔ اس کی مہم کے لیے بالکل موزوں، جسے سر انجام دینے وہ جا رہی تھی۔ اسے با آواز بلند ڈانٹ پھٹکار کی توقع تھی اور اس عظیم موقع پر گھر کے اہم افراد تک یہ آواز ہرگز نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔ اور جب اپنی ساری مشکلات، مسئلہ اور درخواست اس نے زین بھائی کے گوش گزار کیں تو سچ مچ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور آواز غصے وصدمے سے۔

''اگرچہ تمہارے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین کر لینا چاہیے کہ تم نے یہ احمقانہ حرکت کی ہوگی مگر پھر بھی...... پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم نے سچ مچ اپنی سہیلیوں ے سامنے ایسی بے وقوفانہ باتیں کی ہیں؟'' زین بھائی۔ انتہائی متحمل بردبار اور بہت ہی نرم طبیعت کے انسان آج سے پہلے اتنی بلند آواز میں مانو پر کبھی نہیں چیخے تھے۔

''آہستہ ڈانٹیں زین بھائی! نیچے اگر امی تک آواز پہنچ گئی تو میری خیر نہیں ہے۔'' مانو آہستہ سے منمنائی۔

''چچی جان کا اتنا خوف ہے تمہیں، پھر بھی احمقوں کی لیڈر بنی پھرتی ہو۔ یہ ڈر بھی اگر نہ ہوتا تو کیا سے کیا کر لیتیں؟ کس قسم کے کارنامے انجام دیتیں؟ میں تو سوچ کر ہی لرز جاتا۔'' زین نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

''زین بھائی پلیز، آخری بار ہیلپ کر دیں پرامس، آئندہ اس طرح کی غلطیاں بالکل بھی نہیں کروں گی۔'' مانو نے اپنے لہجے میں اور اپنے چہرے پر اتنی ہی مسکینیت اور بے چارگی اکٹھی کی جتنی کہ کر سکتی تھی۔

''پھر؟ کیسی غلطیاں کرو گی آئندہ؟ اس سے بھی زیادہ سنگین اور احمقانہ؟'' زین بھائی طنز کرنے کے بالکل بھی عادی نہیں تھے مگر مانو نے بات ہی ایسی کی تھی کہ ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ساتھ طنز نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟

"بے وقوفیوں کی بھی حد ہوتی ہے مگر تمہارے لیے اس لفظ کے کوئی معنی نہیں، بلکہ کسی بھی لفظ کے کوئی معنی نہیں۔ اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے تم نے کہہ دی۔" زین کے وجیہہ چہرے پر انتہائی خفگی اور برہمی تھی۔

"زین بھائی پلیز آپ کو نہیں معلوم میری فرینڈز کتنی بدتمیز ہیں۔ وہ تو اتنا مذاق بنائیں گی میرا اور الشبہ کو تو آپ جانتے ہی نہیں، وہ تو اتنا مذاق اڑائے گی میرا، آپ کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔ پورے کالج میں ذلیل کر کے رکھ دے گی مجھے۔"

مانو نے منت سماجت کے بعد اپنا آخری حربہ آزمایا یعنی روہانسی ہوگئی۔ آواز حلق میں پھنسنے لگی اور آنسو آنکھوں میں بھرنے لگے تو اس کی ضد پوری ہونے کے امکانات بہت روشن اور پکے ہوجاتے تھے۔

"اور تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کہ تمہارا ساتھ دینے کے بعد اگر کسی کو ذرا سی بھنک بھی پڑ گئی تو میری کتنی بے عزتی اور ذلت ہوگی۔"

آج تو زین نہ اس کی گلوگیر آواز سے پریشان ہوئے اور نہ ہی آنکھوں تیرتے آنسوؤں کو وہ کوئی اہمیت دے رہے تھے۔

"خالہ کا گھر اب محض خالہ کا گھر نہیں ہے۔ ہونے والی سسرال بھی ہے۔ وہاں کسی کو پتہ چل جائے کہ میں تمہارا لاحول ولا قوۃ۔" زین ایک لمحے کو رکے وہ تو اس بات کو زبان پر لاتے ہوئے بھی جھجک رہے تھے۔ جسے مانو نے بڑے آرام سے لڈو بنا کر حلق سے نیچے اتار لیا تھا۔

"کہ میں تمہارا فیانسی بن کر تمہاری احمق دوستوں کو ٹریٹ دے رہا ہوں۔ ذرا سوچو کیا عزت رہ جائے گی میری وہاں پر۔ اور میری یونی میں کسی کو علم ہوا میری اس طرح کی حرکت کا۔ جہاں میں ٹیچر ہوں تو؟ اپنے اسٹوڈنٹس کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا جنہیں رات دن اخلاقیات کے لیکچرز دیتا رہتا ہوں۔" زین بھائی نے اسے بھی لیکچر دے ڈالا۔

"اول تو کسی کو پتا نہیں چلے گا اور اگر پتا چل بھی جائے تو میں سب کو اصل حقیقت بتا دوں گی۔" مانو نے جھٹ اپنی دانست میں تسلی بخش جواب دے کر زین بھائی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"زندگی کو اس کے معاملات کو کھیل تماشا مت سمجھو مانو ہر بات مذاق ہوتی ہے نہ کھیل۔" زین محض کراہ کر رہ گئے۔

"جب سے آپ ٹیچر بنے ہیں۔ بہت ہی سیریس ہوگئے ہیں۔ اتنی مشکل مشکل باتیں کرنے لگے ہیں۔ جو سر کے اوپر سے ہی فلائی کر جاتی ہیں۔ پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔" مانو کا لہجہ شکایتی ہوا۔

"وقت کے ساتھ ساتھ انسان سیکھتا ہے عمر کے ساتھ ساتھ خود کو بدلتا ہے یا بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم بھی اب بڑی ہو جاؤ۔ لائف کو ذرا سیریس لو۔"

"اچھا آئندہ بالکل سیریس رہوں گی کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہیں کروں گی۔ پکا وعدہ۔ لیکن پلیز اس بار تو ہیلپ کر دیں نا میری۔ بے شک بس پانچ منٹ کے لیے آجائیں۔ سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔" مانو نے اپنی منت اور التجا کو مزید رقت آمیز کیا۔

"میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا آخر میرا نام لینے کی ضرورت کیا تھی تمہیں؟ تم طلحہ کا نام بھی لے سکتی تھیں۔ اسے بنا لیتیں فیانسی، ویسے بھی کل کو وہی اس عہدے پر فائز ہوگا۔"

اس کی مستقل منت سماجت پر زین بھائی جھنجلا اٹھے اور اس جھنجلاہٹ میں وہ اہم راز فاش کر گئے۔ جسے اس نیک بی بی نے ٹھیک سے سنا بھی نہیں وہ تو ابتدا میں ہی بدک گئی طلحہ کا نام سن کر۔

"اس باگڑ بلے کو اپنا فیانسی بنا لیتی؟ آپ سے زیادہ تو ہینڈسم نہیں ہے بلکہ آپ سے زیادہ کیا۔ وہ تو کسی لنگور اور گینڈے سے بھی زیادہ چارمنگ نہیں ہے۔ میری فرینڈز تو ریکارڈ لگا لیتیں میرا۔ اور بالفرض۔ بالفرض میں اس کا نام لے بھی دیتی تو کیا وہ میری ہیلپ کرتا؟ الٹا امی سے پٹوا ہی دیتا مجھے اور

باقیوں سے ڈانٹ پڑوانا تا زبردست قسم کی۔" مانو نے منہ بنا کر متوقع صورتحال اور حالات کا نقشہ کھینچا۔

"بات سنو لڑکی، اول تو وہ کسی لنگور اور گینڈے کے بجائے مجھ میں زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا تمہاری کسی سہیلی کو بالکل بھی جرأت نہیں ہوتی تمہارا ریکارڈ لگانے کی۔ اور دوسری بات یہ کہ تم نے پہلے میری بات غور سے نہیں سنی۔ اب سنو اور دونوں کان کھول کر سنو، مستقبل میں اس باگڑ بلے کو ہی تمہارا فیانسی بننا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ وہ کسی کو بتائے بغیر یا تمہاری شکایت لگائے بغیر تمہاری ہیلپ کر ہی دیتا۔" زین بھائی کا لہجہ اب بھی سخت تھا مگر مانو کو تو ان کے الفاظ نے شاکڈ کر دیا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ بیل اور میں؟" مانو کی شکل پر بارہ ہی نہیں بجے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ سب بج کر گھڑی خالی ہوگئی ہو۔

"بڑوں میں بات ہوگئی ہے۔ چچی جان نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا ان کا خیال تھا کہ تمہیں ذرا عقل آجائے پھر آگاہ کر دیں گے مگر مجھے اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا انتظار فضول ہی ہے۔"

"مجھ سے پوچھے بغیر، میرے متعلق اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں وہ؟" مانو کی آواز بیچ بیچ حلق میں پھنسنے لگی۔ "ضرور پوچھ لیتے۔ اگر تمہارے عقل وشعور کے متعلق انہیں ذرا بھی خوش فہمی ہوتی تو۔"

زین بھائی کو اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے کو ترس آیا مگر پھر اگلے ہی لمحے انہوں نے ترس کھانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس کا بچپنا، نادانیاں حماقتیں سب اپنی جگہ مگر اب کی بار تو واقعی حد ہی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

صبح طلحہ، حسان اور حسام جلدی نکل جاتے تھے۔ زین البتہ ان کے بعد جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صبح ناشتے کی میز پر عموماً وہ اور امی ہی ہوتے تھے۔

"پھر تم کچھ کرو گے نا زین، مجھے تو بے چاری بچی پر بہت ہی ترس آرہا ہے۔ جمیلہ تو باؤلی ہوگئی ہے۔ بس جلد سے جلد بیٹی کا دوبارہ گھر بس جائے۔ اس فکر میں نہ تو اس بڈھے کی عمر دیکھی نہ شکل۔ نہ چار چار بچوں کا جھنجھٹ، میں نے تو کہہ دیا کہ میں اپنے بیٹے سے کہتی ہوں۔ کوئی معقول رشتہ بتائے مجھے۔" امی نے زین کے آگے سارا ماجرا پھر سے بیان کیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کچھ لوگوں سے کہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کوئی مناسب رشتہ مل جائے گا۔" سلائس اور انڈا کھاتے ہوئے زین نے ماں کو تسلی دی۔ بچپن سے ہی واقف تھا ماں کی عادت سے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں تھا۔

جمیلہ بھی ان کے بچپن سے ہی یہاں کام کر رہی تھی۔ دعا بھی ان کے سامنے کی بچی تھی۔ اب اس کے ساتھ زندگی کا یا انسانوں کا سلوک انہیں بہت بڑی زیادتی لگ رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے زین کو ٹاسک دیا تھا کہ کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈنے میں تھوڑی مدد کرے ویسے ایک رشتہ کروانے والی سے بھی انہوں نے رابطہ کیا ہوا تھا۔

دراصل زین نے ہی انہیں ایک بار بتایا تھا کہ اس کی یونی میں ایک صاحب ہیں جو فی سبیل اللہ رشتے کراتے ہیں خصوصاً غریب طبقے کے۔ امی کو یہ بات یاد رہ گئی تو دعا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے بیٹے کے بھی حوالے کر دیا۔ ویسے انہیں امید تھی کہ وہ اس بے زبان لڑکی کی کچھ تو مدد کرنے میں کامیاب ہوں گی۔ جو بے چاری نہ خالق سے شکوہ کرتی تھی کبھی نہ مخلوق سے کوئی شکایت۔

"الوینہ کی اور تمہاری شاپنگ کروانی ہے۔ آپا جان پوچھ رہی تھیں اب زیادہ دن تو بچے نہیں ہیں۔ کب چلو گے تم؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"سنڈے کو چلتے ہیں۔" زین نے چائے کا کپ منہ سے لگایا۔

"مانو کی بھی شاپنگ کروانی ہے۔ وہ تو کب سے اودھم مچا رہی تھی جانے کے لیے۔" وہ مسکرائیں۔

"مگر ایک دو دن سے دیکھ رہی ہوں ذرا چپ

چپ سی ہے۔" انہوں نے فوراً فکر مندی کا اظہار کیا۔
"ٹیسٹ وغیرہ ہوں گے کالج میں آپ کو تو معلوم ہی ہے ٹیسٹ اور ایگزام کے دنوں میں وہ مزید اول جلول سی ہو جاتی ہے۔" زین نے ہنس کر ان کی فکر مندی کو مذاق میں اڑایا۔ ورنہ مانو کی اس چپ کا راز اچھی جانتے تھے۔

☆☆☆

آج تیسرا دن تھا۔ الشبہ کی تضحیک آمیز نگاہیں اور طنزیہ مسکراہٹ اب مزید برداشت کرنا مانو کے بس سے باہر تھا۔ باقی سہیلیاں بھی بڑی بے صبری سے ٹریٹ کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے پوچھنے کے انداز میں الشبہ کی طرح طنز تو نہیں مگر بے صبرا پن ضرور تھا۔
"ہائے اللہ میاں جی، آپ ہی مدد کر دیں میری، زین بھائی کے دل میں رحم ڈال دیں میرے لیے۔ ورنہ تو بڑی بے عزتی ہو جائے گی میری۔"
دل ہی دل میں اللہ سے التجا کرتے ہوئے وہ لان سے اندر کی طرف آ رہی تھی اپنے خیالات اور اللہ سے کی جانے والی التجاؤں میں بری طرح منہمک راستے میں رکھے گملے سے اس بری طرح ٹھوکر لگی کہ بے اختیار چیخ نکل گئی۔ پیر پکڑ کر وہ وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی۔
"کیا ہوا؟" طلحہ اندر سے فوراً ہی نمودار ہوا تھا بالکل الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح یا پھر کہانیوں، فلموں اور ڈراموں کے کسی ہیرو کی طرح، جو اپنی ہیروئن کے پاس فوراً اس وقت پہنچ جاتے ہیں۔ جب اس پر کوئی افتاد یا مصیبت نازل ہوتی ہے۔
"کیا ہوا؟" طلحہ ذرا ہٹ کر وہیں بیٹھ گیا اور اپنا سوال دہرایا۔
"نظر نہیں آ رہا، چوٹ لگ گئی ہے۔" مانو کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔
ساری مصیبتیں ایک ساتھ آئی تھیں نہ زین بھائی نے ابھی تک ہامی بھری تھی ٹریٹ دینے کی پھر اس مسٹر خوامخواہ کی مصیبت، نہ مجھے بتایا نہ مجھ سے پوچھا۔ لے کے فیصلہ ہو گیا بس، اوپر سے یہ چوٹ، ایسا لگ رہا ہے انگوٹھے کا ناخن ہی اکھڑ گیا۔ اللہ اللہ، کتنا درد ہو رہا ہے۔ مانو کا چہرہ مختلف قسم کے جذبات کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک رنگ آ رہے تھے۔ جنہیں ساتھ میں بیٹھا طلحہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
"کہاں چوٹ لگی ہے؟ بتاؤ تو۔" توقع اور مزاج کے برخلاف طلحہ خاصے تحمل اور ٹھہراؤ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔
"تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو خوشی ہو رہی ہوگی میری تکلیف پر۔" مانو کا موڈ ہنوز بگڑا ہی ہوا تھا۔
"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں جو تمہاری تکلیف پر مجھے خوشی ہوگی۔ دکھاؤ کہاں لگی ہے۔" وہ اتنی نرمی سے بات کر رہا تھا کہ مارے حیرت کے مانو کو غش آنے لگا۔ کیا یہ وہی "جانی دشمن" ہے؟
مانو نے پیر کے انگوٹھے پر سے ہاتھ ہٹایا۔ ناخن تو خیر اپنی جگہ سلامت موجود تھا ہاں کھال میں ذرا سی لگی تھی۔ تھوڑا سا خون نکل رہا تھا۔
"یہ لگا لو۔" طلحہ نے جیب سے سنی پلاسٹ نکال کر اسے دیا۔
"تم کیا اسے جیب میں لیے گھومتے رہتے ہو؟"
"ہاں، دو چار اپنی پاکٹ میں رکھتا ہوں۔ کیا پتا کب کسی خوب صورت لڑکی کو اس کی ضرورت پیش آ جائے۔" ایک غیر سنجیدہ جواب دیتے وقت طلحہ لہجہ بالکل سنجیدہ تھا۔
"ایک کام کرو، اپنے چٹکی کاٹو زور سے تم واقعی جاگ رہے ہو یا نیند میں ہو؟" حیران ہوتی ہوئی مانو نے بھی بالکل سنجیدگی سے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔
"محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ نیند میں ہوں اور بہت خوب صورت خواب دیکھ رہا ہوں۔" طلحہ کی پرشوق اور شوخ نگاہیں مانو کے سے چہرے پر جمی تھیں۔

”طلحہ کے بچے، یہی گملا اٹھا کر سر پر ماروں گی تمہارے۔“ مانو سے اس کا یہ بدلا ہوا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”بس، آ گئیں فوراً اپنی اوقات پر، کیا ہم تھوڑی دیر پڑھے لکھے افراد کی طرح بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے؟“ مانو کے چیخنے پر طلحہ نے بدمزا ہو کر اسے گھورا۔

”کیا وہ پڑھے لکھے لوگوں جیسی باتیں تھیں جو تم کر رہے تھے؟ اور بائی داوے تم کب سے ایجوکیٹڈ لوگوں کی لائن میں آئے ہو؟“

”بس ابھی ابھی پانچ منٹ پہلے۔“ مانو کی استہزائیہ مسکراہٹ کے جواب میں، بے حد اعتماد سے بولا تھا۔

”تم کبھی نہیں سدھرو گے۔“ مانو نے افسوس سے سر ہلایا۔

”کوشش کر کے دیکھ لو۔ کیا پتا سدھر جاؤں۔“ طلحہ کی شوخ آنکھیں چمک رہی تھیں اور مانو پہلی بار اس شوخی اور چمک کے آگے کنفیوز ہوئی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے تمہیں سدھارنے کی، کون سا تم میرے“ وہ بولتے بولتے ایک دم رک گئی۔ سچ مچ اسی کے پلے تو بندھنے والا تھا وہ۔

”ہاں ہاں آگے کہو، رک کیوں گئیں؟“ اس کی کیفیت سے طلحہ پوری طرح خط اٹھا رہا تھا۔

”تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے۔ بے کار ادھر ادھر پھرتے رہتے ہو جیبوں میں سنی پلاسٹ لیے۔ کہیں کوئی لڑکی گرتی دیکھی اور پہنچ گئے نمبر بنانے۔“ مانو نے اپنی بوکھلاہٹ چھپانے کے لیے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”کوئی لڑکی نہیں، صرف خوب صورت لڑکی،“ طلحہ نے تصحیح کرتے ہوئے مزید کہا۔

”ویسے آج میں نے جس لڑکی کی ہیلپ کی ہے۔ وہ ہے تو نہیں، مگر مجھے دنیا کی سب سے پیاری لڑکی لگتی ہے۔“

طلحہ دھیرے سے کہتا ہوا چراغ کے جن کی طرح جیسے آیا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا۔ اور مانو کے آس پاس اپنی اور اپنے لفظوں کی خوشبو چھوڑ گیا۔

☆☆☆

دو چار دن مستقل اس کی اتری ہوئی شکل اور خاموشی دیکھ کر زین کا دل پسیج ہی گیا۔ پھر وہ مستقل منتیں بھی تو کیے جا رہی تھی۔ اور پھر باقی سب کے سامنے وہی چپ، جیسے گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو مانو، آخری بار ہے یہ۔ اب آئندہ نہ اس قسم کی، نہ کسی اور قسم کی حماقت کرو گی تم۔“ زین بھائی نے انتہائی سنجیدگی سے اسے تنبیہ کیا تھا۔

”جی۔“ مانو نے انتہائی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ایسے ریسٹورینٹ کا انتخاب کیا گیا تھا جو ساری سہیلیوں کے گھر سے قریب ہو، تاکہ کسی کو آنے جانے کا مسئلہ نہ ہو آدھ درجن سہیلیوں میں سے چار ایک ساتھ آئی تھیں۔ باقی دو ایک ساتھ اور مانو، زین بھائی کے ساتھ پہلے پہنچ گئی تھی۔

مشکل سے آٹھ دس منٹ ہی ہوئے تھے۔ سب کا تعارف اور سلام دعا میں الشبہ نے ایک دو سوالات پوچھے بہت پر اعتماد اور بہادر بن کر۔ باقی سب تو بس مسکرانے اور جھینپنے میں لگی ہوئی تھیں۔

”اچانک“ زین بھائی کا موبائل بج اٹھا۔ وہ خود بھی وہاں سے اٹھ گئے اور کچھ دیر بعد کال اٹینڈ کر کے واپس آئے تو سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”آئی ایم سوری گرلز ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ لوگ پلیز آرڈر کریں۔ کھائیں، پئیں، انجوائے کریں، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“ بہت شائستگی اور تہذیب سے زین نے معذرت کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

”جی آپ چلے جائیں، ہم سب مل کر تو ویسے بھی بہت انجوائے کرتے ہیں۔“ کسی کے کچھ کہنے سے بیشتر مانو جھٹ بول پڑی۔

زین چلے گئے اور ساری لڑکیوں نے پہلے کھل

کرسانس لی اور ہنسیں۔

''ہائے مانو! تیرے کوئی دیور وغیرہ ہیں تو دیورانی کے عہدے کے لیے میں حاضر ہوں۔'' شوخ اور باتونی لائبہ نے پیش کش کی۔

''کیوں ہم کیا مر گئے ہیں؟'' کومل نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''میں بھی لائن میں کھڑی ہوں یاد رکھنا۔'' وردا منمنائی، ایک بار پھر بے فکرے سریلے قہقہے بلند ہوئے۔

''آرام سے، یہ کالج نہیں ہے ہمارا۔''

الشبہ نے سب کو گھور کے دیکھا۔ زین کو دیکھ کر اس سے بات کر کے الشبہ کو پہلے رشک آیا پھر اندر چھپے بغض نے اس رشک کو حسد میں بدل دیا۔ حسد کی آگ میں جلنے والے لوگ نہ خود خوش ہوتے ہیں۔ نہ کسی دوسرے کو ہونے دیتے ہیں۔ الشبہ کا بھی یہی حال تھا۔ مانو سمیت کسی کا بھی ہنسنا بولنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مانو میں خودنمائی کا جذبہ تو تھا مگر خود غرضی نہیں تھی نہ ہی وہ کسی کے خلاف دل میں کینہ یا عناد رکھتی تھی۔ اس وقت بھی وہ الشبہ کے ساتھ ہوئی اپنی جھڑپ کو فراموش کر کے بڑھ چڑھ کر خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ بول بول کر ہنس ہنس کے اور کھا پی کے جب سب کی سب اچھی طرح سیر ہوگئیں تو زین چلے آئے، فٹافٹ بل کی ادائیگی کی اور سب نے روانگی اختیار کی۔

''مانو!'' ڈرائیو کرتے ہوئے زین بھائی نے اسے مخاطب کیا جو خاصی مسرور لگ رہی تھی۔ سہیلیوں کی رشک آمیز نگاہیں اسے فخر کے آسمان پر بٹھا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ شاید ہواؤں میں اڑ رہی تھی کہ زین بھائی کی آواز آئی۔

''جی!'' وہ واپس زمین پر آئی۔

''اب سدھر جاؤ بچے۔ آج سے پہلے اتنی شرمندگی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔'' زین بھائی کے لہجے میں کوئی بات تھی مانو بی بی ندامت کے سمندر میں غوطے کھانے لگیں۔

''آئی ایم سوری زین بھائی، آئندہ نہیں کروں گی۔ پرامس۔'' اپنی دانست میں تو سچے دل وعدہ کر رہی تھی مگر زین اتنے خوش فہم نہ تھے۔

عادتیں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتیں نہ ہی ایک دم چھوڑی جا سکتی ہیں خصوصاً بری عادتیں اور ویسے غلطی ہماری بھی ہے۔ بچوں کی بری اور غلط عادتوں کو ہم بڑے سپورٹ کرتے ہیں اور جب وہ عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں تو ہم انہیں سدھرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یا بہت زیادہ ہوا تو خود سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر پھر یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے زین بھائی سوچ تو رہے تھے مگر اپنے سارے خیالات مانو پر ظاہر نہیں کیے۔ بس لیکچر دیتے رہے اور وہ بھی بہت تابعداری اور فرماں برداری کے ساتھ سنتے ہوئے سر ہلاتی رہی۔

☆☆☆

اف، اف سر سے کتنا بڑا بوجھ اتر گیا۔ ہوا سے بھی سبک محسوس ہو رہا تھا اپنا آپ۔ مانو نے خود کو یونہی آئینے میں دیکھا کل تک میری شکل کیسی ہو رہی تھی یوں اس نے لٹکا ہوا منہ بنایا اور آج۔ ہی ہی تاثرات تبدیل کر کے ہنستا ہوا چہرہ آئینے میں دیکھ کر خود ہی انجوائے کرنے لگی۔

''ویسے تم ہو تو نہیں مگر پھر بھی مجھے دنیا کی سب سے پیاری لڑکی لگتی ہو۔''

ایک سرگوشی سی آس پاس مہکی اور اس پل اسے بھی اپنا آپ آئینے میں اتنا خوب صورت لگا کہ پہلے ایسا کبھی نہیں لگا تھا۔ یہ مسٹر خوامخواہ بھی بس، ایویں دشمن سے کچھ کچھ دوست لگنے لگا ہے۔ مانو کے لبوں پر خوامخواہ ہی ایک پیاری سی مسکراہٹ آگئی۔

لیکن کوئی بھروسہ بھی نہیں! اس اوور بلاؤ کا، قلابازیاں کھانے میں ماہر ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ مانو کے چہرے پر کشمکش کے آثار ظاہر ہوئے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا اپنا دل بھی قلابازیاں کھانے لگا۔

''اب اتنا برا بھی نہیں ہے۔ زین بھائی سے ذرا

کم ہے مگر ہے تو ہینڈسم تھوڑا لڑاکا تو ہے مگر جب بھی دھیرے دھیرے آرام سے بولتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے اور پھر اچھی خاصی کوکنگ بھی تو کر لیتا ہے۔ چلو میری تو چھٹی ہوئی کھانے بنانے سے۔'' اپنے لمبے اور سلکی بالوں میں برلش کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کرنے لگی۔

''ویسے بھی زین بھائی نے کتنا سمجھایا ہے کہ اب میں بڑی ہوگئی ہوں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اب مجھے خود کو بدلنا چاہیے اچھی عادتیں اپنانی چاہئیں اور بری چھوڑ دینی چاہئیں۔ امی بھی یہی ڈانٹتی ہیں کہ مجھے سدھر جانا چاہیے۔ چول پھر اب سے لڑائی جھگڑا اور دشمنی ختم، اور دوستی اور......'' آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اور اگلی بات سوچتے ہوئے وہ شرما گئی۔

''کیا پیار ایسے بھی ہوتا ہے؟ یا ایسے ہی ہوتا ہے؟''

☆☆☆

شاپنگ پر جانے کی خوشی سب سے زیادہ مانو کو ہی تھی شاید، بہت بے صبری سے اور بے چینی سے وہ انتظار کر رہی تھی۔

اتنی خوشی اور ایسا انتظار تو شاید الوینہ بھابھی کو بھی نہیں ہوگا۔ جتنی اس مانو بلی کو ہے۔'' بظاہر تو طلحہ نے اپنی امی کے کان میں سرگوشی کی تھی مگر وہ اتنی بلند آواز میں تھی کہ ''ہدف'' تک جا پہنچی۔

''تمہیں کیا پتا کہ وہ کتنی خوش ہیں؟ ایویں اندازے لگا رہے ہو یہاں بیٹھے بیٹھے۔'' مانو نے عادتاً جواب دیتے ہوئے عادتاً ہی تیوریاں چڑھائیں۔

''میرے اندازے ہی تو کمال کے ہوتے ہیں۔ ہنڈرڈ پرسنٹ کریکٹ میں تو اور لوگوں کا بھی بتا سکتا ہوں۔ کون کتنا خوش ہے اور کیوں؟''

''کسی نے پوچھا ہے؟''

''نہ پوچھے کوئی۔ میں خود ہی بتا رہا ہوں فی سبیل اللہ، ماشاءاللہ ماشاءاللہ، گل و گلزار، باغ و بہار ہوئے جا رہے ہیں لوگ۔'' طلحہ کی آنکھیں پھر چمکنے لگیں اور مسکراہٹ وہ تو بس ایسی تھی کہ مانو کو مزید کچھ کہنے کا یارا نہ دیا۔

''مما! دیر ہو رہی ہے۔ الوینہ بھابھی اور آنٹی تو نکل بھی گئے گھر سے، جلدی کریں نا۔''

''ہاں جلدی کریں۔ تاکہ اگلی فائل اوپر آئے۔'' طلحہ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتا تھا۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ پرانی ادت تھی۔

مانو مسکراہٹ دباتے ہوئے چل پڑی۔ امی نے مگر ایک دھپ اپنے بیٹے کے کندھے پر لگائی تھی۔

''بدتمیز بہت جلدی ہے فائل اوپر لانے کی؟''

مال میں الوینہ اور آنٹی مل گئے تھے۔ دلہن اور دولہا نے تو اپنی چیزوں کی کلیکشن اور سلیکشن میں اتنا وقت نہیں لگایا مگر مانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایسا کون سا جوڑا خریدے جو دولہا کی اکلوتی بہن پہنے اور چھا جائے۔ بس یہی الجھن تھی جو پھر پھر کے ٹانگیں ٹوٹنے ہی والی تھیں۔ بے چاری احتجاج کر کر کے بھی بے ہوش ہونے لگی تھیں مگر مانو کو اب تک کچھ پسند ہی نہیں آیا تھا۔

''ارے مانو! تم یہاں؟'' کومل نے مخصوص پرجوش اور بلند آواز میں اسے یوں پکارا کہ مانو، اس کے ساتھ کھڑی مما اور امی ذرا فاصلے پر کھڑے زین، الوینہ اور الوینہ کی امی سب ہی متوجہ ہوگئے۔

''السلام علیکم!'' کومل نے سب کو بالعموم اور زین بھائی کی طرف رخ کر کے بالخصوص سلام یا تھا۔ جس کا جواب انہوں نے سر کی جنبش سے دیا تھا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' کومل نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائیں اور مانو کا دم نکلنے لگا۔ مما کی تو خیر تھی مگر امی جیمز بونڈ زیرو زیرو سیون سے کم نہ تھیں۔

''سوٹ دیکھ رہی تھی اپنے لیے۔''

''انگیج منٹ کا؟'' کومل نے اتنے اشتیاق سے پوچھا تھا کہ امی خود بخود ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''کس کی انگیج منٹ؟''

''اب نکاح ہو رہا ہے کومل!'' مانو نے اپنے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیوں کو ادھر ادھر کرتے

ہوئے اسے جواب دیا۔
''واؤ، پھر تو ایک ٹریٹ اور بنتی ہے۔'' کومل چہکی۔
''تم کیا خرید رہی ہو؟'' مانو نے زین اور الوینہ کو ادھر ہی آتے دیکھا اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ گیا۔
''ہائے اللہ میاں جی! زندگی سہیلیوں کے بغیر بھی اچھی بھلی گزر ہی جاتی ہے۔ پھر ہم سہیلیاں کیوں بناتے ہیں؟'' مانو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔
''کومل یار! ادھر ایک سوٹ دیکھا تھا میں نے، سمجھ میں نہیں آرہا، لوں یا نہیں۔ پلیز تم میری ہیلپ کر دو چوز کرنے میں۔''
مانو کا تو بس نہیں چل رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں اس ''بیسٹ فرینڈ'' کومل کی بچی کو سب کی نگاہوں سے غائب ہی کر دے اور خیر اسے، سب کی نگاہوں سے غائب تو نہیں البتہ اوجھل ضرور کر کے واپس آئی تھی۔
''اف ف...... شکر ہے جان بچ گئی۔'' جملہ حاضرین میں واپس آکر مانو نے سب سے پہلے تو سکون کا سانس لیا۔ پھر اگلی ہی سانس میں چھٹ پٹ جوڑا خرید کر فٹافٹ دیگر اشیاء خریدیں اور جب تک گھر نہیں پہنچ گئی اس کا دل دھک دھک ہی کرتا رہا۔
☆☆☆
اللہ اللہ کر کے نکاح کا دن بھی آ پہنچا۔ چھوٹی سی مختصر سی تقریب تھی مقامی میرج ہال میں۔ قریبی رشتے دار اور خاندان کے افراد تھے۔ ویسے تو دولہا دلہن سمیت سب ہی خوش تھے مگر مانو کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ سنہری و نقرئی لباس میں اس کی چمپئی رنگت خوب دمک رہی تھی۔ ریشمی دراز زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ امی کی ڈانٹ ڈپٹ کے خوف سے ہار سنگھار اپنے تئیں تو کم ہی کیا تھا اور امی نے بھی یہی تبصرہ کیا تھا کہ بے شک دلہن سے بس ذرا سا ہی کم ہے۔
''بات سنو۔'' طلحہ نے اٹھلاتی ہوئی مانو کو روکا۔
''سناؤ۔'' وہ ٹھہر گئی۔ آج تو سب ہی اس کی تعریف کر رہے تھے۔
یہ مسٹر خوامخواہ بھی بے شک حسن کے قصیدے نہ پڑھے مگر کچھ نہ کچھ خراج تحسین تو ضرور ہی پیش کرے گا۔ مانو بے چاری اندر سے تھوڑی بھولی بھالی بھی تھی۔
''ایک بات تو بتاؤ یہ تم لڑکیوں کی قوم اتنا ڈھیروں ڈھیر میک اپ کیوں کرتی ہے؟'' بڑا سو کھا سامنہ بنا کر طلحہ نے سوال کیا تھا۔
''کون سی لڑکیاں اور کون سی قوم؟ یہاں تو میں اکیلی کھڑی ہوں تمہارے سامنے۔'' مانو نے پلکیں جھپکائیں حد ہو گئی یعنی کہ......
''اکیلی کہاں ہو، آس پاس اتنا تو ہجوم ہے۔ کاش کہ ہوتیں اکیلی؟'' طلحہ پہلا سوال فراموش کر کے ذرا رومانٹک ہوا۔
''تم سچ مچ ناقابل اصلاح ہو۔'' مانو نے بے حد افسوس اور مایوسی سے سر ہلایا تھا۔
''دراصل ابھی تک کوئی اچھی سی، ذرا حسین سی لڑکی نہیں ملی جو میری اصلاح کر دے بس اسی لیے اب تک کچھ بگڑا ہوا، کچھ ناقابل اصلاح سا گھوم رہا ہوں۔'' طلحہ نے اپنے کالر سے نادیدہ گرد جھاڑی۔
''کبھی تم کچھ ہوتے ہو، کبھی کچھ، کوئی دین ایمان ہے تمہارا؟'' مانو نے اسے غور سے دیکھا جو گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت تھا۔
''تمہارے اس سوال کے جواب میں ایک رومانٹک ڈائیلاگ بول سکتا ہوں مگر تم شرما کر بھاگ جاؤ گی اور میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ دیر اور میرے سامنے رہو۔'' طلحہ نے گڑ سے پرہیز کرتے کرتے کھا ہی لیا۔ نہ کہتے کہتے بھی تھوڑا سا رومانس جھاڑ دیا۔
''زین بھائی اور الوینہ بھابھی کی جوڑی کتنی پیاری لگ رہی ہے نا۔'' مانو بحث و مباحثہ اور لڑائی جھگڑے میں تو کسی طور اس سے ہار ماننے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ ڈٹی رہتی تھی مگر طلحہ کی فر فر چلتی زبان سے زیادہ اس کی بولتی ہوئی آنکھیں مانو کو پسپائی پہ مجبور کر دیتی تھیں۔

”بالکل پیاری جوڑی ہے اور میرا خیال ہے کہ زین بھائی کے بھائی کی جوڑی بھی بہت خوب صورت ہے۔“ طلحہ نے زور و شور سے سر ہلایا۔

”شاید امی بلا رہی ہیں مجھے۔“ مانو نے ذرا دور کھڑی امی جان کو دیکھا اور راہ فرار اختیار کی، مسٹر خوامخواہ کی ایسی ویسی باتوں اور نگاہوں سے دل کی دھڑکن تیز ہو چلی تھی۔

☆☆☆

کارپٹ پہ چوکڑی مار کر بیٹھی ہوئی عورت گہری رنگت اور بھاری تن و توش کی مالک تھی۔ چہرے پہ وہ سختیاں رقم تھیں جو گزرا ہوا مشکل وقت اپنی نشانی اور علامت کے طور پر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے انداز اور کھردرے ہاتھ پیروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محنت مشقت کی عادی ہے۔

”کیا کروں باجی، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں، ناریوں کے لیے ہی اتنی مشکل ہو رہی ہے اس نمانی بیوہ کو کون پوچھتا ہے؟“ جمیلہ کی آواز میں بے بسی اور کرب نمایاں تھا۔

”پھر بھی جمیلہ اب ایسا بھی کال نہیں پڑا کہ تم بچی کو لے کر گڑھے میں ہی ڈال دو۔ بتاؤ ذرا بڈھا، چار بچوں کا باپ اور وہ تمہاری ذرا سی بچی ابھی تو خود بچی ہے، منع کیا تھا کہ اتنی جلدی شادی نہ کرو آرام سے دیکھ بھال کے کر دیتیں۔“ شافعہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

”آپ نہیں سمجھو گی باجی! ہم غریبوں کے مسئلے مسائل ہم ہی جانتے ہیں۔ عمر گزر گئی نشئی میاں کو جھیلتے جھیلتے، محنت مزدوری کر کے چھ بچوں کے ساتھ ساتھ اس کم بخت کو بھی ٹھنسایا ہے، پانچ لڑکیاں ہیں ذرا اور بڑی ہوئیں، تو سب ایک برابر کو ہو جائیں گی اسی لیے اس نصیبوں جلی کی شادی کر دی تھی کہ چلو ایک پہاڑ تو سر کے مگر قسمت کی مار واپس آ کر پھر چھاتی پہ بیٹھ گئی۔“ جمیلہ تو بس بھری بیٹھی تھی۔

”اب ایسی باتیں نہ کرو، اس بے چاری کا کیا دوش اور تم سے میں نے کہا تھا کہ ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کوئی مناسب رشتہ ان شاء اللہ مل ہی جائے گا۔ تھوڑا سا صبر تو کرو۔“ شافعہ اسے سمجھانے میں لگی ہوئی تھیں۔

”ہماری تو ساری زندگی صبر میں ہی گزرتی ہے باجی!“ جمیلہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

زین بھائی کی شخصیت میں بڑا ٹھہراؤ اور بردباری تھی الوینہ بھابھی بھی انہی کی طرح سوبر سی تھیں اگرچہ نکاح ہو چکا تھا دونوں گھرانوں کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی ویسے بھی خالہ کا گھر تھا مگر دونوں خود ہی محتاط تھے۔

”ارے زین! کسی روز الوینہ کو ڈنر پہ لے جاؤ۔ بچیوں کے بھی کچھ ارمان ہوتے ہیں۔“ امی نے بیٹے کو مشورہ دیا۔

”کسی موقع پہ دیکھیں گے امی!“ زین بھائی تو ہمیشہ کی طرح اپنے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھے۔ ان کی زندگی میں ان کی ٹیچنگ کیریئر اور اسٹوڈنٹس کی بڑی اہمیت تھی، بقول مانو کے، اتنا تو وہ الوینہ بھابھی سے باتیں نہیں کرتے تھے جتنا کہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ کے ساتھ مصروف تھے۔ امی کی بات کا کتنا اثر ہوا، کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ آپا جان کی فیملی کو کسی روز انوائیٹ کر لوں، ہم تو ان کی دعوت کھا کر آ گئے۔ اب ہمیں بھی دعوت کرنی چاہیے نا۔“ امی نے دوسرا طریقہ نکالا۔

”اچھا آئیڈیا ہے۔“ زین ان کی طرف بھی متوجہ تھے مختصر جواب دے دیا۔

”ٹھیک ہے تمہارے ابو سے کہتی ہوں کسی اچھے سے ہوٹل میں بکنگ کرا لیں مانو تو کب سے کہہ رہی ہے ٹریٹ دینے کے لیے اس کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے امی! جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

☆☆☆

مانو کے تو دل کی کلی کھل اٹھی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر۔ اف ف کب سے کبھی زین بھائی سے کبھی ابو سے، کبھی مما سے فرمائشیں کر رہی تھی ''مما زندہ باد'' مارے خوشی کے اس نے ان کا گال ہی چوم لیا۔

''باؤلی ہے بالکل۔'' مارے محبت کے وہ بھی مسکرا دیں۔

''کپڑے کون سے پہنوں۔''

الماری کھول کر آدھ گھنٹے سے دیکھ رہی تھی سارے ہینگرز بیڈ پہ ڈھیر تھے۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا، کون سا جوڑا منتخب کرے، بہت سوچ بچار کے بعد رائل بلیو کلر کا ایک خوب صورت سا جوڑا نکالا، سلور بالیاں، میچنگ شوز، ہلکا پھلکا میک اپ کر کے بالوں میں ہاف کیچر لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ پھر پرفیوم یاد آیا، دوبارہ بھاگی، خدا خدا کر کے اس کی تیاری مکمل ہو ہی گئی۔ دو گاڑیوں میں بھر کے سب کے سب ہوٹل پہنچ گئے، الوینہ اور فیملی پہلے ہی وہاں موجود تھے۔

''اللہ، الوینہ بھابھی، کتنی حسین لگ رہی ہیں آپ!'' مانو نے اسے دیکھا اور بے اختیار تعریف کی۔ پیازی رنگ کا شیفون کا جوڑا پہنے مناسب تیاری کے ساتھ وہ سچ مچ بہت ہی حسین لگ رہی تھی اور ویسے اس کے حسن میں کچھ رنگ نئے نویلے رشتے کے تھے اور اس رشتے کے حوالے سے خوب صورت احساسات کے بھی تھے۔

''ایک منٹ ایک سیلفی لے لوں۔'' مانو نے گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی اور سب کو سیلفی لے کر پوسٹ کی تھی اس پر کئی سہیلیوں اور کزنز کی لائکس آ گئی تھیں۔ اب ہوٹل میں سب کے ساتھ دھڑا دھڑ سیلفیاں لے کر کھٹا کھٹ پوسٹ کر رہی تھی ''فائیو اسٹار میں ڈنر'' کی ہیڈ لائن بھی دے دی تھی۔

''ہائے۔'' واؤ کی داد و تحسین کے پاس کھڑی ہر پوز سے اپنی سیلفیز بنا رہی تھی ابھی امی کی ڈانٹ کھا کر آئی تھی پھر بھی باز نہیں آئی مما اور بڑے ابو ہمیشہ ہی اس کی حمایت کو موجود رہتے تھے۔

''ارے بھئی آج تو رہنے دو یہی تو ہنسنے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں، بچوں کے۔'' ان دونوں کی شہہ پہ امی کی لگام ذرا ڈھیلی پڑ جاتی تھی مانو اپنی سیلفیز لینے اور پھر خود ہی دیکھ کر واہ واہ کرنے پوسٹ کرنے اور لائکس دیکھ دیکھ کر خوش ہونے میں اتنی مصروف اور مگن تھی اس نے دیکھا ہی نہیں کہ زین بھائی اور الوینہ بھابھی کے پاس آ کر کون کھڑا ہوا ہے جس کی پشت مانو کی طرف تھی اور جو بڑے چہک کر زین بھائی سے مخاطب تھی۔''

''ارے زین بھائی! بہت بہت مبارک ہو آپ کو، نکاح ہوا ہے اب تو بڑی والی ٹریٹ لیں گے ہم سب اور وہ ہیں کہاں آپ کی بیگم؟''

الشبہ بڑی بے تکلفی سے مخاطب تھی زین کی پیشانی پہ پسینہ آ گیا اور الوینہ کے چہرے پہ ہلکی سی حیرت تھی، مگر پھر یکدم ہی اس کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔

''آپ کی اسٹوڈنٹ ہیں؟'' اس نے سوال تو زین سے کیا تھا مگر جواب الشبہ نے دیا۔

''ارے نہیں ہم تو ان کی منزہ کی دوست ہیں۔ انہوں نے اور مانو نے ہمیں ٹریٹ دی تھی نا، لیکن وہ انگیج منٹ کی تھی، اب نکاح کی تو الگ سے دعوت کھائیں گے۔ مانو اگر دھڑا دھڑ سیلفیز پوسٹ نہ کرتی تو ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ موصوفہ نکاح کے بعد اپنا پہلا ڈنر کر رہی ہیں آپ کے ساتھ، ہم لوگ ادھر ہی آئے تھے ابھی ساتھ والے بینکوئٹ میں میری کزن کی شادی ہے، بھی آپ لوگوں سے ملنے آ گئی یہاں، ویسے محترمہ ہیں کہاں؟''

نان اسٹاپ بولتے ہوئے الشبہ نے ادھر ادھر گردن گھمائی، سامنے سے مانو موبائل دیکھتی ہوئی آ رہی تھی، اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ لمس کے لیے حشر کا دن آ گیا ہے اپنی تمام پوسٹوں پر کمنٹس پڑھتی ہوئی وہ چلی آ رہی تھی اور قریب پہنچ کر الشبہ کی آواز کانوں میں پڑی تو مانو نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا اور ہاتھوں سے موبائل گرتے گرتے بچ گیا

مگر طوطے ضرور اڑ گئے، اوسان خطا ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، وہ بت بنی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور الشبہ با آواز بلند بول رہی تھی۔

''ارے بھئی مانو، تمہارے ہزبینڈ یہاں بیٹھے ہیں، تم وہاں اکیلے اکیلے سیلفیاں لے رہی ہو زین بھائی کے ساتھ لو نا۔'' الشبہ بہت میٹھی بنی ہوئی تھی۔

زین بھائی اور مانو کے چہرے فق تھے، باقی سب انتہائی حیران تھے۔

''مانو کا کیا ذکر ہے یہاں؟ ذین کا نکاح تو الوینہ سے ہوا ہے۔'' ممیا نے تصحیح کی۔

دراصل الشبہ چوتھی مانو اور اپنے گروپ کی دیگر لڑکیوں کے مقابلے میں کافی تیز دماغ تھی۔ اس نے جب پہلی بار زین بھائی کو دیکھا ان سے بات کی اور ٹریٹ کے دوران ان کی غیر موجودگی وہ تب ہی کھٹک گئی تھی اور اس وقت اسے سنہری موقع ملا تھا حقیقت جاننے کا اور مانو کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا ممیا کی زبانی انکشاف سن کر تو اس کی آنکھیں ہی پھیل گئیں۔

''تمہارا بھی جواب نہیں ہے مانو، اتنے بڑے بڑے پرانک (عملی مذاق) بھی کر لیتی ہو؟'' وہ کہتی ہوئی مانو کے قریب سے گزر گئی۔

☆☆☆

بڑے سے لاؤنج میں خاموشی کا راج تھا، حالانکہ سب ہی موجود تھے زین بھائی نے الف سے لے کر ے تک ساری بات بتا دی تھی، وہ بے چارے اتنے شرمندہ ہو رہے تھے کہ بس، یہ تو سب بڑے تھے مگر الوینہ سے بھی معذرت کرنی تھی، اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔ انہیں اب پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اپنے سے چھوٹوں کی ہر ضد پوری کرنا اور لاڈ پیار کے نام پر ہر بات ماننا بھی کتنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ بہت محنت اور بہت عرصے میں کمائی گئی ساری عزت ذرا سی دیر میں خاک میں مل جاتی ہے۔

''ہم آپ کو بچپن سے جانتے ہیں زین ہمیں یقین ہے کہ آپ کا بتایا ہوا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ مگر بیٹا، آپ سے یہ امید نہیں تھی، آپ تو اتنے پڑھے لکھے، اتنے سمجھ دار ہو۔''

خالہ بے چاری اگرچہ شاکڈ تھیں پھر بھی انہوں نے بہت نرمی اور سبھاؤ سے بات کی، اس لیے نہیں کہ زین ان کے داماد تھے بلکہ اس لیے کہ وہ واقعی اپنے بھانجے کو جانتی تھیں۔

''میں ایک انسان ہی ہوں، کچھ خوبیوں اور کچھ خامیوں کے ساتھ اسے میری خامی سمجھ لیجیے یا کمزوری بچپن سے ہی مانو کی ہر ضد پوری کرنا اپنی ذمے داری سمجھی ہوئی تھی اور اس بار بھی...... اگرچہ میں نے بہت گلٹی فیل کیا مگر پھر بھی اس کی ضد پوری کر دی، یہ میری غلطی تھی میں تسلیم کرتا ہوں اور معافی مانگتا ہوں آپ سب سے۔'' زین بھائی کی آنکھیں فرط ندامت سے جھکی ہوئی تھیں، اور بس پھر امی جو بہت دیر سے ضبط کر رہی تھیں پھٹ پڑیں۔

''تمہارا کیا قصور ہے، تم کیوں اتنے شرمندہ ہو رہے ہو اور معافیاں مانگ رہے ہو؟ یہ کیا بچی ہے ننھی منی؟ کوئی عقل شعور نہیں ہے اس میں؟ کالج پہنچ کر بھی وہی حرکت، وہی ضدیں، وہی باتیں شرم نہیں آئی، اس طرح کی بات کہتے ہوئے بھی۔'' امی جان نے اپنی بیٹی کے لتے لیے وہ باتیں سنائیں کہ وہ جو پہلے ہی زرد چہرہ لیے ضبط کر کے بیٹھی تھی، دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مانو نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جن باتوں کو اور جن معاملات کو محض ہنسی مذاق اور کھیل تماشا سمجھتی تھی ان کے نتائج سنگین بھی نکل سکتے ہیں اس وقت تو ان سب کے سامنے شرمندگی اور ندامت کے مارے برا حال تھا۔ کالج اور سہیلیوں کا تو وہ ابھی سوچ ہی نہیں رہی تھی، الشبہ نے صرف کالج میں ہی نہیں، بلکہ فیس بک پہ اس کا ریکارڈ لگانا تھا۔

مگر اس وقت تو اسے سب سے زیادہ ان سب کی فکر اور پروا تھی جو اس سے محبت کرتے تھے، رو رو کر اس کا برا حال تھا ذین بھائی سمیت سب سے کتنی

بار معافیاں مانگ چکی تھی اور حالانکہ امی کے سوائے اور کسی نے بھی لعنت ملامت نہیں کی تھی۔ اسے نہ برا بھلا کہا، ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اسے سمجھایا ہی تھا۔

اور بس طلحہ تھا جو بات کر رہا تھا۔ اس سے نہ ہی چھیڑ خانیاں، سب کچھ جیسے یکسر ختم ہو گیا تھا۔

طلحہ کی یہ بے رخی اسے تکلیف دے رہی تھی۔

سارا سارا دن وہ یا تو اپنے کمرے میں پڑی رہتی، چھوٹے سے لان میں بے مقصد ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہتی، کبھی اوپر چلی جاتی، مما اس سے بولتی رہتیں، وہ ہوں ہاں کرتی رہتی، طلحہ تو اسے دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو جاتا تھا۔ کتنے دنوں سے اپنے موبائل کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اب تو موبائل کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا، یہی کم بخت سارے فساد کی جڑ ہے۔ نہ اس دن دھڑا دھڑ سیلفیز پوسٹ کرتی اور ساری خبریں نشر کرتی، نہ الشبہ کو پتا چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟

''اور وہ، جو تمہاری حرکت تھی زین بھائی کو اپنا منگیتر ظاہر کرنا، سہیلیوں میں بیٹھ کے شو آف کرنا؟ کیا وہ درست تھا؟''

ضمیر بے چارہ جو پہلے ایک کونے میں پڑا اونگھتا رہتا تھا، اب کچھ کچھ بیدار ہوا تھا، مانو سوچنے لگی تھی یا سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی، سب کے سامنے اتنی ذلت ہوئی تھی خصوصاً الوینہ بھابھی کے سامنے تو وہ نظر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ زین بھائی سمیت سب نے اسے لیکچر دیے تھے، بس ایک امی تھیں جنہوں نے سب کے سامنے تو اسے خوب ڈانٹا پھر اب بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ نہ انہوں نے باقی سب کی طرح اسے سمجھایا نہ نصیحتیں کیں، بس چپ کی بکل مار کے بیٹھ گئی تھیں۔

مانو کو اب احساس ہو رہا تھا کہ امی کی یہ خاموشی ان کی شدید ناراضی کی علامت ہے۔ وہ کئی بار انہیں مخاطب کرنے اور بات کرنے کی کوشش کر چکی تھی مگر وہ ہوں ہاں سے آگے ہی نہیں بڑھتی تھیں۔

مانو نے اپنے بال یونہی گول مول لپیٹ لیے، ہاتھوں سے کپڑوں کی شکنیں برابر کیں اور کمرے سے باہر آ گئی، اس دن کی بے عزتی کے بعد سے وہ اتنی پریشان اداس تھی کہ اپنا خیال رکھنا بھی بھول ہی گئی تھی، بالوں میں الٹا سیدھا کنگھا کر کے یونہی باندھ لیے، کپڑے نکال کے ایسے ہی پہن لیے، اس وقت بھی وہ کچھ اسی قسم کے حلیے میں تھی امی کے پاس پہنچی وہ کچن میں تھیں، پیاز کاٹ رہی تھیں۔

''لائیں امی! میں کاٹ دیتی ہوں۔'' مانو نے ان کے آگے سے پلیٹ سرکائی۔

''رہنے دو، میں خود کاٹ لوں گی۔'' امی نے انتہائی خشک لہجے میں بولتے ہوئے پلیٹ واپس اپنی طرف سرکائی۔

''امی پلیز، کتنی بار تو سوری کر چکی ہوں آپ سے، معاف کر دیں نا، آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گی۔'' مانوں کی آواز میں نمی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے، سب کے سامنے تو ذلیل ہوئی ہوں میں، مگر اپنی نظروں میں بھی ہو گئی ہوں۔'' امی کی آواز میں نمی کے ساتھ ساتھ افسوس بھی تھا۔

''اب تم جاؤ یہاں سے۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے مانو کو حکم دیا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی، دل تو چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کے رونے کو مگر ضبط کر کے بیٹھی رہی۔

''مانو آپی! مما بلا رہی ہیں آپ کو۔'' حسان نے کمرے میں جھانکا۔

''اچھا، ابھی آتی ہوں۔''

حسان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک یونہی بیٹھی رہی، پھر منہ دھو کر اوپر آ گئی۔ مما کچن میں تھیں۔

''مانو بیٹی! گاجر کا حلوہ بنایا ہے، تم لے لو، کھا لو اور ڈش میں نکالا رکھا ہے، وہ نیچے لے جانا، میں ابھی نہا کر آ رہی ہوں۔'' مما جلدی میں تھیں،

تیزی سے بولتی ہوئی چلی گئیں۔

مانو نے آگے بڑھ کر پتیلی میں جھانکا، کوئی اور وقت ہوتا تو مما زندہ باد کا نعرہ لگاتی اور ندیدوں کی طرح کتنا سارا حلوہ چٹ کر جاتی، مگر اس وقت تو کچھ کھانے کو بھی جی نہیں کر رہا تھا اس نے بے دلی سے ذرا سا حلوہ پیالی میں نکالا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

پتا نہیں امی کی ناراضی کب دور ہوگی؟ مانو کا جی بہت بھاری ہو رہا تھا، حلوہ کھانے کے بجائے یونہی پیالی میں چمچہ گھمانے لگی، تب ہی دعا اندر چلی آئی، مانو کو دیکھ کر ایک لمحے ٹھٹکی پھر تیزی سے سنک کے پاس چلی گئی، چند برتن پڑے تھے، انہیں دھونے لگی۔

''تم رو رہی تھیں؟'' مانو نے مضطرب ہو کر اس کی پشت دیکھی۔

''نہیں تو۔'' انکار کرتے ہوئے بھی اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

''جھوٹ مت بولو، میں نے خود دیکھا ہے تمہیں تم روتے ہوئے اندر آئی تھیں۔''

مانو اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ مگر دعا چپ چاپ برتن دھوتی رہی، کچھ نہ بولی۔

''دیکھو اگر کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ، ہو سکتا ہے میں ہیلپ کر سکوں تمہاری۔''

مانو نے نرم لہجے میں بولتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا جس پہ بے بسی اور رنج کے احساسات رقم تھے۔

مانو اتنی حساس شاید پہلے تو نہ تھی، مگر اب اسے احساس ہوا تھا کہ آنسوؤں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مسئلہ، غم یا مصیبت ہوتے ہیں اور یہ کہ جب کوئی آنسو بہاتا ہے تو اسے کسی کی دلجوئی اور ہمدردی کی ضرورت بھی ہوتی ہے، یہی خیال اسے دعا کے پاس لے آیا تھا۔

''اماں دوبارہ شادی کر رہی ہیں میری، اس کے دو بچے مجھ سے بھی بڑے ہیں۔'' دعا نے بس دو ہی جملوں میں اپنا سارا دکھ بیان کر دیا تھا۔

''تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟'' مانو نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''آپ کو جینے کے سارے حقوق حاصل ہیں مانو بی بی، اس لیے یہ کہنا آپ کے لیے بہت آسان ہے۔'' دعا کے لبوں پہ ایسی تلخ مسکراہٹ آئی جس کے سامنے آنسوؤں کی نمکینی بھی بے وقعت تھی۔

مانو مضطرب تھی، وہ کسی طرح دعا کی مدد کرنا چاہتی تھی اور ہمیشہ کی طرح اسے ایک ہی فرد سے امید تھی جسے وہ یہ مسئلہ بتا سکتی تھی۔ سہ پہر سے زین بھائی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کو بھی آج ہی دیر ہوئی تھی۔ سہ پہر سانولی سلونی شام میں بدل گئی تب کہیں جا کر مخصوص ہارن کی آواز آئی تھی، مانو جلدی سے اس طرف آئی۔ زین تھکے تھکے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''زین بھائی مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔''

''اوہ ناٹ اگین۔'' لمحے بھر کو وہ رکے اور کراہے۔

''مانو! ابھی تک کوئی سبق حاصل نہیں ہوا تمہیں، پھر وہی......'' زین جھنجلا کر بولے تھے۔

''مگر، میں تو......'' مانو کی بے یقین آنکھیں زین بھائی پہ جمی تھیں۔ اس طرح تو انہوں نے کبھی بھی مانو سے بات نہیں کی تھی وہ ہکلا کر رہ گئی، جملہ بھی پورا نہ کر سکی۔

''میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں، بعد میں بیٹھ کر تسلی سے سنوں گا تمہاری بات، ٹھیک ہے۔''

زین بھائی عجلت میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ مانو حیرت اور صدمے سے ان کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں بیٹھی کتنی دیر تک سوچتی رہی، زین بھائی کے رویے کا دکھ سب سے زیادہ تھا، پھر دعا کے بہتے ہوئے آنسو بار بار دھیان میں آ رہے تھے اپنا معاملہ اور امی کی خفگی، زین بھائی کی جھنجلاہٹ اور طلحہ کی بے رخی کا بھی خیال آیا مانو کو رونا آنے لگا، اپنے لیے اور دعا کے لیے بھی، کتنی دیر دعائیں مانگتی رہی۔

بہت دیر بعد جا کر اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوا پھر اسے خیال آیا کہ مما سے بھی یہ مسئلہ شیئر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔ مگر پھر کالج کی سہیلیوں کی یاد آ گئی دل چاہا کہ موبائل کھول کر دیکھے یقیناً سب کی کالز اور میسجز آئے ہوئے ہوں گے اور الشبہ نے تو اب تک سب میں ڈھنڈورا پیٹ دیا ہوگا۔ مانو نے ایک حسرت بھری نگاہ اپنے بند موبائل پہ ڈالی جسے آن کرتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

مما کے پاس رات میں گئی جب وہ عشاء کی نماز پڑھ چکی تھیں۔ لاؤنج میں طلحہ بیٹھا موبائل میں مگن تھا، نظر اٹھا کر بھی مانو کو نہیں دیکھا وہ اس کے پاس سے گزرتی ہوئی مما کے کمرے میں چلی گئی، انہیں ساری بات بتائی، وہ تحمل سے اس کی دعا کے متعلق بات سنتی رہیں اور سنتے سنتے مسکرا دیں۔

''زین نے مجھے کل ہی خوش خبری سنائی ہے، زین کے ایک دوست کا ڈرائیور ہے۔ بیوی فوت ہو گئی ہے چھوٹی سی بچی ہے ایک، وہ شادی کے لیے راضی ہے۔ ویسے تو اس کے دوست نے بھی اطمینان دلا دیا تھا پھر بھی زین نے اپنے طور پر بھی ساری چھان بین اور معلومات کر لی ہیں۔ سب کچھ تسلی بخش ہے، آج وہ جمیلہ سے ملوانے گیا ہے۔'' مما نے تفصیل سے مانو کو بتایا۔

''سچ؟'' مارے خوشی کے مانو کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے آپ نے۔'' ایک لمحے کو وہ وہی پرانی والی بانو بن گئی۔

''میرے پاس اور بھی اچھی اچھی خبریں ہیں۔'' مما پھر مسکرائیں۔

''کیا؟'' مانو کا ردعمل بے ساختہ تھا۔

''مما! کافی پئیں گی؟ بنانے جا رہا ہوں۔'' طلحہ نے دروازے پہ کھڑے ہو کر یوں اعلان کیا جیسے کسی مہم پہ جا رہا ہو۔

''ہم دونوں کے لیے بناؤ، مانو تو شوق سے پیتی ہے کافی۔''

''نہیں، اس وقت تو میرا دل نہیں چاہ رہا، میں ویسے بھی جا رہی ہوں۔''

مانو اٹھ کھڑی ہوئی جب وہ بات کرنا تو در کنار، دیکھ بھی نہیں رہا تھا اسے اور نہ ہی اسے کافی کا پوچھا تو اسے بھلا کیا ضرورت تھی ڈھیٹ اور بے شرم بن کر بیٹھے رہنے کی؟

مانو کے چہرے پہ تناؤ کے آثار تھے، طلحہ تو اسے یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے وہ دنیا میں کہیں موجود ہی نہ ہو، کچھ دکھ، کچھ سبکی اور کچھ ناراضی سارے احساسات اپنے اندر سمیٹے وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی۔ لاؤنج میں زین بھائی، امی، پاپا اور تایا ابو بیٹھے تھے، صرف بیٹھے نہیں تھے، باتیں کر رہے تھے اسے دیکھتے ہی زین اٹھ کر آئے۔

''تم کل کچھ کہہ رہی تھیں مانو، آئی ایم سوری، میں بہت تھکا ہوا تھا، ہاں کہو کیا بات تھی؟''

''وہ مجھے دعا کے متعلق ہی بات کرنی تھی آپ سے، ابھی مما نے بتایا ہے کہ۔''

''ہاں ہاں، اس کی فکر نہ کرو، اس بچی کا مسئلہ تو بس عنقریب حل ہونے کو ہے۔ بس یہی بات تھی؟'' زین بھائی وہی پرانے والے تھے، لونگ اینڈ کیئرنگ۔

''جی!'' مانو نے سر جھکا لیا، ویسے زین کی پہلے جیسی خوش باش آواز اور رویئے سے اسے بہت سکون اور اطمینان ملا تھا۔

''ارے بھئی کہاں ہو تم یہاں آؤ اور اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟ کتنے دنوں سے اوپر کوئی شور شرابا نہیں ہو رہا۔'' تایا ابو نے انتہائی محبت اور خوش گوار انداز میں سوال کیا تھا۔

''کچھ نہیں بڑے ابو، بس رزلٹ کی ٹینشن ہے، پتا نہیں کیسا آئے۔'' مانو ان سب کے پاس جا کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''اچھا ہی آئے گا رزلٹ، محنتی بچی ہے ہماری، ٹینشن نہ لو۔''

''جی......!'' اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔

''مانو، سب کے لیے چائے بنالو۔'' امی نے دنوں بعد اسے پہلے کی طرح مخاطب کیا تھا۔ مانو کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''جی۔'' وہ ہونقوں کی طرح ماں کو دیکھنے لگی۔ مگر امی کے دوبارہ کچھ کہنے سے پہلے ہی زین بھائی بول اٹھے۔

''طلحہ کا میسج آیا ہے، وہ کافی لا رہا ہے ابھی سب کے لیے۔''

''چلو بیٹا! تمہاری تو چھٹی ہوئی، بیٹھ جاؤ آرام سے۔'' بڑے ابو ہنس دیے۔ مانو تذبذب میں تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہاں بیٹھے یا جائے۔

''مانو! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' امی نے اسے اس مشکل سے نکالا۔

وہ کمرے میں چلی آئی، سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ امی کی بھی ناراضی دور ہوگئی ہے، یا کم از کم، کچھ کم تو ہوگئی ہے، ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا، مانو نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلا دن، طلوع ہوا تو عام سا ہی دن تھا، وہی اور دنوں جیسا مگر صبح ساڑھے آٹھ بجے جب مانو نے ناشتہ بنایا پاپا کو دیا، امی کو دیا، خود کیا، پاپا تو آفس چلے گئے، امی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''جی؟'' مانو نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

''بھائی صاحب اور بھابھی نے تمہارے اور طلحہ کے رشتے کی بات کی تھی۔ اب سب کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں باقاعدہ رسم ادا کر لینی چاہیے۔'' بغیر کسی تمہید کے امی نے بتایا۔

''مگر وہ تو ناراض ہے مجھ سے۔'' بے ساختہ ہی مانو کی زبان پھسلی تھی۔

''وہ ٹھیک ہو جائے گا، اس کی فکر نہ کرو۔'' امی نے عام سے لہجے میں کہا۔

''اور اگر نہ ہوا تو؟ بہت بری طرح منہ بنا ہوا ہے۔'' مانو کے خدشات بے جا نہ تھے۔ طلحہ کا رویہ اگر آگے بھی ایسے ہی روکھا پھیکا اور نظر انداز کرنے والا رہا تو؟ مگر امی اس کے اندیشوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہی تھیں۔

''تمہاری یہ بچوں والی باتیں نہ جانے کب ختم ہوں گی، اب تو بڑی ہو جاؤ۔''

امی کا موڈ خراب ہونے لگا، مانو کا ڈر کے مارے چپکی ہو رہی ہے مگر دل میں نہ جانے کیا کیا کچھ تھا بدگمانی، اندیشہ، ڈر، خوف، بکی اور ہتک کا احساس بھی تھا سب کی طرح وہ بھی ڈانٹ ڈپٹ کر لیتا، کچھ کہہ کر اپنے غصے یا رنج کا اظہار کر لیتا مگر اس طرح چپ کی مار تو نہ مارتا! مانو بہت سنجیدگی سے سوچ رہی تھی، ان چند دنوں میں اس کے اندر تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی۔ لاابالی پن اور لاپروائی کی جگہ تھوڑی سی سنجیدگی نے لی تھی۔ اب وہ سوچنے بھی لگی تھی، ایسی باتیں جنہیں وہ پہلے سرسری سا دیکھ کر ہی گزر جاتی تھی مگر اب وہ رک کر، ٹھہر کر جائزہ لینے اور سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

امی نے کہا تھا کہ لاابالی پن اور غیر سنجیدگی کی ایک عمر ہوتی ہے، اس کے بعد یہ دونوں انداز انسان کو نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔ مانو کے لیے آج کا دن بھی ایک ایسی تبدیلی لایا تھا جس کے بارے میں اگرچہ وہ پہلے سے آگاہ تھی مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اتنا اچانک ہوگا اور اگر پہلے والی بات اور حالات ہوتے تو اسے شاید خوشی ہوتی مگر اس وقت تو خوشی کے احساس سے زیادہ فکر اور پریشانی کے احساسات حاوی تھے، وہ اس وقت کسی بھی اور چیز کے بارے میں سوچنے کے بجائے طلحہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اپنی ناراضی اور خفگی کے ساتھ وہ کیسے اس رشتے کو قبول کرے گا؟'' ایک لمحے کو اس کا دل کانپا مضطرب ہو کر اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے بے اعتنائی برتے یا مجھے ڈی گریڈ کرے، مجھے خود ہی انکار کر دینا چاہیے۔

دماغ میں ایک کوندا سا لپکا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے امی کا خیال آیا، وہ اس کے انکار کو قبول کرنا تو درکنار اہمیت تک نہیں دیں گی۔

"مجھے مما سے بات کرنی چاہیے۔" مانو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی جہاں مما کے سوا کوئی نہ تھا سب گئے ہوئے تھے۔ مما ٹی وی کے آگے چائے کا مگ لے کر بیٹھی مارننگ شو دیکھ رہی تھیں۔ مانو کو دیکھ کر انہوں نے آواز ہلکی کر دی۔

"ناشتہ کر لو مانو......!"

"کر کے آئی ہوں۔" مانو سوچ رہی تھی کہ بات کی شروعات کیسے کرے مگر مما نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

"کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟"

"جی، وہ مما بات یہ ہے کہ......" وہ ایک لمحے کو جھجکی پھر ہمت کر کے بول پڑی۔

"آپ سب میرے اور طلحہ کے رشتے کی بات کر رہے ہیں مگر وہ تو مجھ سے بہت ناراض ہے، بات بھی نہیں کر رہا، اگر وہ اس رشتے سے خوش نہ ہوا تو؟"

"وقتی ناراضی ہے ٹھیک ہو جائے گی، تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔"

مما نے بھی امی والا رویہ اختیار کیا اور ناک سے مکھی اڑا دی۔ ان کا دھیان اور توجہ ٹی وی اسکرین پر تھی جہاں ایک درجن دلہنیں سویرے سویرے مارننگ شو میں اپنے جلوے بکھیر رہی تھیں۔

"میں اس رشتے سے انکار کرنا چاہتی ہوں۔" مانو نے اک دم ہی دھما کہ کیا تھا۔ مما کے ہاتھ سے چائے کا مگ گرتے گرتے بچا۔

"کیا کہہ رہی ہو مانو؟" ان کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھیل گئیں۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" انہوں نے بے حد تشویش اور فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"جی!" مانو کی آواز اور آنکھوں میں نمی تھی۔

"مگر بیٹا کیا بات ہے؟"

"وہ مجھے اچھی لڑکی نہیں سمجھتا اسی لیے ایسے ناراض ہو گیا، میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی مگر آپ کو معلوم ہے میں کوئی بری لڑکی تو نہیں ہوں نا؟" مانو کی آواز بھرا گئی۔ آج سے پہلے اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس مسٹر خواہ مخواہ کی ناراضی اس کم بخت دل کو کتنی ٹھیس پہنچائے گی۔

"افوہ، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہماری مانو بلی، ملکہ جذبات بھی ہیں۔" مسٹر خواہ مخواہ کی شرارت بھری آواز سن کر وہ سچ مچ اچھل ہی پڑی تھی۔

"اوہو، طلحہ تم تو ڈرا ہی دیتے ہو ابھی تک گئے نہیں تم؟ کب جاؤ گے؟"

مما نے بیٹے سے سوالات کرتے ہوئے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز اونچی کی، دلہنوں کے درمیان شادی بیاہ کے گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

بیٹے کا جواب انہوں نے سنا ہی نہیں، جو کہہ رہا تھا کہ۔ "پہلے آپ کی بہو سے دو دو ہاتھ کر لوں، پھر جاؤں گا۔"

"تو تمہیں اس رشتے سے انکار ہے؟" تک سک سے تیار، طلحہ کے وجیہہ چہرے پہ ناراضی اور آواز میں رعب مگر دونوں مصنوعی۔

"تو تمہیں کون سی پروا ہے اس رشتے کی؟ یہ کوئی زبردستی کے معاملات تو نہیں ہوتے۔" مانو بیگم آج سچ مچ ملکہ جذبات ہی بنی ہوئی تھیں۔

"سچ کہا تھا دعا بی بی نے، تمہیں جینے کے سارے حقوق حاصل ہیں اس لیے تمہارے لیے یہ کہنا آسان ہے، تم تو اسے بھی یہی صلاح دے رہی تھیں کہ انکار کر دو۔"

"مگر اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی اس لیے میں نے کہا تھا۔" مانو نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"مگر تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہو رہی ہے جو منع کر رہی ہو، کیا میں بڈھا ہوں، چار بچوں کا باپ ہوں؟" طلحہ با قاعدہ لڑنے کے موڈ میں تھا۔

"مگر تم مجھ سے ناراض تو ہو، کتنے دنوں سے بات بھی نہیں کی۔"

"ناراض تھا تو تم منا نہیں سکتی تھیں! گانے نہیں

آتے تو کوئی شعر ہی سنا دیتیں روٹھنے منانے کا، توبہ توبہ اتنے دنوں سے ناراضی کی ایکٹنگ کرتے کرتے میں تھک گیا مگر تم؟ ایک نمبر کی ڈفر لڑکی تمہیں تو ڈھنگ سے محبت بھی نہیں کرنی آتی۔"

طلحہ نے دزدیدہ نظروں سے ذرا فاصلے پہ صوفے پہ براجمان والدہ محترمہ کو دیکھا جو دلہنوں کے جلوؤں اور گانوں میں بری طرح غرق تھیں۔

"محبت؟ یہ کہاں سے آ گئی بیچ میں؟" مانو نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"تو اور کیا ہے ہمارے بیچ؟ یہی تو ہے۔"

"افوہ، یہ مسٹر خواہ مخواہ بھی بس۔" سردی میں بھی مانو کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

"شکر ادا کرو، اتنا قابل، سمجھ دار اور ہینڈسم لڑکا مل رہا ہے۔" مانو کی خاموشی پر وہ اور شیر ہوا۔ مانو کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب کہاں جا رہی ہو؟"

"شکر ادا کرنے۔" جاتی ہوئی مانو نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

☆☆☆

بے چاری سہیلیاں، محبت کی ماری، فکر مند ہوتے ہوتے بالآخر اس کے گھر ہی پہنچ گئیں۔

"نہ کالج آ رہی ہو، نہ فون پہ رابطہ، تم آخر ہو کہاں؟" کومل سمیت سب کی سب نے ایک ساتھ گھر پہ دھاوا بول دیا تھا۔ سوائے الشبہ کے سب ہی تھیں۔

"دراصل......" مانو کو چند سیکنڈز لگے تھے ہچکچانے میں، پھر اس نے ساری بات بتا دی تھی سچ بولنا ابتدا میں مشکل تو بہت لگتا ہے مگر یہ انسان کو ہلکا پھلکا بھی کر دیتا ہے، چاہے دیر سے ہی سہی مگر فائدہ پہنچاتا ہے نقصان نہیں۔

"الشبہ نے بتایا تھا مگر تم چھوڑو، اس کی عادت تو ہم سب جانتے ہی ہیں اور رہی یہ زین بھائی والی بات تو یار، تم پہلے بھی اگر بتا دیتیں تو کیا ہم الشبہ کی طرح بی ہیو کرتے تمہارے ساتھ؟ جانتی نہیں ہو ہمیں۔" لائبہ نے بہت خلوص سے کہا تھا۔ مانو کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"اچھا بس، اب جو ہو گیا سو گیا، یہ بتاؤ کالج کب آ رہی ہو؟" سارہ نے سوال کیا۔

"بس بہت جلد آؤں گی۔" مانو نے طلحہ کے بارے میں بھی انہیں بتایا تھا سب کی سب اس کی تصویر دیکھ کر ہائے اور واؤ کر رہی تھیں کہ منا ہل نے اپنا موبائل آن کیا۔ "بادولت بھی خیر سے منگنی شدہ ہونے والے ہیں اور میرے جیسا فیانسی کسی کا بھی نہیں ہے، یہ دیکھو۔" اس نے فخریہ انداز میں اسکرین سامنے کی سانولی رنگت عام سے خدوخال والا لڑکا تھا۔ مانو نے ایک نظر دیکھا اور دیکھتے ہی عادت کے مطابق فوراً بولی۔

"جی نہیں، میرے......" بولتے بولتے مانو ٹھہر گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو، تمہارے فیانسی جیسا اور کوئی نہیں، اتنا اچھا تو وہ بھی نہیں ہے مسٹر خواہ مخواہ!" مانو مسکرائی۔

"نام تو بہت اچھا رکھا ہے۔" سب کی سب کھلکھلا اٹھیں۔

"تم سب کا آنا مجھے بہت اچھا لگا سچ میں۔" مانو نے خلوص دل سے کہا۔

''ہمیں بھی بہت اچھا لگے گا جب آپ ہمیں منگنی کے بعد ٹریٹ دیں گی۔'' کومل نے بے حد تمیز سے کہا۔

''خدا کے واسطے، اب ٹریٹ وریٹ کا نام مت لو میرے سامنے۔'' مانو نے بے اختیار ہی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے، جو ایک بار پھر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

الوینہ بھابھی نے مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا۔ مانو کو بہت خوشی ہوئی ساتھ ساتھ شرمندگی کا احساس بھی تھا۔

''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟''

''ناراض ہوتی تو تمہیں فون کر کے مبارکباد کیوں دیتی۔'' الوینہ کی ہنسی بتا رہی تھی کہ وہ واقعی ناراض نہیں ہیں۔

''سچ میں؟'' مانو نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

''سچ مچ۔'' الوینہ بھابھی نے دونوں لفظوں پہ الگ الگ زور دیا۔

''پھر تیار ہو؟ منہ میٹھا کرنے آرہے ہیں ہم۔''

''آپ بھی مہمان بن کر آئیں گی؟ ہماری طرف تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' مانو نے ایک سرد آہ بھری۔

''چلو تمہاری طرف سے آجائیں گے، اب خوش۔''

''جی!'' مانو کو سچ مچ بہت خوشی ہو رہی تھی، شکر ہے کہ الوینہ بھابھی ناراض نہیں ہیں، کتنے پیار سے بات کر رہی تھیں۔ اب کوئی بھی خفا نہیں ہے اس سے سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا ہے۔ مانو جھوم جھوم گئی۔

''مگر اب مانو ہی پہلے جیسی نہیں رہی۔'' اندر سے کوئی چپکے سے بولا۔

☆☆☆

بڑے سے لاؤنج میں تھوڑی دیر پہلے بڑا ہنگامہ بپا تھا۔ سب لوگ جمع تھے خوب ہلا گلا تھا، ہنسی مذاق اور شور شرابے میں، مختلف تبصرے کرتے ہوئے، سب نے باری باری مانو اور طلحہ کو مٹھائی کھلا دی تھی۔ خلاف توقع طلحہ بڑی شرافت اور سنجیدگی سے بیٹھا تھا۔ ساری شوخی اور چلبلا پن بردباری میں سمٹا ہوا تھا۔ مانو کو تو امی نے سختی سے تاکید کی تھی، خبردار جو وہاں بیٹھ کر پٹر پٹر کی، خاموشی سے بیٹھنا لہٰذا سامنے آتی جاتی امی کی گھوریوں سے سٹپٹا کر وہ سر جھکائے ہی بیٹھی رہی۔

پھر باربی کیو کا اشتہا انگیز دھواں، نرم گرم مٹن پلاؤ کی مزے دار خوشبو، گاجر کے حلوے کی سوندھی سوندھی مہک چاروں طرف پھیلنے لگی تھی۔ سب کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مانو اور طلحہ کے لیے بھی آگے رکھی ٹیبل پہ کھانا سج گیا، مگر طلحہ صاحب تو پہلے ہی اپنے بھائیوں اور کزنز صاحبان کے ساتھ پلیٹیں بھر کے شروع ہو گئے تھے اور مانو کسی اور چکر میں تھی۔ سب کو کھانے میں مگن دیکھ کر اس نے چپکے سے موبائل پہ پہلے اپنی سیلفیاں لیں پھر میز پہ سجے کھانوں کی تصاویر اتاریں۔

''زندگی کا سب سے خوب صورت اور یادگار دن۔'' وہ ٹائپ کرنے لگی۔ کتنے ہفتوں بعد وہ اپنی سیلفیز اور دوسری پکس، پوسٹ کرنے والی تھی۔

''سادگی میں بھی کیا حسن ہے، واہ!'' اپنی سیلفیز کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے خود بھی اپنے آپ کو سراہا۔ ویسے آج سارے مہمانوں کا تبصرہ یہی تھا۔ جائزہ لیتے لیتے کچھ پرانی پکس اور سیلفیز بھی نظروں سے گزریں تو ٹھٹک گئی۔ جانے کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔ ہوٹل میں ڈنر سے پہلے اور ڈنر کے وقت کے کتنے ہی مناظر موبائل میں محفوظ تھے۔ انہیں دیکھتے دیکھتے امی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔

''اپنے بارے میں گھڑی گھڑی کی خبر سارے عالم میں نشر کرنا حماقت اور وقت کا زیاں ہے۔ اپنی خوشی اور اپنے غم اپنے خیر خواہوں سے شیئر کرو اور بس۔''

مانو نے کچھ سوچتے ہوئے موبائل آف کر کے رکھ دیا اور دھواں اڑاتے سیخ کباب کی پلیٹ ہاتھ میں اٹھا لی۔

☆

عندلیب زہرا

زندگی کے نئے راستے

رات کا فسوں رفتہ رفتہ حاوی ہو رہا تھا۔
ہر شے پر......
ہر ذی روح پر......
اس لیے تو اس کے شہر سے پناہ طلب کی گئی ہے۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ ایک تناؤ بھری خاموشی......ناراضی کا لبادہ اوڑھے۔

"آپ کتنے دن سے مجھ سے خفا ہیں۔ میری جانب نہیں دیکھتیں......مجھ سے بات نہیں کرتیں۔"

وہ ان کی گود میں سر رکھے رو رہا تھا۔ بچوں کی طرح...... بلک بلک کر۔

صبغہ کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ کبھی نہیں روتا تھا، شاید بچپن میں بھی اس طرح رویا ہو۔ صبغہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

شدت غم میں بھی اس کی آنکھوں میں نمی آجاتی۔ سنہری پیالے گلابی سے ہوجاتے۔ چہرے کی گندمی رنگت سرخی میں بدل جاتی۔ آنکھوں میں آنسو نکلنے سے پہلے ہی وہ آستین سے چہرہ صاف کرتا۔

''مرد روتے نہیں ہیں ناں۔'' سامنے والے سے زیادہ وہ خود کو باور کرواتا۔

باپ کی عدم موجودگی میں پروان چڑھنے والے بچے شاید وقت سے پہلے مضبوط ہوجاتے ہیں۔ اب جو اسے روتے دیکھا تو صبغہ کا دل پگھل گیا اور ناراضی بھاپ بن کر تحلیل ہوگئی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا ارحم؟'' لہجہ دکھی تھا۔

''ماموں کا نہیں سوچا؟ ماں کا بھی نہیں......''

ساری ممتا اس ایک ہاتھ میں سمٹ آئی تھی جو ارحم کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

ارحم نے سر مزید جھکا لیا تھا۔

''آفرین گھر کی بچی ہے۔ تم ایک بار پھر سوچو بیٹا۔'' صبغہ ہار نہیں ماننا چاہتی تھیں۔ اس لیے ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔

ممتا کا...... ناراضی کا...... جذباتی ہتھکنڈے۔

''نہیں ماما! مجھے آپ سب سے محبت ہے۔ آفرین سے ہمدردی ہے۔ لیکن میری زندگی میں صرف علینہ آئے گی۔''

اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور ماں کے ہاتھوں پر پیار کرکے باہر نکل گیا۔

''یہ اپنے باپ کی طرح ہے...... بے مہر اور کٹھور۔''

صبغہ نے تلخی سے سوچا۔

ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ عکس بن رہے تھے اور مٹ رہے تھے۔ جب انہوں نے خود کو دھوپ سے نہائے کھلے آنگن میں محسوس کیا۔ کچھ مانوس رشتوں کی آوازیں سنیں۔

☆☆☆

غلام مصطفیٰ کو اپنے دوست الٰہی بخش کی دوستی پر فخر تھا۔ غلام مصطفیٰ کو الٰہی بخش کی بیٹی گڑیا بہت پسند تھی بلکہ اسے بیٹیاں پسند تھیں۔

باپ کی آمد پر پانی کا گلاس رکھتی۔ گھر میں پہنے کے سلیپر لاکر رکھتی۔ باپ کے کندھے دباتی۔ اپنے لاڈ اٹھواتی۔ اس کا دل بڑا خوش ہوتا جب بھی وہ اپنے دوست کے گھر آتا۔

دس بارہ سالہ گڑیا باپ کے دوست کی حیثیت سے اس کی عزت کرتی۔

''چاچاجی! چائے پی لیں۔''

''زردہ کھا کر دیکھیں......'' اس کی بات چیت میں شوخی بھی ہوتی اور تدبر بھی۔ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ایسے میں اسے اپنا کھڑوس بیٹا مزید کھڑوس لگتا۔ اکلوتا تھا......

سو میاں بیوی کی آنکھوں کا تارا بھی تھا۔ عجیب کھردرے مزاج کا تھا۔ اپنی دنیا تھی۔ کالج...... کتابیں...... دوست...... بائیک۔

''رفعت! گھر کی رونق تو بیٹیوں سے ہوتی ہے ناں۔ دیکھو الٰہی بخش کے گھر میں کتنی رونق ہے۔'' وہ جب دوست کے گھر سے آتا یہی کہتا۔

گڑیا نے میٹرک کیا تو الٰہی بخش خود مٹھائی لے کر گیا۔ اب ان پر مبارک باد لازم تھی اور اس خوش کن ماحول میں غلام مصطفیٰ نے وہ بات کہہ دی جو برسوں سے اس کے دل میں تھی۔ رفعت حیران ہوئی لیکن موقع ایسا تھا کہ خاموشی بھلی تھی۔ تاہم الٰہی بخش اور اس کی بیوی نے اس بات کا خیر مقدم کیا تھا اور غلام مصطفیٰ نے گڑیا کے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھ کر بات پکی کردی تھی۔

☆☆☆

گھر آکر اسے بیوی کی خاموشی کا احساس ہوا۔

''آپ نے بیٹے سے پوچھ لیا ہوتا تو زیادہ بہتر

تھا۔" بیٹے کے مزاج سے واقف تھیں، سو کہہ دیا۔
"میرا بیٹا میرا مان رکھے گا۔" باپ کے لہجے میں فخر تھا۔ غرور تھا۔ فیض علی نے پہلے حیرت اور بے یقینی سے مٹھائی کو دیکھا اور پھر طیش سے کھڑا ہو گیا۔
"کیوں ابو...... کیوں...... میری سوچ میں ابھی شادی نہیں ہے اور اس ماحول میں تو بالکل نہیں ہے۔" وہ باپ کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ سانولی فربہی مائل گڑیا کبھی قابل توجہ نہ لگی تھی۔
"تمہیں گڑیا پر اعتراض ہے یا شادی پر......"
باپ کے ٹھنڈے لہجے پر وہ ایک لحہ رُکا۔
"دونوں پر......" اس نے بے مروت انداز میں کہا۔
"تم خود انتخاب کرو گے، باپ کی موت یا گڑیا سے نکاح۔"
فیض نے سرخ آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ باپ بیٹے کی جنگ میں باپ کی بلیک میلنگ، ماں کے آنسو جیت گئے تھے۔

☆☆☆

دلہن بنی گڑیا پر بہت روپ آیا تھا۔ سب کزنز اور سہیلیاں اس پر رشک کر رہی تھیں۔ جسے گھر بیٹھے اتنا اچھا رشتہ مل گیا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ فیض علی بہت قابل اور خوبرو تھا۔ غرور اس پر بجتا تھا۔
"جمیلہ کو بیٹی کے لیے چار سیڑھیاں بھی نہیں اُترنی پڑیں۔" کنول پھوپھو نے کہا۔ جنہیں اپنی بیٹی کے لیے دو سال سے مناسب بر نہیں مل رہا تھا۔ غرضیکہ دونوں فریقین نے شادی کو یادگار بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔
حجلۂ عروسی بہت خوب صورتی سے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ فیض علی رات گئے، مارے باندھے آیا۔ اب یہ رشتے کی خوب صورتی تھی، ماحول کا فسوں یا ماں کی نصیحتیں...... جو وہ بے دلی سے سہی لیکن گڑیا کو قبول کر بیٹھا۔
بمشکل چند دعوتیں نمٹا کر فیض علی نے گڑیا کو میکے بھیجا اور عذر یہ رکھا اسے ایک ضروری انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ عُذر قابل قبول تھا۔ بس فیض علی واپسی کا راستہ بھول گیا۔
سب کا انتظار لا حاصل ٹھہرا۔ کسی دوست نے بتایا وہ رات کی فلائٹ سے یورپ چلا گیا ہے۔ کب ویزا آیا، تیاریاں کیں...... اس نے کسی کو خبر نہ ہونے دی تھی، اپنے دل کے راز کی۔
سب اپنی جگہ ساکت وصامت تھے۔
رفعت کی آنکھوں میں گلہ تھا...... شوہر کے لیے۔ تنفر تھا...... اس لڑکی کے لیے جو اس جدائی کا باعث تھی اور غلام مصطفیٰ سب سے نظریں چرا رہا تھا۔
زبردستی کے فیصلے یوں ہی ہوتے ہیں۔
گڑیا گومگو کیفیت میں تھی اس کے گھر والے متذبذب۔ آخر فیض علی کی جانب سے آنے والے خط نے سب کے سوالوں کے جواب دے دیئے۔
"آپ کی بیٹی صبغہ کبھی میری آئیڈیل نہیں رہی۔ جاہل...... گنوار......" یہ سطریں بھیگی آنکھوں کے ساتھ صبغہ بار بار پڑھتی۔
ان کی برادری میں طلاق معیوب سمجھی جاتی تھی۔ موت کے مترادف...... سو اب صبغہ کا نصیب یہ ہی تھا۔
وہ سسرال میں رہتی...... ان ہی دنوں وہ امید سے ہوئی۔ سب کو حالات میں بہتری نظر آنے لگی۔
لیکن نہ جانے کیسا کٹھور دل پایا تھا۔ بیٹے کی پیدائش...... ماں باپ کی موت بھی اسے واپسی کا راستہ نہ دکھا سکی۔
صبغہ چپ چاپ سامان سمیٹ کر میکے آ گئی۔ بھابیاں اچھی تھیں کیونکہ وہ خود امن پسند اور نیک فطرت تھی۔
ارحم اس کی زندگی کا محور تھا۔ جس کے نین نقش اپنے باپ جیسے تھے۔
وہ سہاگن تھی، لیکن اس کی زندگی کسی بیوہ کی طرح بے رنگ تھی۔ کسی مطلقہ کی طرح، وہ لوگوں کے سوالوں کا سامنا کرتی۔

چھوٹے بھائی عرفان نے سب سے پہلے اس کے حالات کا ادراک کیا اور گھر میں صبغہ کے نکاح ثانی کی تجویز دی۔

''بے غیرت...... بے شرم...... تیری بہن اس کے نکاح میں ہے۔'' غیض وغضب سے باپ کانپ رہا تھا۔

''وہ شخص جو پانچ برس سے غائب ہے۔ اپنی دنیا بسائے بیٹھا ہے۔'' بھائی نے حقارت سے سرجھٹکا۔

''میری شرم وحیا والی بیٹی مجھ پر بوجھ نہیں ہے پتر۔'' الٰہی بخش نے دعوا کیا اور بیٹی کے نام جائیداد کر کے اپنے تئیں اسے مضبوط بنا دیا تھا۔

''آپا! میری نیت بری نہیں ہے۔'' عرفان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے لیے فکر مند، محبت کرنے والے بھائی کو دیکھتی رہی۔ جس کی آنکھوں میں آنے والے حالات کے خدشات تھے۔

اس نے محبت سے بھائی کی پیشانی پر پیار کیا۔

''ارحم باپ کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی کھو دے گا۔'' اس نے کہا۔

عرفان خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا...... اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر چلا گیا۔ وہ چپ چاپ ہلتے پردے کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وقت کبھی نہیں تھم سکا۔

چپ چاپ...... بنا آہٹ کے...... وہ چلتا رہتا ہے۔ عمر کے قیمتی سال وقت کی بے رحمی کی نذر ہو گئے۔

ماں باپ گزر گئے...... سب کی اپنی زندگی تھی۔ صبغہ ارحم کے ساتھ وقت گزارتی۔ اپنے ہی والدین کے گھر میں احسان مند ہو کر...... دب کر۔

بھابھیاں اچھی تھیں کیونکہ وہ ان پر بوجھ نہ تھی۔ وہ دیکھتی کس طرح بڑی بھابھی استحقاق سے کچن میں ناشتا بناتیں۔ مالکانہ حقوق کے ساتھ رہتی تھیں۔

چھوٹی بھابھی شوخ تھیں، بھائی کی پسند...... بارش کے موسم میں ڈیک لگا کر جھوم جھوم کر موسم انجوائے کرتیں۔ آئے دن پکنک کے پروگرام بناتیں۔

شوہر کے دیئے تحائف سب کو دکھاتیں۔

''شوہر کا گھر اور اس کی محبت بھی نعمت ہے۔''

بیاہی مجبور بیٹیاں...... میکے میں یوں ہی اجنبی بن جاتی ہیں۔ سمجھوتا...... جبر...... صبر یہ اسباق تھے جو صبغہ کے نصیب میں تھے۔

☆☆☆

آفرین بڑے بھائی کی بیٹی تھی۔ اس کی پرورش و تربیت صبغہ نے کی تھی۔ وہ شکل و صورت...... عادات...... مزاج میں پھوپھو کا عکس تھی۔ عموماً لوگ اسے صبغہ کی سگی بیٹی سمجھتے تھے۔ ارحم ہمیشہ اس لاڈ پیار سے خار کھاتا۔

''میری ماما پر قبضہ مت کرو۔ بھولن دیوی۔'' وہ چڑ کر کہتا لیکن دونوں میں دوستی بھی خوب تھی۔ اکٹھے مار کھاتے۔ شرارتیں کرتے۔ لیکن آفرین کا پلڑا بھاری تھا کیونکہ وہ گھر کی اکلوتی بیٹی تھی جس نے ہمیشہ محبتیں...... کامیابیاں اور خوشیاں سمیٹی تھیں۔

☆☆☆

''بارش کی کن من...... سرمئی بادلوں کا رقص۔ برستے موتی......'' ارحم کے ہاتھ اس کی ڈائری لگی تھی۔ سو اب مذاق کے موڈ میں تھا۔

''فواد کا فون آیا تھا ناں۔ اس لیے یہ رومانٹک شاعری ہو رہی ہے۔'' اس نے شرارتی نظروں سے دیکھا۔

''ادھر دو...... واپس کرو مجھے۔'' وہ نظریں چراتی ہوئی، شرمائی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ سب کو دکھاؤں گا۔'' اس نے ڈائری لہرائی اور باہر بھاگ گیا۔

فواد...... آفرین کا کزن تھا۔ ماموں زاد اور بچپن کا منگیتر بھی۔ بی اے کے فوراً بعد دونوں کی شادی طے تھی اور آج کل تیاریاں عروج پر تھیں۔

فواد آسٹریلیا میں تھا اور اس ماہ اس کی آمد متوقع تھی۔ صبغہ نے سونے کے دو سیٹ بنوائے تھے آفرین کے لیے۔ عرفان بھی باہر سے شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ جب فواد کے گھر والوں پر اچانک خاموشی طاری ہوگئی اور آخر فواد نے خود فون کر کے شادی سے انکار کر دیا۔

"میں یہاں شادی کر چکا ہوں۔" اس نے سکون سے کہا اور کال منقطع ہوگئی۔

سب ساکت رہ گئے...... اور پھر ایک طوفان تھا جو تھم نہیں سکا۔ ماموں کو انجائنا کا اٹیک ہوگیا تھا۔ خونی رشتوں میں دراڑ آ گئی تھی۔

جب صبغہ نے بھائی سے کہا کہ آفرین کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہے۔ بھائی کی آنکھوں میں بے یقینی اور پھر تشکر آ گیا۔ ایک دم گھر کی فضا بدل گئی۔

ارحم کو علم ہوا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"ماما! میری علینہ سے کمٹمنٹ ہے۔ آپ کو سب پتا ہے پھر بھی......" اس نے دکھ سے ماں کو دیکھا۔

"آپ نے احسان کا بدلہ اتارنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔ واہ......"

"کیا میں تم پر کوئی حق نہیں رکھتی بیٹا؟" اس نے دکھ سے کہا۔

"آپ...... بلکہ کوئی بھی شخص میری زندگی پر حق نہیں رکھتا۔" اس لمحے وہ کٹھور لگ رہا تھا۔ سنگ دل اور بے مہر...... صبغہ خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ بنا کوئی لفظ کہے...... اور پھر ناراضی کا پیرہن اوڑھ لیا۔

☆☆☆

ماضی کی دھوپ سمٹ کر ملگجے اندھیرے میں تبدیل ہوگئی تھی اور صبغہ کے کمرے میں براجمان اندھیرا ماحول کو بوجھل کر رہا تھا۔

"یا اللہ...... خیر کرنا...... رحم کرنا۔"

صبغہ نے نماز کے لیے نیت باندھ لی۔

پہلے گھر کی فضا میں صدمہ تھا۔ اب تناؤ اور سکوت......

آفرین کو بھی ساری صورت حال کا علم ہوا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔ ایک مرد نے اسے ٹھکرا دیا۔ دوسرا بے زاری کا اظہار کر رہا ہے۔

باپ دل کا مریض...... لوگوں کی نظریں...... سوال...... لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

حالات جس بھی نہج پر جائیں اس کا فیصلہ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ اس نے کچھ دن سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

آفرین کو شروع سے سردیاں پسند تھیں۔ نرم گرم دھوپ...... میٹھے لذیذ مالٹے اور سفید مولیوں پر چاٹ مسالا چھڑک کر کھانا۔ وہ اور ارحم مل کر مزے کرتے۔

علینہ کے متعلق بھی اس نے سب سے پہلے آفرین کو بتایا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی ماضی کے پل پار کر رہی تھی۔ پورشن میں سناٹا تھا۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی، صبغہ منہ لپیٹے لیٹی تھیں۔ بھائی سے شرم سار۔ بیٹے سے نالاں۔

"پھوپھو......" اس نے آواز دی۔

صبغہ نے اس کی آواز سنی تو ایک دم اٹھ بیٹھیں۔

"میری بچی......"

"پھوپھو! میری بات سنیں۔" اس نے صبغہ کے دونوں ہاتھ تھام کر کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں ناں۔ تو ارحم سے میری شادی مت کریں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ آپ تاریخ دہرا رہی ہیں پھر سے......" اس کی آواز دکھ سے بھرا گئی۔

"میری اور ارحم کی شادی سے آپ سب جڑ جائیں گے۔ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔ لیکن ہمارے دل...... کبھی نہ مل سکیں گے۔ وہ مجھ میں علینہ کو

ڈھونڈے گا اور میں فواد کو یاد کروں گی۔ اس کی بے اعتنائی سہوں گی۔ مجھے دوسری صبغہ نہیں بننا۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ صبغہ دم بخود تھیں۔

''آپ سب کیوں چاہتے ہیں، میں تنہا راتیں گزاروں۔ بے کیف زندگی...... اپنے ہی والدین کی احسان مند ہو کر رہوں۔ ترسی نظروں سے دو بوند محبت کے لیے ارحم کی منتظر رہوں۔ اس کے دل میں علینہ ہے، وہ مرد ہے۔ اس کے لیے بہت سے راستے...... اور میں...... تنہائی سہوں...... آپ کو اپنی زندگی سے بھی سبق نہیں ملا۔'' کمرے میں آفرین کی سسکیاں تھیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے صبغہ کے سامنے۔

صبغہ دم بخود تھیں۔ ان سب نے ان باتوں پر تو سوچا ہی نہ تھا۔

بس معاشرے کا دباؤ...... لوگوں کا خوف......

لاابالی...... کم عمر آفرین نے کیسے ان کے سامنے آئینہ رکھ دیا تھا۔ ہم بڑے کیسی غلطی کر جاتے ہیں ناں...... محض اپنے دل کی خوشی۔ رشتوں کی مضبوطی کے لیے...... بچوں کے دل نہیں راضی...... مزاج نہیں ملتے...... کہیں اور مرضی ہے...... سب کچھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

آفرین واپس چلی گئی تھی۔ لیکن بہت سے دروا کر گئی تھی۔

☆☆☆

ارحم کی شادی ہوئی اور وہیں ہوئی جہاں اس کی منشا تھی۔ آفرین اپنی زندگی کی ناآسودگی کا انتقام کم از کم اپنے کسی بھی پیارے رشتے سے نہیں لے سکتی تھی۔

ارحم...... آفرین کو شرمندہ لگا لیکن اس کے رویے نے سب کے دل سے خدشات دھو دیے تھے۔

ہنستی مسکراتی...... بڑھ چڑھ کر رسموں میں حصہ لیتی اور چٹکلے چھوڑتا ارحم......

علینہ...... ارحم کی زندگی میں محبت بن کر داخل ہوئی تھی اور گھر والوں کے لیے بھی ٹھنڈک بن گئی تھی۔

صبغہ بیٹے کی آنکھوں میں روشن ستارے دیکھتیں تو آفرین کی سوچ ٹھیک لگتی۔ لیکن جب بھائی بھابھی کو پریشان دیکھتیں...... آفرین کی اداس زندگی دیکھتیں تو اپنا آپ مجرم لگتا۔

''شاید ارحم اپنے باپ کی طرح ہے بے مہر...... خود غرض۔'' وہ تلخ ہو جاتیں۔

فواد کی اپنی زندگی سیٹ تھی۔ آفرین کو اپنا پندار عزیز تھا، وہ خود کو سمیٹے ہوئے تھی۔

بعض اوقات ہمیں اپنے سے وابستہ رشتوں کی خاطر اپنے آنسو چھپانے پڑتے ہیں۔ اپنے زخم...... روح کی تنہائی۔

آفرین اس دہری جنگ میں برسرِپیکار تھی۔ لیکن اطمینان تھا کہ تاریخ نے خود کو نہیں دہرایا۔

اس کا سر اٹھا ہوا ہے اور پندار سلامت ہے۔

وہ رات کو فواد کے تحائف، کارڈ کھول کر تادیر ان پر ہاتھ پھیرتی۔ روتی...... لیکن صبح کو وہی آفرین بن جاتی۔ جو تیز تیز بولتی...... کام سمیٹتی...... چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنس پڑتی۔ لاپروا...... من موجی...... غلطیاں کرتی۔ اور شرمندہ ہو جاتی۔

☆☆☆

خزاں کی رُت بیت چکی تھی۔

ننھی سبز کونپلیں سر اٹھا رہی تھیں۔

جو بیت چکا وہ ماضی تھا...... زندگی آگے بڑھنا چاہتی ہے۔

ٹنڈ منڈ درختوں کا بدلتا پیراہن علی الاعلان کہتا۔

خوش گوار ہوا کے ساتھ نیلے آسمان پر تیرتے سفید بادل کے ٹکڑے۔

طبیعت کو ہلکا پھلکا بنا رہے تھے۔

''کب تک اداسی اور تنہائی کو زادِراہ بنائے رکھو گی۔''

وہ ٹیرس پر کھڑی فطرت کو کھوج رہی تھی جب عقب میں ارحم کی آواز سنی۔

یہ طے تھا کہ ارحم کے سامنے وہ خود پر ملمع نہیں

چڑھا سکتی تھی اس نے خود سے اعتراف کیا۔

"جو لوگ زندگی میں شامل نہیں ہو پاتے۔ اصل میں وہ ہمارے مقدر میں نہیں ہوتے۔ ورنہ اسباب بننا شروع ہو جاتے ہیں۔"

"ارحم! ماسٹر ہدایت اللہ مت بنو۔ ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔" اس نے مڑ کر ازلی تنگ مزاجی سے کہا جو ارحم کے لیے مخصوص تھی۔

"ہم سب تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔" ارحم نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں خوش ہوں ارحم!" اس نے بے زاری سے کہا۔

"نہیں ہو خوش۔" ارحم نے افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔

"ترس کھا رہے ہو؟" اس نے ارحم کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ارحم نے گہری سانس لی اور اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کم از کم تمہارے معاملے میں۔ یاد ہے، نانا جان کہتے تھے کہ زندگی رواں دریا ہے۔ ٹھہرا ہوا پانی جوہڑ ہوتا ہے۔ تم نے جرات سے کام لیا اور انکار کیا مجھ سے شادی سے...... (انداز ستائشی تھا)۔

اب ایک اور کارنامہ سر انجام دو۔ فواد کے صدمے سے باہر نکل آؤ۔ آگے بڑھو۔" ارحم ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ اپنے آنسو ارحم سے کبھی نہیں چھپا سکی تھی۔

"آفرین...... ! ہماری خاطر۔" اب کے علینہ کا نرم اور مہربان ہاتھ اس کے کندھے پر تھا۔

"تمہارے پاس کتنے رشتے ہیں، دعائیں ہیں۔ تم خوش قسمت ہو اور میں چاہتی ہوں اتنی خوش قسمت لڑکی میری بھابھی بن جائے۔" علینہ نے اس کے گرد بازو حمائل کیے۔

آفرین نے سر جھکا لیا تھا۔ یہ سچ تھا وہ ماضی سے باہر نہیں نکل رہی تھی لیکن اب وہ تھک رہی تھی۔

وہ اپنے رشتوں کو مزید دکھی نہیں دیکھ سکتی۔

"آپ مجھے سوچنے دیں۔" اس نے لہجے کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

علینہ اور ارحم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا تھا۔

سب خوش تھے...... شہریار، علینہ کا بھائی — بن مانگی دعا جیسا تھا۔

ان سب کی محبت، چاہت، مان...... کچھ بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں تھا۔

بس سب آفرین کے جواب کے منتظر تھے۔

☆☆☆

آفرین سوچوں میں الجھی تھی۔ جب صبغہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"میں نے سوچا، کچھ گپ شپ ہو جائے۔" انداز ہلکا پھلکا تھا۔ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ایک بار تم میرے پورشن میں آئی تھیں، اپنا فیصلہ لے کر۔ میں نے اسے سمجھا، درست مانا اور عمل بھی کیا۔" صبغہ کا انداز دوستانہ تھا۔

"اب میں چاہتی ہوں تم ہمارے لیے یہ فیصلہ مان لو۔ جس میں ہم سب کی خوشی ہے۔

بیٹا! آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ انسانی ضرورت بھی ہے۔ فطرت بھی...... ہمارے سچے، کورے...... شفاف جذبات خود غرض لوگوں کے لیے ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔"

آفرین چند لمحے پھوپھو کا چہرہ دیکھتی رہی خاموشی سے......

"مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔"

اس نے پھوپھو کا ہاتھ تھام کر کہا۔ صبغہ نے اس کی پیشانی پر محبت ثبت کی۔

تکلیف دہ وقت تھا جو گزر گیا تھا۔ اب خوشیاں دائمی تھیں۔ رشتے بنا کسی تلخی کے قائم تھے اور یقیناً ایسا درست قدم ہی کی بدولت تھا جو آفرین نے اپنی آزمائش کے دور میں اٹھا کر بہت سے رشتے بچا لیے تھے۔

☆

عائشہ نصیر احمد

تو ہے وہ خواب

ناولٹ

اس دن خالہ چلی آئی تھیں بنا اطلاع کے۔ ویسے تو خیر یہ ان کی عادت تھی مگر جس کام کے لیے آئی تھیں وہ بھی پیشگی بتانا مناسب نہ سمجھا۔ جب ہی تو اماں کے ہاتھوں کے توتے اڑے ان کی آمد کی غرض سن کر۔

''دیکھ مرقیہ......! تو جانتی ہے یہ فیصلہ میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ اشنہ کے ابا سے بات کرلوں، ابھی تو اشنہ نے میٹرک بھی نہیں کیا۔''

''بس کردو آپا۔'' خالہ کو یہ بات سن کر پتنگے ہی لگ گئے۔ ''جتنا عرصہ اشنہ نے اسکول میں گزارا ہے مجھے تو لگتا ہے بال سفید کر کے ہی میٹرک کرے گی۔ میری بانو کے ساتھ بھرتی ہوئی تھی، کب کا کرلیا اس نے میٹرک۔ اب تو بیاہ کو بھی سال ہونے کو آیا ہے۔'' ہاتھ نچا کر کہتے ہوئے انہوں نے اشنہ کی علمی قابلیت پر بہن کو آئینہ دکھایا۔

اماں نے دل میں بہن اور اشنہ دونوں کو خوب ہی کوسنے دیے پھر چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر ضبط سے بولیں۔

''ہاں تو میں نے کب کہا ہے۔ یہ تو اشنہ کے ابا کی شرط ہے کہ جب تک اشنہ میٹرک نہ کرے۔ اس کا بیاہ نہیں کرنا۔''

اب اگر ڈھنگ کا رشتہ ہوتا تو وہ بھاڑ میں جھونکتیں۔ اشنہ کے ابا کی اس شرط کو کہ یہ بے چارے تو ان کی ایک گھوری کی مار تھے۔ مگر خالہ کا اکلوتا لاڈلا سپوت رفیق! جس کے چہرے پر ہمہ وقت حماقت برستی رہتی تھی۔ بال تیل میں چپڑے رہتے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھرا رہتا تھا۔ اور نزلے کا دائمی مریض تھا۔ اماں نے تصور میں بھی اسے اشنہ کے ساتھ دیکھا تو لرز گئیں۔

''صاف بات کرو آپا......! بہانے نہ بناؤ، یہ تو وہی بات ہوگئی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔''

خالہ شاید گھر سے یہ فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ انکار کی صورت میں بہن سے جھگڑ کر ہی جانا ہے۔
"ارے بھاڑ میں گئی رادھا!" اماں کو بھی غصہ آ گیا۔ "بس کہہ دیا میں نے اشنہ میٹرک کر لے پھر سوچیں گے۔"
"تو میری بھی سن لو آپا! اور لکھ بھی لو، اگر تم نے اشنہ کا رشتہ کہیں اور کیا تو سمجھ لینا تمہاری یہ بہن تمہارے لیے مر گئی۔"
خالہ نے آخری حربے کے طور پر ایموشنل کارڈ کھیلا۔ اماں چند لمحے تو ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس دھمکی کی سنگینی کا اندازہ لگاتی رہیں۔ پھر شاید اس میں کوئی دم محسوس نہیں ہوا تو لاپروائی سے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔
"ہاں...... ہاں دیکھ لیں گے۔"
خالہ پیر پٹختی وہاں سے گئی تھیں۔ اماں جانتی تھیں اب نہ صرف خاندان بلکہ گاؤں بھر میں ان کے خلاف محاذ بنا لیں گی۔ مگر انہیں حقیقتاً کوئی پروا نہیں تھی۔ بھلا صرف ان کی ناراضی کے ڈر سے وہ اشنہ کو کنویں میں دھکیل دیتیں، پھر انہیں یہ بھی اندازہ تھا چند دن ان کے خلاف بول کر، دل کی بھڑاس نکال کر وہ پھر سے آ موجود ہوں گی۔
"ہائیں خالہ کہاں گئیں......" اشنہ جیسے ان کے جانے کے انتظار میں تھی۔ ان کے نکلتے ہی چائے لائی تو ان کی غیر موجودگی پر حیرت کا اظہار کیا۔
"جتنی دیر تو وہ کالی سیاہ چائے بنانے میں لگاتی ہے۔ بوائی سے کٹائی کا موسم آ جائے، مہمان کیا تیرے جو شاندے کے لیے بیٹھے رہیں گے۔" اماں نے ادھر کا غصہ ادھر نکالا۔
"کیا اماں...... کٹورے بھر بھر کے ملائی نکالو گی تو ہو گی ناں چائے کالی۔ اب کیا بیوٹی کریم لگا کے چائے گوری کروں۔" اس کے بھی منہ میں گز بھر زبان تھی خیر سے۔
"جتنی زبان چلاتی ہے۔ اتنا دماغ بھی چلایا ہوتا تو آج تیری خالہ مجھے تیری نالائقی کے طعنے نہ مارتی۔" اماں نے قہر آلود نگاہوں سے اسے گھورا۔
"خالہ کو میری کون سی نالائقی نظر آ گئی۔" اس نے حیران ہو کر کمر پر ہاتھ رکھے۔
"ہاں...... ہاں...... تو تو بڑی علامہ ہے۔ باپ کا نام روشن کر دیا ہے۔ پنڈ کے سارے بچے تجھ سے ہی تو پڑھنے آتے ہیں۔ ایک میٹرک تو کیا نہیں جاتا اور کہتی ہے کون سی نالائقی۔" اماں کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا اس کی بے نیازی پر۔
"چھوڑ نا اماں۔ میٹرک کر کے بھی میں نے کون سا افسر لگ جانا ہے۔" وہ عاجز آ گئی۔ پچھلے دو سال سے مسلسل سپلیوں کے باعث وہ میٹرک میں اٹکی ہوئی تھی۔ ذہن تو کافی زرخیز تھا مگر خدا جانے پڑھائی میں کیوں نہ چلتا۔
"یہ بتاؤ...... خالہ اتنی جلدی کیوں چلی گئیں؟" خالہ کے لیے لائے گئے کپ سے ایک گھونٹ بھرتے ہی اسے پھر سے خالہ کی یاد آئی۔ اور ساتھ ہی برا سا منہ بنا کے کپ واپس بھی رکھ دیا۔ اب خالہ ہوتیں تو یہ کنگ سائز کپ خالی کر کے ایک اور کی فرمائش کرتیں اور وہ سوچ رہی تھی۔ "ٹھیک کہتی ہے اماں! اب سے چائے بناؤں تو ملائی الگ سے ڈالا کروں گی۔"
"تیرے رشتے کے لیے آئی تھیں۔" بیزاری سے جواب دیتے ہوئے اماں کو سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا سو دوپٹا اٹھا کر سر پر باندھا۔
"ہائے میں مر گئی۔" اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مذاق تو نہیں کر رہی اماں۔"
"تو کیا میری سہیلی ہے جو میں تجھ سے مذاق کروں گی۔ تیرا میرا مذاق ہے؟" خالہ سے جھڑپ کے بعد یہ تو طے تھا کہ اماں نے اب سارا دن مرچیں چبائے رکھنی تھیں۔
"خالہ بھی حد کرتی ہیں۔ میرا رشتہ مانگنے سے پہلے فیکے کو تو دیکھا ہوتا۔" اس نے سر جھٹکا۔ یہ بات تو اماں خود بھی مانتی تھیں مگر اس وقت اس کے منہ سے سن کر انہیں نجانے کیوں اتنا برا لگا کہ تڑپ ہی گئیں۔
"کیوں ...... کیا خرابی ہے میرے بھانجے

میں، تھوڑا بھولا ہے۔ آج کل کے لڑکوں کی طرح چالاک اور چلتر نہیں ہے۔ اور تیرے پاس ہے کیا سوائے اس بوتھی کے، میرے بنائے گئے حلوے مانڈے تیری استانیوں تک نہ پہنچے ہوتے تو بیٹھی رہتی ابھی تک پہلی جماعت کے بچوں کے ساتھ تختیاں لکھتی۔''

''اف اماں...... میں چٹی ان پڑھ بھی ہوتی ناں...... تب بھی نہ کرتی اس بھوندو سے شادی۔'' وہ آگ بگولہ ہوئی۔ ''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے تمہاری باتیں سن کر، کہیں تم نے کہہ تو نہیں دیا۔ اشنہ میٹرک کرے پھر تیری......'' اس کی رنگت زرد ہوئی، کچھ اماں کے تیور اور کچھ اس خدشے سے۔

''اگر ایسا ہوا ناں اماں تو قسم کھاتی ہوں۔ جب تک میرے سر پر ایک بھی بال کالا ہے تب تک یہ میٹرک نہیں کرنے کی۔''

''چل دفع ہونی...... رقیہ نے کم دماغ خراب کیا جواب تو آکر مغز چاٹنے لگی ہے۔ میٹرک نہیں کرے گی۔'' اماں نے بھر کر اس کی نقل اتاری۔ ''تو ویسے بھی جب تک زندہ ہے یہ کام نہیں کرے گی۔ تیرا میٹرک کا یہ سرٹیفکیٹ تیرے ساتھ ہی قبر میں دفناؤں گی، یاد رکھیں۔''

اماں نے غصے میں آکر پھچے سے سر سے بندھا دوپٹا اتار دیا تھا۔ وہ چند لمحے انہیں تکتی رہی پھر روہانسی ہو کر باہر نکل گئی تھی اور اماں لیٹ کر تھکن زدہ انداز میں اپنا سر دبانے لگی تھیں۔

☆☆☆

''گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا...... میں تو گیا مارا...... آکے یہاں اے۔''

برآمدے میں بچھی چارپائی پر دراز ٹانگ پر ٹانگ رکھے اور چہرے پر رکھا کیپ ذرا کھسکا کر وہ اسے سامنے کھڑا دیکھ چکا تھا جب ہی دھیرے سے اپنی خوب صورت آواز میں گنگنانے لگا تھا۔ مگر اگلے ہی پل تڑپ کر سیدھا ہونا پڑا جب اس نے افشی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اس ویلے نے تو شیدے اور بالے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ بھی اسکول کے گیٹ اور گلی کے نکڑ پر تب ہی آتے ہیں جب چھٹی ہو اور لڑکیوں نے گزرنا ہو۔ یہ تو سویر کی گاڑی سے جاتا ہے اور شام کی گاڑی سے واپس آجاتا ہے۔''

''بس کر دے، ممانی نے کپڑے بھجوائے تھے، وہی لایا تھا۔'' افشی کھلکھلائی۔

''ہاں شام کو واپس جائے گا اور کل جب دوبارہ آئے گا، کہے گی ممانی نے ناشتے میں آلو کے پراٹھے بنائے تھے وہی لایا تھا۔'' اشنہ کا منہ بنا۔

''اوئے دیہاتن...... تجھے کیا تکلیف ہے۔'' وہ چڑ کر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کر ہی گیا۔

''اپنی پھپھو کے گھر آتا ہوں تو کیوں جلتی ہے۔''

''توبہ...... جلتی ہے میری جوتی۔'' تپ کر کہتے ہوئے اس نے زمین پر پیر بھی پٹخا اور کراہ کر رہ گئی۔ ننگے پیر تھی زمین پر کوئی نوکیلا کنکر گہرائی تک چبھا۔

''دیکھا...... چل گئی ناں۔'' وہ ہنسا۔

''ہونہہ...... چل افشی لسی دے مجھے...... کڑھی بنانی ہے آج۔'' اس نے افشی کو دھکیلا۔

''ارے واہ کڑھی۔ ایک ڈونگہ ادھر بھی بھیج دینا۔ پکوڑے شکوڑے ڈال کے۔'' اس کے منہ میں سنتے ہی پانی بھر آیا۔

''کیوں...... کس خوشی میں۔'' وہ رک کر آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورنے لگی۔

''میری پھپھو کے ڈنگروں کی بدولت ملنے والی لسی سے کڑھی بنائے گی۔ اس میں کچھ ہمارا حصہ بھی بنتا ہے کہ نہیں بنتا۔'' وہ مسکراہٹ چھپائے صرف اسے چڑانے کو جتا کر بولا تھا۔ اس کا چہرہ حقیقی غصے سے سرخ پڑ گیا۔

''نہیں بنتا۔ پہلے بھیج دیتی مگر اب نہیں بھیجوں گی۔ بول دے اپنی پھپھو کے ڈنگروں سے دودھ کی جگہ کڑھی دیں۔''

''توبہ ہے، سوتنوں کی طرح لڑتے ہو تم دونوں۔ چل اندر۔'' افشی نے جھنجلا کر اسے بازو سے

پکڑ کر کھینچا تھا۔ اشہد مسکراہٹ لبوں میں دبائے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

شام کو جب اسے یاد نہیں تھا اور کوئی توقع بھی نہیں تھی، وہ اظہر کے ساتھ پتنگ اڑا کر نیچے آیا تو وہ واقعی کڑھی کا ڈونگہ لیے موجود تھی۔ اشہد چونکا تھا۔

"دیکھ لو افشی ......! تم ایویں اپنی پڑوسن کی اتنی برائیاں کرتی رہتی ہو۔ اتنی اچھی تو ہے بے چاری...... میری دوپہر کی بات اب تک یاد رکھی ہوئی تھی۔" اس نے قریب آکر ڈونگے پر سے ڈھکن ہٹانا چاہا اشنہ نے بے اختیار اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"دور ہٹ...... تیرے لیے نہیں لائی۔ خالہ جی کو پسند ہے۔ ان کے لیے لائی ہوں اور افشی تو میری کون سی برائیاں کرتی رہتی ہے؟" اسے اچانک ہی دھیان آیا کہ اشہد نے کیا کہا تھا جب ہی رخ اس کی جانب موڑ کے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"اس سے کیا پوچھ رہی ہو۔ میں بتاتا ہوں۔" وہ جلدی سے بول اٹھا۔ "دوپہر میں جب میری فرمائش سننے کے بعد تم نے مجھے جھاڑا اور گئیں تب کہا تھا افشی نے ایک نمبر کی کنجوس ہے۔ اچھی چیز بنی ہو، کبھی نہیں بھیجے گی...... جس دن دال بنائی ہے۔ اس پتلی دال سے پتیلا بھر کے ادھر بھیج دیے گی۔" جس فراٹے سے اس کی زبان رواں ہوئی تھی افشی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں اور اشنہ کی صدمے سے۔

"ہائے وے ربا...... افشی! تو یہ سوچتی ہے میرے بارے میں۔ جانتی ہے اس دن جو تجھے دال بھیجی تھی وہ صرف اس لیے کہ تو نے کچھ ڈھنگ کی چیز بنائی ہو تو مجھے بھیج دے۔ مجھ سے نہیں کھائی جارہی تھی کیونکہ اماں نے صرف لہسن کا بگھار لگایا تھا۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"اف...... بس کردے...... بکواس کررہا ہے یہ چھا چھا کتنا اشہد! نکل یہاں سے...... ورنہ میں تجھے کچھ دے ماروں گی۔" افشی کو اور کچھ نہ ملا تو روٹی بیلتے بیلتے بیلن ہی رکھا کہ اسے دھمکایا۔

"کیا ملا تجھے ہم دونوں سہیلیوں کو لڑوا کر۔" کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ شرربار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی۔ افشی کی وضاحت سے بھی پہلے وہ اس کی چمکتی آنکھوں کی شرارت دیکھ کر بھانپ چکی تھی۔

"کچھ نہیں بس۔ تیرا یہ غصہ دیکھنا تھا۔" سر کھجاتے ہوئے کہتے وہ بے حد دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا یہیں اس کی اپنی نظروں کے سامنے وہ چت ہو جاتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ رخساروں میں غصے کے لپکتے شرارے محبوبیت ۔ میں بدلے تھے۔ نظریں چرا کر ڈونگہ افشی کے سامنے رکھتے ہوئے وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔

☆☆☆

افشی اس کی پڑوسن بھی تھی اور سب سے گہری سہیلی بھی۔ اور اشہد اس کے ماما کا بیٹا لاہور میں رہتا تھا۔ اشنہ کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی بچپن میں اشہد کو افشی کے گھر آتے دیکھا ہو۔ پہلی بار اس نے اشہد کو کوئی دو سال پہلے دیکھا تھا۔ جب ایک گرم تپتی دوپہر میں وہ حسب عادت کوٹھے سے ان کے صحن میں اتری۔ ہر طرف خاموشی پھیلی تھی۔ وہ لوگ دوپہر میں قیلولہ کرنے کے عادی تھے۔

عادی تو خیر اس کی اماں بھی تھیں مگر ایک اسی میں بے چین روح رہی تھی۔ افشی بھی اکثر اس کے انتظار میں جاگ رہی ہوتی اور اگر کبھی وہ سو بھی رہی ہوتی تو اشنہ ایسے شرارت آمیز طریقے سے جگاتی کہ وہ آئندہ سونے سے توبہ کرلیتی۔ کونے والا کمرہ جو نسبتاً ٹھنڈا بھی تھا، کی طرف آتے ہوئے اس کی نظر اس بھورے رنگ کے میمنے پر پڑی جو ادھر ادھر قلانچیں بھر رہا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر اسے بانہوں میں اٹھالیا کہ افشی سو رہی ہوگی تو اسے جگانے کے کام آئے گا۔

باہر کی دھوپ سے اس نیم تاریک کمرے میں آکر وہ کچھ دیر تو دروازے میں کھڑی اس اندھیرے سے آنکھیں مانوس کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ تب ہی سامنے کی چارپائی پر اسے وہ نظر آئی سر سے پاؤں تک ہلکی سی چادر اوڑھے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت مچلی۔ نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے

دبے پاؤں آ کر اس چھوٹے سے میمنے کو اس کے اوپر بٹھایا اور اگلے ہی پل اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا۔ اس اچانک جھٹکے پر میمنا تو گھبرا کر اچھلا ہی خود اشنہ کی بھی سی کم ہو گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھا سو نہیں رہا تھا ہاں سونے کی کوشش کر رہا تھا یا ایکٹنگ اور پھر اٹھتے ہی اس نے جس طرح اچانک اس کی کلائی جکڑی۔ وہ جھنجھناتے وجود کے ساتھ اسے دیکھتی رہی گئی، ماتھے پر بکھرے بال، تمتمائے چہرے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں گلابی ڈورے لیے وہ بس اسے تک رہا تھا کسی سحر زدہ معمول کی طرح۔ وہ اس وقت اس کی آنکھوں کی یہ بے اختیاری سی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے صرف اپنی کلائی چھڑانے میں دلچسپی تھی پھر جونہی اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگتے ہوئے نکل آئی رنگت گلابی پڑ گئی تھی سانسیں دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی۔

"اشنہ کیا ہوا؟" جب وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی اپنی دھڑکنیں معمول پر لانے کی کوشش کر رہی تھی افشی کی آواز پر اچھل پڑی۔

"کوئی جن دیکھ کے آ رہی ہے۔" اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کے وہ ہنسی۔

"اندر...... یہ...... یہ آدمی کون ہے؟" وہ اندر کی سمت اشارہ کر کے ہکلائے ہوئے پوچھنے لگی۔ افشی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بے تحاشا ہنستی چلی گئی۔ "وہ آدمی نہیں اشہد ہے بڑے ماما کا بیٹا...... تو نے کیا کیا میری جگہ اسے جگا دیا؟" وہ اب سمجھ گئی تھی اس کی حالت کا سبب۔

اس کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑا۔ لب کھسیاہٹ سے بھنچ گئے۔ "تو تو بتا نہیں سکتی تھی موت پڑ رہی تھی کہ مہمان آئے ہیں۔"

"افوہ! ممانی اچانک ہی چلی آئیں۔" اشہد کی چھٹی تھی شاید اس لیے وہ اور اماں ادھر باتیں کر رہی تھیں۔ اشہد بے چارہ سونے کو ادھر چلا گیا مگر تم نے اس کی بھی نیند حرام کر دی۔"

اس وقت تو وہاں سے نکل کر اشنہ نے اس پورے دن وہاں کا رخ نہیں کیا مگر اس سے اگلے ہفتے جب وہ دوبارہ آیا تب افشی نے ان کا باقاعدہ تعارف کروایا تھا۔ اور اشنہ بڑی جزبز ہوئی تھی جب اس دوران اس کی گہری چمکتی مسکراتی آنکھیں مستقل اس پر جمی رہی تھیں۔

پھر تو یہ اس کا معمول ہی بن گیا یا تو سالوں وہاں کا رخ نہیں کیا تھا یا اب ہر ہفتے اپنی دو دن کی چھٹیاں یہیں آ کے گزارتا۔ وہ تھا بھی بڑا ڈھیٹ اور شریر سا۔ افشی کے ساتھ ساتھ اسے بھی تنگ کرتا اور اشنہ محتاط رہتے رہتے بھی اس سے بے تکلف ہو ہی گئی، ہاں مگر جب اس کی آنکھوں کی شرارت وارفتگی میں بدلتی۔ اشنہ کے لب سل جاتے۔ قینچی کی طرح چلتی زبان کو بریک لگ جاتا اور نظریں چراتی وہ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگتی۔ جیسے آج ہوا تھا۔

☆☆☆

"تو بھی حد کرتی ہے زرینہ! کمی کیا ہے رفیق میں جو تو نے یوں رقیہ کے منہ پر انکار کر دیا۔ اکلوتا ہے کماؤ پوت ہے اور بھولا اتنا کہ پنڈ کے بچے بھی اسے میلے میں بیچ آئیں اور سگی خالہ ہے تو اس کے نقص نکالے گی تو اور کون اسے بیٹی دے گا۔"

رقیہ خالہ نے یہاں سے جانے کے بعد اپنا مقدمہ سب سے پہلے بھائی کی عدالت میں پیش کیا تھا اور اس وقت ماما جمیل اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ان کی وکالت میں میدان میں اتر آئے تھے۔

"رفیق کی سگی خالہ ہوں تو اشنہ کی سگی ماں بھی ہوں۔ تو ہی بتا بھا جمیل۔ ہے کوئی جوڑ اس کا میری اشنہ سے۔ رقیہ کی عقل پر تو بیٹے کی محبت نے پردہ ڈال دیا ہے۔ تو سچ مچ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتا۔"

اماں بڑی سنجیدہ تھیں۔ انہیں لگتا تھا ماموں ایمان داری کی مورت ہیں مگر ماما بھی آج شاید رقیہ خالہ کے گھر کا نمک کھا کر آئے تھے۔

"اوہو میری بھولی بہن۔ تو کیوں پڑتی ہے اس جوڑ توڑ کے چکر میں۔ رفیق اپنی زمینوں اور دکان کا

اکلوتا وارث ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتی۔ اور شکل عقل کی کیا بات کرتی ہے، اس پنڈ میں ایسا شہزادہ کون ہے جسے تو اپنی بیٹی کے جوڑ کا سمجھے گی سارے ناٹے، پیٹے بھدے، بے ڈھنگے ہیں۔"

"نا بھا...... میرا دل نہیں مانتا۔" انہوں نے متردد لہجے میں کہتے سر ہلایا تھا۔ "شکل سے بھلے ہی شہزادہ نہ ہو لیکن بدھی والا ہو۔ اٹھنے بیٹھنے کا بات کرنے کا سلیقہ ہو اور فیکا جواب بعد میں دے گا ناک پہلے پونچھے گا۔"

"اب اگر وہ پیدائشی نزلے کا مریض ہے تو اس میں اس بے چارے کی تو نہیں ناں کوئی غلطی، تجھے یاد نہیں۔ یہ مرض تو تیرا بھی تھا۔" انہوں نے کیا یاد دلایا تھا۔ اماں کے چہرے پر غضب ناکی چھائی۔

"بس بھی کر بھا جمیل! بول دیا میں نے فیکے سے اشنہ کا رشتہ کرنے سے بہتر ہے میں نذیرا حلوائی سے اس کو بیاہ دوں اور کچھ نہ ہو تو مٹھائیاں اور حلوے کھا کھا کر جان تو بنائے گی۔"

نذیرا بڑا ماہر حلوائی تھا۔ پورے گاؤں میں شادیوں اور منگنیوں کے ٹھیکے اس کو ملتے تھے گاؤں کی اکلوتی مارکیٹ میں کافی بڑی دکان کا مالک تھا۔ شکل وصورت، جثے اور ڈیل ڈول میں بھی روایتی حلوائی ہی تھا۔

وہ بھی اشنہ کا تمنائی تھا اور کافی دنوں سے اپنی اماں اور بھابیوں کے پھیرے لگوا رہا تھا اگرچہ اماں نے انہیں بھی پہلی بار میں ہی انکار کر دیا تھا جب ان کی آمد کی غرض پتا چلی تھی کہاں چھ فٹا۔ سو پلس کے جی وزن رکھنے والا پہاڑ جیسا نذیرا اور کہاں ہرنی سی نازک اور حسین اشنہ، جو اس کے برابر کھڑی ہوتی تو شاید دکھائی بھی نہ دیتی۔ مگر وہ لوگ پھر بھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔

"اف ف...... تو سمجھتی کیوں نہیں ہے۔" ماما زچ ہوئے۔

"میں سب سمجھتی ہوں...... بس میں نے کہہ دیا انکار ہے تو انکار ہے۔" ان کا لہجہ بے لچک اور قطعیت سے بھرپور تھا۔

"دیکھ میں ابھی اسے تیرا انکار نہیں پہنچاؤں گا۔ تو اچھی طرح سوچ لے میری طاہرہ کا بیاہ نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہیرا لڑکا میں ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔" اب تو ماما نے مبالغے کی انتہا کر دی۔ اماں آنکھوں میں استہزا لیے انہیں گھورنے لگیں۔

"میں ایک ہفتے بعد آ کر تجھ سے جواب لوں گا ٹھیک ہے۔ اب چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میرا ایک ہفتے بعد بھی یہی جواب ہوگا۔" انہوں بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔

"چل، دیکھیں گے۔" انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اور رخصت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

"چل سموسے کھا کے آئیں۔ بڑی بھوک لگی ہے۔" وہ دونوں مارکیٹ آئی تھیں۔ جب افشی کو اچانک تلتے سموسوں کی خوشبو نے اپنی جانب کھینچا حالانکہ ابھی ابھی وہ دیسی برگر کھا کر آ رہی تھیں۔ مارکیٹ چاہے وہ ایک ہیئر کلپ کے لیے بھی کیوں نہ آتیں۔ دو تین کھابے کی دکانیں وزٹ کرنا جیسے ان پر فرض تھا۔

"توبہ ہے افشی! ابھی تو چٹنی میں ڈبو ڈبو کے تو نے دو برگر چٹ کیے ہیں۔ تب ہی تو نذیرا بنتی جا رہی ہے دن بدن۔" اشنہ کو سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ غصہ آیا۔

"بکواس بند کر......" افشی نے اس کے چٹکی کاٹی۔ "بازار آؤ اور نذیرا کے سموسے نہ کھاؤ تو لگتا ہے بازار آنا بے کار ہی گیا۔" اب وہ نتھنے سکیڑ کر یہ خوشبو سانسوں میں اتار رہی تھی۔

"چل ٹھیک ہے تو کھا کے آ جا...... میں اتنی دیر میں کریم لے لوں۔" وہ کاسمیٹکس کی دکان کی سمت بڑھی۔

"کیا مطلب...... تجھے نہیں کھانے؟" افشی نے حیرت اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔ یہ وہی اشنہ تھی جو روز اسکول سے واپسی پر چاہے آندھی آئے یا

طوفان۔ نذیرا کے سموسے ڈکار نے ضرورت رُکتی تھی۔

''نہیں۔'' اس کا منہ بنا اور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ روز نذیرا کی دکان پر سموسے کھانے کا نتیجہ ہی تھا کہ وہ اس کی من موہنی صورت پر عاشق ہو کر اس کے گھر اپنی اماں کے چکر لگوا کر ان کی جوتیاں گھسا رہا تھا۔

''بول ناں......'' افشی نے اس کی کہنی ہلائی۔

''اچھا چل...... ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' وہ اس لمحے اسے کچھ بتانے کے بجائے اس کے ساتھ ہی ہولی۔ سموسے دکان کے باہر رکھی بڑی سی کڑاہی میں تلے جا رہے تھے۔ جن پر اس کا ملازم منظور بیٹھا تھا۔ نذیرا شاید دکان کے اندر تھا۔

''پارسل لے، یہاں نہیں کھانے۔'' اشنہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

انہیں دیکھتے ہی منظور نے اندر کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔ ''بھائی جی۔''

اشنہ گھبرا گئی۔ ''ایک نمبر کا کمینہ ہے یہ منظور۔''

اگلے ہی پل وہ دکان سے برآمد ہوا اپنے پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ۔ اشنہ کو دیکھتے ہی سانولے چہرے پر جو روشنی پھیلی، وہ افشی کو سارا معاملہ سمجھا گئی۔

''اوہو...... تو یہ بات ہے۔'' اشنہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتے گویا چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''سیدھی کھڑی رہ۔'' افشی کو غصہ آ گیا۔ ''دیکھ لینے دے اس بے چارے کو۔''

''ہاں جی...... کیا لیں گے آپ...... اوئے نوازے...... کرسیاں ادھر لا۔'' وارفتہ انداز میں کہتے وہ جیسے ان پر قربان ہونے کو تھا۔

''سموسے چاہئیں بس وہ پارسل کر دیں۔'' افشی نے زبان کھولی۔

''کر دیں گے سموسے بھی پارسل۔ پہلے آپ بیٹھو تو سہی۔'' کالی رنگ کی شلوار پر سفید بنیان میں اس کا بالوں سے ڈھکا سینہ نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر پسینے کی دھاریں رواں تھیں اور سیاہ آنکھوں میں جگنو بکھرے تھے۔ اس کے مستعد ملازم نے فوراً دو کرسیاں ان کے پاس رکھ دیں۔

''کہاں نا...... نہیں بیٹھیں گے۔ آپ سموسے دیں تاکہ ہم جائیں۔'' اب کے اشنہ بولی کافی رکھائی سے۔ وہ یک لخت چپ ہو کر اسے دیکھنے لگا اور جس طرح دیکھ رہا تھا اشنہ کو اپنے آنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔

''غصہ نہ کریں سرکار! ابھی دیتے ہیں...... چل منظور...... گرما گرم سموسے پارسل کر دے بلکہ تو رہنے دیں...... میں ہی کر دیتا ہوں۔'' شاید اسے اپنے ملازمین پر اعتبار نہیں تھا یا شاید اس اسپیشل پارسل میں وہ اپنا کوئی اسپیشل کمال دکھانا چاہتا تھا۔

وہاں سے نکلتے ہی اشنہ نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ واپسی پر افشی اس کے ساتھ ہی آ گئی اور جونہی سموسوں والا لفافہ کھولا، چلا کے اسے پکارا تھا۔ اشنہ جو فریج سے پانی کی بوتل نکال رہی تھی اس طرف چلی آئی۔ ''کیا ہوا؟''

''یہ دیکھ۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے اس لفافے میں موجود ایک دوسرا لفافہ دکھایا۔ جو نذیرے کی دکان کی اسپیشل قلاقند سے بھرا تھا۔

''یہ خاص آفر لگتا ہے صرف تیرے لیے ہے۔'' وہ معنی خیزی سے کہہ رہی تھی۔

اشنہ کے چہرے پر سرخی چھائی۔ ''بھاڑ میں جھونک۔ لا اسے میں احمد کے ہاتھ واپس بھجوا دوں گی۔''

''پاگل۔ ہے'' افشی نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کیا۔ ''سموسے میں نے خریدے ہیں ناں...... تو سمجھ قلاقند بھی مجھے ملی، تو مت کھا۔ میں کھاؤں گی۔''

''بھوکی ہے ایک نمبر کی۔'' وہ لب بھینچے اسے گھورنے لگی۔ ''وہ سمجھے گا میں نے اس کا قلاقند قبول کر کے اسے قبول کر لیا ہے کل کو اس کی اماں پھر آ موجود ہوں گی۔''

''تو پہلے مجھے یہ بتا...... یہ قصہ کیا ہے؟'' افشی

متجسس ہوئی۔
"کیا ہونا ہے، رشتہ بھجوایا ہوا ہے اپنا حالانکہ اماں نے پہلی بار میں ہی منع کر دیا تھا پھر بھی ہر دوسرے دن اس کی اماں اور بھابھیاں آجاتی ہیں کبھی گاجر کا حلوہ، کبھی گلاب جامن تو کبھی قلاقند سے بھرے ڈبے لے کر۔" اس نے بیزاری سے بتایا۔
"اور تو اکیلے چٹ کر جاتی ہے۔" افشی کے لیے اس ساری بات میں بس یہی نکتہ قابل اعتراض اور قابل توجہ لگا تھا وہ صدمے سے ساکت رہ گئی تھی۔
"تو ناں افشی...... تو بس مر ہی جا۔" اشنہ کی بیزاری غضب ناکی میں ڈھلی۔ "اوئے احمد! ادھر آ......" ساتھ ہی پاس سے گزرتے احمد کو آواز دے کر روکا۔
"میں یہ واپس نہیں دوں گی۔" افشی نے اس کا ارادہ بھانپ کر قلاقند والا لفافہ کسی قیمتی متاع کی طرح سینے سے لگایا۔
وہ اسے گھورتے ہوئے دوپٹے کے پلو کی گانٹھ کھولنے لگی اور پھر اس میں بندھے پیسوں سے ایک نوٹ منتظر کھڑے احمد کو پکڑایا۔
"جا نذیرے کی دکان پر۔ اسے بول سموسوں میں غلطی سے قلاقند بھی آ گئے ہیں اس کے پیسے لے لے اس میں سے۔"
"مگر باجی...... وہ مجھ سے پیسے نہیں لے گا۔" گیارہ سالہ احمد نے اس کی بات سن کے معصومیت سے کہا۔
"کیا مطلب...... کیوں نہیں لے گا۔" وہ چونکی۔
"میں اور وقاص گئے تھے۔ ایک دن اس کی دکان پر لسی پینے، اس نے ہم سے پیسے نہیں لیے تھے اور کہا تھا جب دل کرے، جو دل کرے کھا لیا کر۔ تیری اپنی دکان ہے۔ اب تو ہم روز جاتے ہیں وہاں لسی پینے۔" احمد نے تفصیل سنائی۔ اور اس کا دماغ بھک سے اڑا۔
"تو ایک قلاقند واپس کر کے کیا کر لے گی۔ احمد سے پوچھا۔ کتنا مفتا کھایا ہے اس نے۔" افشی پیٹ پکڑے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے لگی تھی۔
احمد تو اتنا کہہ کے بھاگ گیا تھا اور وہ سر پکڑے بیٹھ گئی تھی۔
"تو تو پاگل ہے اشنہ! اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہے۔ تیری جگہ میں ہوتی تو اس سانڈ کی دیوانگی سے خوب فائدہ اٹھاتی۔" اس کی سنجیدگی محسوس کر کے افشی نے ہنسی کنٹرول کر کے کہا تھا۔
"مجھے اچھا نہیں لگتا کسی کی سادگی سے یوں فائدہ اٹھانا۔ جب رشتہ کرنا ہی نہیں ہے تو کیوں خواہ مخواہ میں مٹھائیاں قبول کریں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔
افشی کندھے اچکا کر سموسوں پر ہاتھ صاف کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

"تیری پڑوسن نہیں آئی آج؟"
اسے آئے کافی دیر ہو گئی تھی مگر ابھی تک اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی جس کے لیے وہ ہر ہفتے یہاں آنے کی خواری اٹھانے لگا تھا۔ افشی سے پوچھتے ہوئے اس نے اس کے سامنے رکھی مسالا لگے کٹے ہوئے امرود کی پلیٹ اٹھائی۔
"اس کی خالہ نے آنا تھا آج اس کے رشتے کے لیے۔ مجھے تو ڈر ہے مارے خوشی کے فوت ہی نہ ہو گئی ہو۔" افشی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں نہایت سنگین مذاق کیا تھا۔
امرود کا ٹکڑا اس کے حلق میں پھنسا گردن کپڑے وہ بے اختیار کھانسنے لگا۔
افشی گھبرا کر پانی لے آئی۔ "ہائے اللہ۔ کیا ہو گیا ہے۔ آرام آرام سے کھاتے ناں، لاہور میں کیا امرود نہیں ملتے۔"
پانی کے دو گھونٹ پی کر اس کی حالت ذرا معمول پر آئی۔ مگر چہرہ اتنی سی دیر میں سرخ پڑ گیا تھا۔
"کیا بول رہی تھیں ابھی تم؟" اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ تھا جیسے کبھی مسکراہٹ سے آشنا ہی نہ رہا ہو۔
"میں کہہ رہی تھی لاہور میں امرود نہیں ملتے۔"

افشی کا بے نیاز سا انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔
''اشنہ کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔'' اس نے دانت پیسے۔
''اوہ...... وہ اس کی خالہ اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ مجھے اس نے بتایا تھا آج شاید بات پکی کر کے جائیں۔'' افشی نے اس کے چہرے کے تاثرات کھوجتے ہوئے اطلاع دی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''
''لو...... کیوں نہیں ہوسکتا۔ وہ کوئی باندری یا مج تو ہے نہیں کہ اس کا کہیں رشتہ پکا نہیں ہوسکتا۔ کڑی ہے۔ وہ بھی اتنی سوہنی۔ اس کے تو آئے دن رشتے آتے رہتے ہیں۔ تو بتا تجھے کیوں اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔''
امرود کی قاش اٹھا کر کترتے ہوئے افشی کا لہجہ سرسری تھا وہ چند لمحے یونہی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر نہایت تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ افشی حیران سی دروازے کی سمت دیکھتی رہ گئی۔
شام کو وہ اچانک چلی آئی۔ وہ صحن میں چارپائی پر دراز تھا اور اظہر اس کے پہلو میں لیٹا۔ اس کے موبائل میں گھسا وقتاً فوقتاً مختلف سوالات سے اس کے کان کھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور وہ باورچی خانے کی سمت بڑھی تھی۔ اشہد فوراً اٹھ کر اس طرف چلا آیا۔
''کیا لائی ہے؟'' باورچی خانے میں چائے بناتی افشی نے اشتیاق سے پوچھا۔
''حلوہ بنایا تھا تو تیرا خیال آگیا سوچا اکیلے کھاؤں گی تو کہیں بدہضمی نہ ہو جائے۔''
''میری مان تو نذیرا کا رشتہ قبول کرلے۔ پھر صبح وشام خود بھی حلوے کھانا اور ہمیں بھی کھلانا۔'' افشی نے شرارت سے کہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کس ناراضی کا اظہار کرتی۔
اشہد اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ہولے سے کھنکارا۔
وہ اس کی آواز پر چونک کر پلٹی۔
''خالہ چلی گئیں؟'' اس نے پوچھا تو افشی کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ ابھر آئی۔
''ہیں کس کی خالہ؟'' اشنہ نے حیرانی کا اظہار کیا۔
''تمہاری خالہ جو تمہارے رشتے کے لیے آئی تھیں۔'' اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ اس کی آنکھوں کی الجھن دیکھ رہا تھا۔
''وہ تو ایک ہفتہ پہلے آئی تھی۔ تجھے اب کیوں ان کی یاد ستانے لگی۔'' اشنہ حقیقی معنوں میں الجھ گئی اس قطعی بے تکے سوال پر جو وہ پوچھ بھی انتہائی سنجیدہ انداز میں رہا تھا۔
''افشی......'' اب وہ افشی کو گھورنے لگا جس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔
''اف...... اب کھامت جانا مجھے، میں نے تو بس ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا۔ تیرے دل کی بات اگلوانے کے لیے، کیسا رنگ اڑ گیا تھا تیرا بتاؤں اشنہ کو۔'' وہ یاد کر کے مزے لے رہی تھی۔
اشہد جھینپا اور جھلایا بھی۔ ''تجھے میں دیکھ لوں گا۔''
''پہلے اشنہ کو تو دیکھ لے۔ صبح سے ہزار بار پوچھ چکا ہے۔ نظریں دروازے پر لگی ہیں۔ بولا یا بولا یا پھر رہا ہے۔ میں اماں کو یہ چائے دے آؤں اور ہاں یہ حلوہ بھی۔'' وہ ایک ہاتھ میں کپ اور دوسرے میں حلوے کی پلیٹ پکڑے باہر نکل گئی تھی۔
اشہد چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ لیے دروازے کے چوکھٹے پر ہاتھ رکھ کر گویا اس کا رستہ روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کا چہرہ افشی کی ان کھلی باتوں پر انگارے کی دہک گیا تھا۔
''آج پورا دن کیوں نہیں آئیں؟'' اسے اپنی نگاہوں میں سماتے وہ پھر سے اس کے اوسان خطا کرنے لگا۔
''کیوں آتی؟'' اس نے نگاہیں ملائے بنا لاپروائی برتنے کی کوشش کی یہ الگ بات کہ دھڑکنیں

مدہم ہونے لگی تھی۔
"کیونکہ...... میں آیا تھا۔ تم جانتی ہو نا یہ بات......" وہ اسے جتا رہا تھا۔
"تم تو ہر ہفتے آتے ہو۔" اب اشنہ نے اس کی سمت دیکھا۔
"اور کس لیے آتا ہوں۔" وہ پوچھتے ہوئے ذرا آگے ہوا۔
اشنہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ "پھپھو کی یاد آتی ہوگی۔"
"ہا......!" وہ ہنس پڑا۔ "تمہاری یاد کھینچ کے لاتی ہے۔ ہر ہفتے یہاں، تمہارے چہرے کی روشنی سے اپنی آنکھیں اور من بھرتا ہوں تو میرا ہفتہ کٹتا ہے۔" اس نے والہانہ اظہار کیا تھا دھیمے و پرحدت لہجے میں۔ اشنہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر گیا۔
"مجھ سے شادی کروگی؟" وہ آج اسے حیران کرنے پر تلا ہوا تھا اور اشنہ شرمانا تک بھول گئی تھی۔
"تم آج مجھے اپنا جواب دو گی تو میں اگلے ہفتے اماں اور ابا کے ساتھ آؤں گا...... بولو؟"
"نہیں......" دھڑکنوں کے شور سے گھبرا کر وہ بے اختیار بول اٹھی۔ "تم...... تم ایک میٹرک فیل لڑکی سے شادی کروگے؟"
"یہ میٹرک فیل لڑکی میٹرک پاس کرلے گی۔" وہ اس کی بات سے محظوظ ہوا اور جواب بھی اس کے انداز میں دیا۔
"اگر نہیں کرپائی تو......؟" اشنہ نے ڈرتے ڈرتے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں شدتوں کا ایک سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔
"میں کرادوں گا۔"
"مگر مجھے پھر بھی تم سے شادی نہیں کرنی۔" وہ اس کی وارفتگی سے جھلاتی باہر نکلنے کو تھی کہ اشہد نے اس کا راستہ روک لیا۔
"کیوں نہیں کرنی؟"
"کیونکہ تم مجھے زہر لگتے ہو۔ تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں فیکے یا نذیرے سے ہی شادی کرلوں۔" وہ جانے کس کیفیت کے زیر اثر بولے گئی۔
"تم نے کسی اور سے شادی کا سوچا بھی تو......"
اس کے لہجے کی شدت اشنہ کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔
"تو......؟" اس کی سانس رکی۔
"تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔" اس کی سرمگیں آنکھوں میں عجیب سے خمار کی سرخیاں تیرنے لگی تھیں۔ اشنہ تیزی سے وہاں سے نکلی اور اپنے گھر، اپنے کمرے میں آکر دم لیا۔
"یہ اشہد تو پاگل ہے۔" وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ رہی تھی جس سے انگارے سے نکلتے محسوس ہورہے تھے۔ جسم لرز رہا تھا۔ چہرے پر جیسے کسی نے گلال بکھیر دیا تھا۔ وہ اس رات نہیں سوئی۔ سوتی بھی کیسے۔ نیند اور چین تو وہی چھوڑ آئی تھی اشہد کے آس پاس۔

☆☆☆

صبح بڑی اجلی اور نکھری نکھری تھی باوجود اس کے کہ رات ایک پل کے لیے بھی اس کی پلک نہیں جھپکی۔ طبیعت پر اضمحلال کے بجائے عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے جارہی تھی جب اماں ابا کی اونچی آوازوں نے اس کی توجہ کھینچی۔ ایک ہاتھ سے جماہی روکتے دوسرا ہاتھ کمر پر رکھے وہ وہیں ٹھہر کر دھیان سے سننے لگی۔
"دیکھو اشنہ کے ابا! خاندان برادری کا سوال ہے۔ رقیہ نے تو میرا ناک میں دم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب تو بھا جمیل نے بھی کہہ دیا ہے فیکے کے رشتے سے انکار کر کے اگر ہم رقیہ کی ناراضی مول لیں گے تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑے ہوں گے۔ میں سوچ رہی تھی کہ رقیہ سے جان چھڑانے کا ایک طریقہ ہے کہ میں کہہ دوں۔ ہم نے اشنہ کا رشتہ نذیرے سے پکا کردیا ہے۔" اماں اپنی منصوبہ بندی بتا رہی تھیں۔
اشنہ کے پیروں تلے سے زمین کھسکی۔
"جھوٹ بولے گی؟ فیکے سے رشتہ نہیں کرنا تو صاف بول دے، کون سا وہ تجھ پر بندوق رکھ کے

زبردستی تیری بیٹی لے جائیں گے۔'' ابا برہم ہو گئے۔
''جھوٹ کیوں بولوں گی۔ اب تو میں واقعی سوچ رہی ہوں۔ بھلا کیا برائی ہے نذیرے کے رشتے میں۔ بس ذرا وزن زیادہ ہے۔ وزن بھی کہاں صحت ہے۔ اچھے تھوڑی لگتے ہیں سوکھے چرخ لڑکے۔ فیکے کی کوئی ایک بھی کل سیدھی ہوتی تو میں سوچ لیتی۔ بھانجا ہے میرا کوئی دشمن تو نہیں۔''
''لگتا ہے نذیرے کی مٹھائیاں کام کر گئیں۔'' اس نے اپنے ٹھنڈے ہوتے ماتھے کو تھاما۔
''کوئی ضرورت نہیں۔ دونوں رشتوں کے لیے انکار کر دے۔ اشنہ کی عمر نہیں نکل رہی۔ آجائیں گے اس کے لیے اچھے رشتے بھی۔'' ابا نے قطعیت سے صاف منع کر دیا۔
''نذیرے کی ماں کو کئی بار انکار کر چکی ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو ادھر جھانکتا بھی نہ۔ اور یہ ہر دوسرے دن آجاتے ہیں مٹھائیاں لے کر منت کر کے اتنے چاؤ سے رشتہ مانگتے ہیں اب بندہ پوچھے ایسا بھی کیا عشق ہو گیا ہے اشنہ سے، پورے پنڈ میں کیا تمہارے بیٹے کو اور کوئی بیٹی نہیں دے گا۔ سچ کہوں تو ان کی اسی بات سے میرا دل پگھل گیا ہے۔ میری مان اشنہ کے ابا! ہماری اشنہ کو ایسے قدر دان لوگ پھر نہیں ملیں گے۔'' اماں کے لہجے میں حقیقی نرمی اور اپنائیت در آئی تھی ان کے لیے۔
''پھر تو تیری بہن بھی بڑی قدر دان ہے۔ پوری برادری کو اکٹھا کر کے اشنہ مانگ رہی ہے۔ اسے کیوں نہیں ہاں کر دیتیں۔'' ابا نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔
''اس نے تو پہلی بار میں ہی دھونس جمائی تھی رشتہ نہیں مانگا تھا نہ پیار سے نہ مان سے اور اب بھی وہ بدمعاشی اور زبردستی کر رہی ہے اس لیے تو میرا دماغ گھوما ہوا ہے۔''
وہ سننے کو نہیں رکی۔ ابا نے جواب میں کیا کہا۔ منہ ہاتھ دھونا بھولے وہ گرتی پڑتی افشی کے پاس آئی تھی۔ وہ اس وقت ڈنگروں والے حصے میں انہیں چارہ ڈال رہی تھی۔
''کیا بات ہے۔ چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟'' اس کی صورت دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
''اشہد کہاں ہے افشی؟'' اس نے لرزتے لہجے میں پوچھا۔
''ہیں...... '' وہ ہاتھ میں پکڑا گھڑا ایک طرف پھینکتے اس کے پاس آئی۔ ''وہ تو سویر کی گاڑی سے ہی چلا گیا مگر تجھے کیا ہوا۔''
''اماں ...... میرا رشتہ پکا کر رہی ہیں اس نذیرے کے ساتھ۔'' وہ روہانسی ہوئی بتاتے بتاتے۔
''اوئی اللہ...... خالہ کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں۔'' افشی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ الفاظ بھی کچھ بدتمیزی کی طرف مائل تھے مگر اشنہ دھیان دینے کی حالت میں نہیں تھی۔
''تو انکار کر دے۔''
''وہ تو میں کر دوں گی۔ مگر اماں ایک بار اپنی بات پر اڑ جائیں تو اگلا جان دے دے ان کی بلا سے۔ اسی لیے اشہد سے ملنے آئی تھی۔'' اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''اس نے پوچھا تھا کل رات مجھ سے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔''
''ہائے سچی۔'' اشتیاق سے افشی کا لہجہ بلند ہوا۔ ''تو نے کیا کہا پھر......؟''
''میں نے...... میں نے بے وقوفی کر دی۔ کہا نہیں کرنی اس سے شادی اور اب صبح ہی صبح یہ مصیبت...... اشہد جیسا بھی ہے فیکے اور نذیرے سے تو بہتر ہی ہے۔'' اس نے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ افشی نے بے اختیار غصے سے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔
''یہ جیسا بھی ہے سے کیا مطلب ہے تیرا ڈھونڈ کے دکھا پورے پنڈ میں کوئی اشہد جیسا۔''
''اچھا نا...... چھوڑ اب...... یہ بتا میں کیا کروں۔'' لب کچلتے ہوئے پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔
''نذیرے سے شادی کر کے اس کے گول مٹول

بچے پیدا کر۔ اور کیا کرے گی۔" افشی اس صورت حال سے مزہ لے رہی تھی۔

"بکواس مت کر...... اور اشہد سے رابطے کی کوئی صورت نکال......" وہ چراغ پا ہوئی۔

"سچ میں دوہٹی بنتا ہے اشہد کی۔" افشی نے معنی خیزی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" اس نے بیزار سا لہجہ اپنایا۔

"ایسے بات کرے گی تو نہیں کروں گی اسے فون، سچی بات بتا۔ دل کی بات بتا۔" افشی جھنجلائی۔

"اُفف...... ہاں بنتا ہے، شادی کرنی ہے اس سے ......اب ٹھیک ہے۔" اس نے تنگ آ کر الفاظ میں ردوبدل کیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" افشی نے ہنستے ہوئے اس کے گلے میں باہیں ڈالیں۔

"دور ہٹ...... پہلے ہاتھ دھو لے گندی۔" اس نے ناگواری کا اظہار کیا اس کے پاس سے آتی چارے کی بو سے۔

"اور تو پہلے منہ دھو لے۔" افشی بھنائی اور اس کی ہنسی بے قابو ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس نے پھنے خان بن کر اشنہ سے یہ تو کہہ دیا تھا کہ وہ ہاں کرے تو وہ اگلے ہی ہفتے اپنی اماں کو لے آئے۔ مگر اب جب افشی نے فون کر کے اسے اشنہ کا پیغام دیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کیونکہ اماں اور آپا کو کنوینس کرنا تو دور بات کرنا بھی پل صراط پار کرنے کے برابر تھا اور ہوا بھی وہی، جب اس نے بات کی۔

"تیرا دماغ ٹھیک ہے اشہد! تو نے کیا سولہ جماعتیں اس لیے پڑھی تھیں کہ تو جا کے اس گنوارن سے شادی کر لے۔" آپا اپنے مخصوص غضب ناک تیوروں میں آئی تھیں۔

"میں نے سولہ جماعتیں اس لیے نہیں پڑھیں کہ میں کس عالمہ سے شادی کروں۔" اس نے بے حد ضبط سے جواب دیا۔

"تو اس لیے بھاگ بھاگ کے گاؤں جاتا تھا ہر دوسرے دن۔ میں عقل کی اندھی سمجھ ہی نہ سکی ورنہ بہت پہلے تجھے لگام ڈال کے تیری عقل ٹھکانے لے آتی۔" اماں اور آپا جب ایک ہو جاتی تھیں تو ان کے غصے میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

"آپ لوگوں کا مسئلہ کیا ہے۔ کیا خرابی ہے، کیا برائی ہے اشنہ میں۔ ان پڑھ تو نہیں ہے بس ڈگری ہولڈر نہیں ہے تو نہ ہو۔ جب مجھے فرق نہیں پڑتا تو آپ لوگوں کو کس بات کی پریشانی ہے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"اسی بات کی پریشانی ہے۔ کل کو چار لوگوں میں بہو متعارف کروائیں گے تو کیا کہیں گے، میٹرک بھی کلیئر نہیں کیا۔ ہماری ایک عزت ہے۔ ہمارا گھرانا پڑھے لکھے لوگوں کا گھرانا مانا جاتا ہے۔ اور میرا یہ اسکول...... لوگ تو یہی کہیں گے دوسروں کو پڑھاتی ہے اور خود ایک گنوار کو بھابھی بنا کے لے آئی۔"

آپا کو بڑا زعم تھا اپنی تعلیم اور اپنے اسکول کا۔ یہ اسکول انہوں نے اپنی دومنزلہ رہائشی عمارت میں قائم کر رکھا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہر گلی محلے میں ہوتے ہیں انگریزی میڈیم کے نام پر، جہاں کی ٹیچرز کی تعلیمی استعداد خود میٹرک اور ایف اے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی آپا نے بھی محلے ہی کی چار پانچ لڑکیوں کو اس کام پر لگا رکھا تھا اور خود بھی پوری شدومد سے مستقبل کے ان معماروں کا بیڑا غرق کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھیں اشہد کو کبھی کبھی بڑی سنجیدگی سے یہ فکر لاحق ہو جاتی تھی ان بچوں کے مستقبل کی۔

"دیکھ اشہد! میری بات سن۔ شادی تو تیری وہیں ہوگی جہاں میں چاہوں گی اور میں نے فضیلت کے کان میں بات بھی ڈال دی ہے۔ طلعت سے اچھی لڑکی تجھے نہیں مل سکتی۔" اماں نے بتایا اور وہ اچھل کر رہ گیا۔

"کیا......؟ وہ میک اپ کی دکان...... مجھے نہیں کرنی اس گولے گنڈے سے شادی۔"

"گولہ گنڈا ہو کہ فالودہ...... شادی تو تجھے

طلعت سے ہی کرنی پڑے گی۔ پڑھی لکھی ہے۔ سرکاری اسکول کی استانی ہے۔ تنخواہ تجھ سے زیادہ نہیں تو تجھ سے کم بھی نہیں ہوگی بلکہ میں سوچ رہی ہوں، اماں شادی کے بعد وہ ایک شفٹ میرے اسکول میں بھی پڑھالیا کرے گی۔ میرا بوجھ کچھ ہلکا ہوجائے گا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی کم بخت، کم سیلری کا بہانا بنا کر ریزائن کردیتی ہے۔'' آپا اور اماں کا پلان مشترکہ تھا۔ لہجے میں عزم و مضبوطی لیے وہ اشہد کو ہراساں کرگئیں۔

''میری بات سنیں آپ دونوں۔ شادی تو میں نے اشنہ سے ہی کرنی ہے۔ اگر میری شادی آپ نے اس سے نہ کروائی تو میں نے بھی نہیں رہنا اس گھر میں اور جو طلعت سے اپنا بوجھ ہلکا کروانے کا شوق ہے ناں۔ سوتن بنالیں اسے اپنی، اسکول کیا گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا کر آپ کا بوجھ ہلکا کرلیا کرے گی۔ اسے میرے متھے نہ ماریں۔'' آخری بار آپا کو مخاطب کرکے کہتے ہوئے بدلحاظی و بدتمیزی کی انتہا کرکے وہ بڑی تیزی سے باہر نکل آیا تھا مگر آتے ہوئے اس نے آپا کا آخری جملہ ضرور سنا۔

''گیا گیا اماں...... یہ لڑکا تو ہاتھ سے گیا۔''

اسے اندازہ تو تھا کہ آپا اور اماں اعتراض کریں گی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ وہ بالا ہی بالا اس کا رشتہ طلعت سے طے کیے بیٹھی ہیں۔ طلعت اس کی خالہ زاد تھی۔ خالہ کا گھر اسی محلے میں تھا۔ بچپن ہی سے وہاں کافی آنا جانا رہا تھا۔ وہ طلعت کا مزاج بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ میک اپ اور فیشن کی دلدادہ تھی۔ گھر میں بھی اونچی ہیل کی سینڈل پہنے ٹک ٹک کرتی پھرتی۔ اس کے رخسار بھی غازے سے عاری نہیں ہوتے تھے۔ لہجے اور انداز میں عجیب طرح کی حاکمیت اور سختی تھی جو شاید پرائمری اسکول کی استانی بننے کے بعد آئی تھی۔ وہ ہر کسی کو اپنا اسٹوڈنٹ سمجھتی اور ایسے بات کرتی جیسے ابھی کان سے پکڑ کے مرغا بنادے گی۔

اشہد ایک بار کسی کام سے اس کے اسکول گیا تھا وہاں وہ جس طرح اپنے شاگردوں کو روئی کی مانند دھنک رہی تھی۔ اشہد دہل کر رہ گیا۔ اسے پہلی بار یقین ہوا کہ لڑکیاں بھی ظالم ہوسکتی ہیں۔

طلعت ان لوگوں میں سے ایک تھی جن کا تعلیم بھی کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔ نہ ہی ان کا مقدس پیشہ ان کی شخصیت میں کوئی مثبت تبدیلی لاتا ہے۔ بلکہ اشہد تو اپنی آپا کو بھی اس لسٹ میں شمار کرتا تھا۔ اگر پڑھی لکھی لڑکی کے نام پر اسے طلعت ہی ملنی تھی تو اسے جاہل اشنہ دل و جان سے قبول تھی۔

☆☆☆

اس دن موسم بڑا خوش گوار تھا۔ بادلوں سے ڈھکا آسمان اور ہلکی ہلکی پڑتی پھوار...... اس کا جی کچھ کھانے کو للچایا۔ سو پکوڑوں کا مسالا تیار کیا اور جب کڑاہی چولہے پر رکھ رہی تھی تو احمد نے جلیبیوں سے بھرا لفافہ اس کے سامنے رکھا۔

''یہ پکڑو باجی۔ میں کھیلنے جارہا ہوں۔'' وہ عجلت میں تھا۔

اشنہ نے چیخ کر اسے روکا۔ ''رک...... پہلے بتا، یہ اماں نے منگوائی تھیں؟''

''نہیں تو...... یہ تو نذیرے بھائی نے دی ہیں خود۔ کہہ رہے تھے، موسم اچھا ہے۔ گھر لے جا۔'' وہ اس کے انکشاف پر دم بخود نہیں تھی، اس کے طرز تخاطب پر تھی۔ وہ نذیرا سے نذیرا بھائی بن گیا تھا۔

اس کا چہرہ ایک پل میں اندرونی شعلوں سے دہکا۔ وہ اٹھی۔

''چل، تو آ میرے ساتھ۔''

''باجی! وقاص باہر میرا انتظار کررہا ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

اس نے بنا دھیان دیے دوپٹا ٹھیک سے اوڑھا۔ جلیبیوں والا لفافہ اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل آئی۔ بارش کے باعث کچے راستوں کی مٹی کیچڑ میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس کے پیر کہاں کہاں پڑرہے تھے، اسے خیال بھی نہیں تھا۔ چپلوں کے علاوہ اس کے پائنچے بھی کیچڑ میں لت پت ہوچکے تھے اور احمد بے چارہ اس کے ساتھ گھسٹتا چلا جارہا تھا۔

نذیر کی دکان تک پہنچنے تک اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا بلکہ دل کچھ اور بھی سلگتا تنور کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس کے شعلے اس کی آنکھوں اور چہرے سے نکلتے بخوبی محسوس کیے جا سکتے تھے۔

وہ دکان کے باہر اس کاؤنٹر نما جگہ پر رکنے کے بجائے اندر چلی آئی تھی۔

لفافہ اس کے سامنے رکھا۔

"یہ لے اپنی جلیبیاں۔"

وہ گلہ کھولے شاید حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اس کی آواز اور اس کی آمد پر اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ حیران سی نظر پہلے جلیبیوں اور پھر اس پر ڈالی تھی جو شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی۔

"اپنی یہ نیچ حرکتیں بند کر سمجھا اور کسی خوش فہمی میں مت رہ۔ تو کیا سمجھتا ہے ان مٹھائیوں سے ہمیں خرید لے گا۔ تجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، تجھے ایک بار کا انکار سمجھ میں نہیں آتا؟ مجھے نہیں کرنی تجھ سے شادی...... ان حرکتوں سے تیرا کچھ نہیں بنے گا، یاد رکھ...... اور تجھ سے اور تیرے گھر والوں سے تو میں اب تک بڑی شرافت سے پیش آئی ہوں مگر اب اگر وہ دوبارہ آئے تو مجھ سے کچھ سنے بغیر وہ میرے گھر سے نہیں نکلیں گے۔ تجھ میں ذرا بھی شرم ہوگی تو انہیں دوبارہ نہیں بھیجے گا اور میرے بھائی کو آئندہ کچھ بھی دینے یا کھلانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

انگلی اٹھا کر کہتے ہوئے وہ ہانپ سی گئی تھی۔ آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ بات ختم کر کے جو نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تو بھڑکتے غصے پر جیسے مزید تیل کے چھینٹے پڑے تھے۔

وہ جس طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ اشنہ کو شک گزرا، اس نے شاید اس کی ایک بھی بات توجہ سے نہیں سنی ہے۔

"ڈھیٹ ہڈی...... چکنا گھڑا...... گینڈا...... کمینہ کہیں کا۔" دل ہی دل میں اسے مغلظات سے نوازتی، بکتی جھکتی وہ احمد کا ہاتھ پکڑے جس طرح آئی تھی اسی طرح نکل بھی آئی۔

"یہ تجھے کیا ہوا، باہر کیا کیچڑ میں گھر گھر کھیل رہی تھی۔"

اس کا دل اتنا برا ہو رہا تھا کہ لباس بھی تبدیل کرنے کی زحمت کیے بغیر وہ بستر پر آ کر پڑ گئی تھی، جب افشی کی حیرت زدہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"لمبی کہانی ہے۔" بے زاری سے کہتی وہ اٹھ بیٹھی۔

"بینا...... میں سارے کام ختم کر کے آئی ہوں۔" تجسس سے کہتے وہ پاس آ بیٹھی۔

"اس گینڈے نے پھر سے جلیبیاں بھیجی تھیں۔" چوٹی کے بل کھولتے ہوئے اس نے بتایا۔

"تو نے کھالیں؟" اگرچہ افشی کو اس کا ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا پھر بھی اس تصور سے منہ میں پانی بھر آیا۔

"نہیں...... واپس کر کے آئی ہوں اور اچھی خاصی کرکری بھی کر کے آئی ہوں۔ پتا نہیں انسان ہے کہ جانور ہے، جتنا اس کا وزن ہے اس کی آدھی بھی اس میں شرم ہوتی تو یہ حرکتیں نہ کرتا۔" وہ سخت جھلائی بیٹھی تھی۔

"مطلب...... تو اس کی بے عزتی کر کے آ رہی ہے؟" افشی نے پہلے حیرت کا اظہار کیا اور پھر ہنستی چلی گئی۔ اشنہ نے بجائے کچھ کہنے کے آخری بل بھی کھول کر بال بکھیرے۔

"بہت بری بات ہے ویسے...... تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" خوب ہنسنے کے بعد افشی کو شرافت کی دیوی بننے کا خیال آیا۔

"میرا صبر ختم ہو چکا ہے افشی! حد ہوتی ہے کوئی، جب تک میں اسے سبق نہ سکھاتی، اسے سمجھ میں نہیں آنا تھا۔ اچھا ہے، اب نہیں بھیجے گا گھر والوں کو۔"

"اگر وہ پھر بھی باز نہ آیا تو؟" افشی نے سوال اٹھایا۔

”بھاڑ میں جائے۔“ وہ جھنجلا گئی۔ ”تو بتا، اشہد سے بات ہوئی؟“ افشی نہ آتی تو اشنہ خود جا کر اس سے یہ بات پوچھنے والی تھی۔

”ہاں ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا، گھر والوں سے بات کرے گا۔“

”کیا مطلب...... گھر والوں سے بات کرے گا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ اپنی اماں کو لے کر آئے گا۔“ اسے افشی کی بات اور انداز دونوں برے لگے۔

”ہاں تو گھر میں بات کرے گا تو اماں کو لے کر آئے گا ناں۔ تیری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے۔“ افشی اسے گھورنے لگی۔ ”اور سچ کہوں تو اسے ممانی کو منانا پڑے گا۔ تجھے پتا ہے ممانی کتنی مزاج دار ہے۔ صالحہ آپا الگ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں اور چلتی ان ہی دونوں کی ہے۔“ کسی قدر متردد لہجے میں کہتی وہ اس کے رگ وپے میں بے چینی کی لہر دوڑا گئی۔

”تو مجھے ڈرا رہی ہے افشی! اگر اشہد کی چلتی نہیں ہے تو اس نے مجھ سے شادی کے لیے پوچھا کیوں؟“ اس کا لہجہ ڈوبا۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کی بالکل نہیں چلتی۔ مگر کہہ رہی ہوں، ایسے ہی ایک بار میں ممانی اس کے کہنے پر اٹھ کر نہیں آ جائیں گی۔ اشہد کو انہیں منانا پڑے گا۔ ممانی نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی ہیں۔ اب ایسے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔“ افشی نے دھیمے لہجے میں اصل وجہ بتائی۔

”تو جیسا میں نے سوچا تھا ویسا کچھ نہیں۔“ وہ بے یقینی سے بڑبڑائی۔

”کیا سوچا تھا تو نے؟“ افشی نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”یہی کہ میرے ہاں کہنے کی دیر ہے، اشہد بارات لے کر دروازہ پر کھڑا ہوگا۔“ استہزائیہ انداز میں کہتی وہ جیسے خود ہی پر ہنس دی۔

”ایسے تو نہ کہہ۔“ افشی شاکی ہوئی۔

”چل چھوڑ، میں نہانے جا رہی ہوں۔ پکوڑوں کے لیے بیسن گھولا ہے۔ تو جا کے پکوڑے تل لے، پھر دونوں مل کے کھائیں گے۔“ اس نے بات بدلی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں، نوکر ہوں نا تیری۔ اپنا کام ختم کر کے ادھر آ کر پھر تیری چاکری بھی کروں۔“ اسے غصہ آیا تھا۔

اشنہ نے بنا کچھ کہے ہنستے ہوئے اپنے کپڑے اٹھائے، جانتی تھی جب باہر نکلے گی، پکوڑے تیار ملیں گے۔

☆☆☆

اماں نے سوچا تھا اس بار نذیرے کے گھر والے آئیں گے تو وہ انہیں نامراد نہیں لوٹائیں گی، مگر ان کا انتظار...... انتظار ہی رہ گیا۔ انہوں نے نہ آنا تھا، نہ آئے۔

”لو بھلا، میں نے تو سوچا تھا اس بار ان کا منہ میٹھا کراؤں گی۔ مگر لگتا ہے وہ لوگ مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔“

اماں نے اپنا قلق بلند آواز میں ظاہر کیا تھا اور اشنہ نے بمشکل چہرے پر در آنے والی مسکراہٹ چھپائی۔ اب اسے پتا چل گیا تھا کہ نذیرے نے اس دن نہ صرف اس کی باتیں سنی تھیں بلکہ من وعن اس پر عمل بھی کیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد جب وہ باورچی خانے میں دوپہر کی روٹیاں بنا رہی تھی، احمد اس کے سر پر آ کر چلایا۔

”باجی...... تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ وہ حیران وپریشان ہوگئی۔

”تم نے نذیرے بھائی کو منع کیوں کیا۔ اب وہ مجھے کچھ کھانے کو نہیں دیتے اور مفت تو چھوڑ، پیسے دوں تب بھی نہیں دیتے۔ بھگا دیتے ہیں۔ مجھے وقاص کو پیسے دے کر سموسے منگوانے پڑتے ہیں۔“ وہ روہانسا ہوگیا۔

اسے ہنسی آ گئی۔

”تو دفع کر اسے، مجھے بول دیا کر جو کھانا ہو۔ میں بنا دیا کروں گی۔“ اس نے پچکارا۔

”ہونہہ...... تم بناؤ گی۔ نذیرے کی دکان جیسے

گلاب جامن، سموسے اور جلیبیاں......'' وہ پیر پٹختا نکل گیا تھا۔

''نذیرے! تم اچھے ہو مگر...... میرے ساتھ نہیں جچتے۔'' اس نے پھولتی روٹی پر نظریں جمائے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا تھا۔

شام میں وہ چھت پر آئی تو پاس والی چھت پر اظہر کے سنگ پتنگ اڑاتے اشھد کو دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ کب آیا؟''

وہ دونوں چھتوں کو ملاتی سرحد عبور کر کے اس طرف آئی تھی۔

''کب آئے؟''

وہ اس کی آواز پر چونکا پھر آسمان کی وسعتوں میں کسی دھبے کی مانند نظر آتی پتنگ سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''تھوڑی دیر پہلے۔''

''اکیلے آئے ہو؟'' وہ یہ سوال پوچھنا چاہ رہی تھی مگر نہیں پوچھ پائی۔ کچھ اس کی مصروفیت اور کچھ اظہر کی موجودگی کے باعث۔ وہ کچھ کہنے سے احتراز کرتی نیچے آگئی۔

''اشھد آیا ہے۔'' افشی نے اسے دیکھتے ہی اطلاع دینے کی کوشش کی۔

''اندھی نہیں ہوں، دیکھ کر آرہی ہوں۔'' اس کا منہ بن گیا۔

''کیا بات ہے، مرچیں کیوں چبا رہی ہے۔''

اس نے ایک نظر صحن کے دوسرے سرے پر تنور دہکاتی خالہ کو دیکھا پھر اس کمرے میں چلی آئی جہاں افشی کا قبضہ ہوتا تھا۔

''اکیلا آیا ہے۔'' چارپائی پر ٹکتے وہ اپنے لہجے کی مایوسی چھپا نہیں پائی۔

''پہلے کب پورے محلے کو ساتھ لے کر آیا ہے۔'' افشی قصداً انجان بنی۔

اشنہ نے ایک گہری سانس لے کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ مایوسی کا شکار ہو رہی تھی اور اسے اس کی وجہ خود بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اسی وقت وہ بھی دروازے میں آ کھڑا ہوا۔

''میں اماں کے ساتھ پیڑے بنالوں۔'' افشی اسے دیکھتے ہی کھسکی۔

''کیسی ہو؟'' اشھد نے اندر آتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اشنہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہوں۔''

گہرے رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس، سینے پر ہاتھ باندھے اسے اپنی گہری نظروں سے دیکھتا وہ اس کا گریز محسوس کر رہا تھا۔

''تم مجھ سے شرمانے لگی ہو اشنہ!'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''نہیں۔'' اس نے فوراً ہی شدت سے اس کی بات رد کی۔

''تو پھر اس دن تم نے مجھے براہ راست میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔ افشی سے کیوں کہلوایا۔'' وہ چھیڑنے کے موڈ میں تھا اور اشنہ سرتاپا سنجیدگی میں۔

''تو پھر...... تو نے گھر بات کی؟'' اشنہ اس ایک بات کے علاوہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ درحقیقت وہ جانچ رہی تھی، اشھد کتنے پانی میں تھا۔ افشی نے اس سے جو بات کی تھی، اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔

اشھد کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت سی موجزن ہوئی۔

''ہاں کی...... میں انہیں منا رہا ہوں۔'' اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

''وہ نہیں مانیں تو؟'' اشنہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''وہ مان جائیں گی۔''

''وہ نہیں مانیں تو......؟'' اس نے ضدی پن سے پوچھا۔

''بھاگ چلیں گے اور کیا۔'' وہ ہنسا۔

''شروع کر دی نا بکواس۔'' اس کے نوکیلے ابرو تنے تھے۔ آنکھوں میں جلال جاگا۔

''دیکھ میری سونی! میری بات سن۔ وہ مانیں نہ مانیں ان کی مرضی...... مجھے جو کرنا ہے، میں کروں گا۔'' وہ پہلی بار سنجیدہ ہوا۔ ''تیرے پاس موبائل ہے؟'' اس نے اچانک ہی یہ سوال کیا تھا۔

''نہیں...... کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''میں دوں؟'' اس کے ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ اشنہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''ان خیالوں سے باہر آجا۔ مجھے تیرے ساتھ چکر نہیں چلانا۔ تجھے مجھ سے شادی کرنی ہے تو گھر والوں کو بھیج۔ منگنی کرا اور پھر دے موبائل...... رکھ لوں گی۔''

''تو اتنا اکڑ کیوں رہی ہے؟'' وہ جھنجلا اٹھا۔

''میں ایسی ہی ہوں۔'' وہ تیکھے پن سے مسکرائی۔

''چل ٹھیک ہے۔'' اشہد نے ایک گہری سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں اماں کو منا رہا ہوں مگر تجھے انتظار کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو یہاں میں ان سے بے عزتیاں سہہ سہہ کر انہیں یہاں آنے پر راضی کروں اور ادھر تجھے وہ حلوائی لے اڑے۔''

''میں کروں گی۔'' اس نے سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر وعدہ کرلیا۔ ویسے بھی اب نذیرا کا رشتہ نہیں رہا تھا۔ وہ انتظار کرسکتی تھی۔

☆☆☆

اس دن اشنہ کی شامت آئی تھی جو اماں کے ساتھ بازار چلی آئی۔

''چل ذرا، نذیرے کی دکان پر۔ سن گن تو لوں۔ اس کی اماں نے آنا کیوں چھوڑ دیا۔'' کاسمیٹکس کی دکان سے خضاب لینے کے بعد اماں نے اسے اپنا ارادہ بتایا تو اس کے پیروں سے جان نکلی۔

''نہیں اماں! تجھے اللہ کا واسطہ۔ کیا کررہی ہے، کیا سوچے گا وہ ہمارے بارے میں۔'' کانپتے ہوئے لہجے میں کہتے اس نے انہیں باز رکھنا چاہا۔

''کیا سوچے گا مطلب؟'' اماں نے اس پر ایک تیز نظر ڈالی۔ ''اس کی اماں اور بھابیاں جو ہر دوسرے دن مٹھائی کا ٹوکرا لیے حاضر ہوجاتی تھیں، سو سو واری انکار سننے کے بعد بھی...... کیا ہم نے ان کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا سوچا؟''

''مگر اماں! ان کی مرضی ناں۔ اتنی بار انکار سنا۔ اب ان کی بھی کوئی عزت ہے۔ آگیا ہوگا غصہ۔'' اس کی انگلیاں لاشعوری طور پر اماں کے بازوؤں میں کھب گئی تھیں۔

''مجھے پتا کرنا ہے، یہ غصہ اب ہی کیوں آیا۔ آخری بار تو میں نے بہت نرمی سے بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اشنہ کے ابا سوچ بچار کررہے ہیں۔ وہ تو بڑا خوش ہوکے گئی تھیں۔ اب اچانک کیا ہوا؟'' اماں میں آج کسی جاسوس کی روح حلول کرگئی تھی۔

''نہ اماں! میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔'' گھبراہٹ زدہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اماں کا بازو کھینچا۔

''تو میری ماں ہے کہ میں تیری ماں ہوں۔'' اماں کو غصہ آیا۔ ''میں کہتی ہوں چھوڑ میرا بازو۔'' ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔ اشنہ ان کے پیچھے لپکی۔ نذیرا انہیں دیکھ کے چونک گیا تھا۔ اشنہ نے خود کو عجیب سی شرمندگی کے حصار میں محسوس کیا۔

''اماں کیسی ہے تیری...... اور بھابیاں؟'' اماں سموسوں کا آرڈر دینے کے بعد خیریت دریافت کرنے لگیں۔ وہ مسکراتے ہوئے جواب دے رہا تھا۔

''اور گھر میں سب خیریت ہے ناں، کوئی مسئلہ تو نہیں۔'' اماں کا انداز محتاط تھا مگر اشنہ اس سوال میں چھپے ایک اور سوال کو بخوبی محسوس کرسکتی تھی۔ بے چینی سے اس نے اپنے وجود کا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کیا۔

''ہاں خالہ، شکر رب سوہنے کا۔ سب ٹھیک ہے۔'' اس نے بڑے پرزور انداز میں تسلی کرائی تھی۔ اماں کے چہرے پر کسی قدر مایوسی کے تاثرات ابھر آئے۔

اشنہ تو اسی پر شکر ادا کررہی تھی کہ اماں نے صاف الفاظ میں ان کے نہ آنے کی وجہ نہیں پوچھی۔

''مجھے تو لگتا ہے انہیں کسی نے ورغلایا ہے۔'' واپسی پر اماں اس سے کہہ رہی تھیں۔

''کون ورغلائے گا اماں! تم بھی نا ایویں شک کرتی ہو۔'' وہ بے زار ہو چلی۔

''ایویں نہیں کرتی میں شک، خود سوچ۔ یا اتنا اتاؤلے ہو رہے تھے رشتہ کرنے کو یا اچانک چپ سادھ لی۔ مجھے تو رقیہ پر شک ہے۔ اسی نے کیا ہوگا اپنے انکار کا بدلہ لینے کے لیے۔''

''بدگمانی نہ کرو اماں!'' کہتے کہتے اس نے سختی سے لب بھینچے۔ کہیں خالہ کی ہمدردی میں اپنا راز خود ہی نہ کھول دے۔ ''اور اچھا ہی ہے، آرام سے بیٹھے۔ مجھے ویسے بھی کرنی تھی نذیر ا سے شادی۔'' دبے لہجے میں کہتے ہوئے وہ خود پر اماں کی خشمگیں نظریں محسوس کر رہی تھی۔

''ناں...... تو کس سے کرنی ہے شادی۔ کیسے سے؟ بول...... جواب بھجواؤں تیری خالہ کو۔ آ کر انگوٹھی پہنا دے تجھے۔ ہماری بھی جان چھوٹے۔'' اماں بھول گئی تھیں کہ وہ رستے میں ہیں' جب ہی غصے سے آواز کچھ بلند ہوئی۔

''ہاں، جان ہی تو چھڑانی ہے مجھ سے۔ جب ہی تو نذیرا سے بیاہنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔ وہ تو اللہ نے میری سن لی، خود ہی چپ ہو کر بیٹھ گئے ورنہ اور کچھ ہوتا نہ ہوتا اس سے شادی سے...... ہر وقت کی مٹھائیاں اور روغنی غذائیں کھا کھا کر ہارٹ اٹیک ضرور ہو جاتا مجھے۔''

وہ اپنی بات کہہ کر تیز قدموں سے آگے بڑھ آئی تھی، مبادا اماں کچھ اور کہہ دیں اور انہوں نے کہا بھی، اس نے کان لپیٹ لیے تھے۔

☆☆☆

''اماں بتائیں، آپ کب جا رہی ہے پھپھو کے ہاں۔''

اس دن آپا موجود نہیں تھیں اور اس کے پاس سنہری موقع تھا جسے غنیمت جانتے ہوئے اس نے پھر اماں کے سامنے وہ بات چھیڑی۔ آپا نہیں ہوتی تھی تو اماں پھر بھی کچھ لچک دکھا دیتی تھیں۔

''کیوں...... اب انشی پر دل آ گیا۔'' آپا کی طنزیہ آواز اس کی پشت پر سے ابھری تھی۔ اشہد نے بے اختیار خود کو کوسا۔ صرف کمرے میں ہی نہیں اسے پورے گھر میں آپا کی غیر موجودگی کا یقین کر لینا چاہیے تھا۔

''اور میرے سامنے بولتے ہوئے کیا زبان میں چھالے پڑتے ہیں یا تجھے لگتا ہے میری غیر موجودگی میں تو بھولی بھالی اماں کو ورغلا لے گا جو انہیں اکیلے گھیر کے بیٹھ گیا۔''

آپا کے الفاظ اور انداز ایسے تھے جیسے اماں کوئی معصوم ہرنی ہوں اور وہ کوئی مشاق شکاری۔

''اف آپا، خدا کے لیے۔'' اس نے عاجز آ کر حقیقتاً ہاتھ جوڑ لیے۔ ''مجھے اماں سے اپنی بات کر لینے دیں اور کبھی سکون کے دو پل اپنے گھر میں بھی گزار لیا کریں۔'' اسے احساس ہونا چاہیے تھا مگر ہوا نہیں کہ اس کی بات سے جنگ عظیم سوئم چھڑ جائے گی اور ہوا بھی وہی۔

''اے لو اماں! اب یہ میرے اس گھر میں آنے پر بھی پابندی لگائے گا۔ دیکھ رہی ہو اس لڑکی کا جادو کیسے اس کے سر پر چڑھ کے بول رہا ہے۔ ابھی وہ اس گھر میں آئی بھی نہیں اور بہن کانٹا بن کر کھٹکنے لگی۔ میں بھی کہے دے رہی ہوں، یہ میرے باپ کا گھر ہے چاہوں دن میں دسیوں بار آؤں، چاہوں تو یہیں ڈیرا جما کے بیٹھ جاؤں، مجھے کوئی نکال کے دکھائے۔'' انہوں نے سینہ ٹھونکا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

ادھر اماں کا بلڈ پریشر اور پارہ دونوں چڑھے، سو ایک دھپ اس کے شانے پر رسید کی۔

''شرم نہیں آتی، اس دن کے لیے وہ تجھے گود میں اٹھائی اٹھائی پھرتی تھی کہ آج ایک پرائی پچھل پیری کے لیے اسے گھر سے نکل جانے کا کہے۔ تیرا کیا کھاتی ہے، الٹا باورچی خانے میں چار چھ چیزیں ہی ڈلوا جاتی ہے۔''

وہ جو سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سر تھامے بیٹھا تھا، چاہتا تو کہہ سکتا تھا کہ جب اپنے چار بچوں سمیت وہ حقیقتاً یہاں ڈیرا جمائے بیٹھی ہیں۔ صبح، دوپہر، شام تینوں وقت کا کھانا کھا کر اور شوہر نامدار کے لیے ٹفن میں باندھ کے لے جاتی ہیں۔ ایسے میں تو انہیں پورا مہینے کا راشن ڈلوانا چاہیے مگر اس وقت بات اس سچائی سے نہیں

معافی سے بنی تھی، سو وہ بول اٹھا۔
''اچھا، معاف کر دیں۔ منہ سے نکل گیا' غلطی سے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا……''
''ہونہہ……'' انہوں نے ایک سلگتا ہنکارا ابھرا۔
''جیسے میں جانتی نہیں۔''
''اماں پلیز، مجھے بتا دیں۔ آپ اشنہ کا رشتہ مانگنے جا رہی ہیں یا نہیں؟'' اسے اس وقت آپا کی خفگی کی کوئی پروا نہیں تھی مگر وہ مصلحت سے کام لے رہا تھا۔
اماں نے آپا کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کوئی بات تھی۔ جسے اشہد سمجھ نہیں سکا۔ شاید دونوں ماں بیٹی پھر کوئی پلان بنائے بیٹھی تھیں جس کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔
''دیکھ اشہد! تو اتنا اتاؤلا ہو رہا ہے، تو ہم چلے بھی جائیں مگر ایک بات تو لکھ لے۔'' آپا اس کے سامنے آ بیٹھیں۔ ''اگر انہوں نے انکار کیا تو ہم دوبارہ نہیں جائیں گے اس چوکھٹ پر تیرا رشتہ لے کر۔ ان کی منتیں کرنے یا ان کے پیر پڑنے۔ پھر تجھے وہیں شادی کرنی ہوگی جہاں ہم چاہیں۔''
اشہد چند لمحے انہیں جانچنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اگر وہ واقعی جانے پر راضی ہو گئی تھیں تو پھر اسے اشنہ کے گھر والوں کی طرف سے انکار کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اسے خود پر اتنا یقین تو تھا ہی کہ وہ بہر حال فیکے اور نذیرے سے بہتر ہے اور پھر اشنہ بھی تو تھی اس کا ساتھ دینے کو۔
''وہ سوچنے کے لیے وقت مانگ سکتے ہیں۔ ایسے ہی پہلی بار میں تو کوئی بھی ہاں نہیں کر دیتا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔
''وہ الگ بات ہے مگر انکار کے بعد ہم نہیں جائیں گے۔'' آپا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
''ٹھیک ہے مگر آپ بھی بات سلیقے سے کیجیے گا کہ انہیں مانتے ہی بنے، پلیز۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا، کم از کم آپا پر بالکل نہیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ آپا اماں کے لیے آکسیجن ماسک تھیں، جن کے بغیر اماں کا سانس لینا بھی محال تھا۔

''لو…… اب یہ ہمیں سلیقہ سکھائے گا جیسے خود لکھنؤ کا نواب ہو۔'' آپا کے اس طنز کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموشی سے اٹھ آیا۔
بات بننے لگی تھی تو وہ غیر ضروری جذباتیت سے اسے بگاڑنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

''پتا ہے، کبھی کبھی اس ویلے میرا جی کیا چاہتا ہے۔''
وہ دونوں شام کے اس پہر برآمدے کی چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی ادھر اُدھر کے قصے چھیڑے بیٹھی تھیں، جب افشی نے اچانک یہ بات کی۔
اشنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
''کیا؟''
''کسی بچے کو پکڑ کر نذیرے کی دکان پر بھیجوں اور کہلواؤں کہ اشنہ ایک درجن سموسے مانگ رہی ہے۔'' اس کے انداز میں بے حد سنجیدگی تھی۔
اشنہ سلگ اٹھی۔ ''جس دن تو نے یہ حرکت کی ناں، وہ دن تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ وہ سموسے کھانے نصیب نہیں ہوں گے تجھے، یاد رکھ۔''
''تو بس سڑی ہوئی ہی رہ ہر وقت۔'' وہ جھنجلائی۔ ''پیسے دے کر بھیجوں گی، ایسے تھوڑی۔'' اس نے اشنہ کی برہمی پر فوراً پینترا بدلا۔
''تو پھر میرا نام لینے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ویسے بھی دے ہی دے گا۔'' اشنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
''ویسے مجھے لگتا ہے، بچی میں پیار کرتا ہے تجھ سی۔'' افشی کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ آئی۔
''کیوں، حال دل تجھے سنایا ہے۔'' اس نے کروٹ بدلی۔
''دیکھ ناں، پہلے کیسے پیچھے پڑا تھا پھر جب تو نے منع کیا تو فوراً ہی منع بھی ہو گیا۔'' اس کا لہجہ پرسوچ تھا۔
''ہاں، تو آ گئی ہوگی سمجھ کہ لڑکی کو نہیں ہے مجھ میں دلچسپی۔ بیٹھ گیا چپ کر کے۔ اماں کو تو یہی غم کھائے جا رہا ہے۔ کہہ رہی ہے خالہ نے ورغلایا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کسی دن اباں ان سے لڑنے ہی نہ پہنچ جائے۔'' سورج کی نارنجی کرنوں سے بچنے کی

کوشش میں اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

"اشہد کو ایک بار گھر والے بھیجنے دے۔ خالہ خود ہی بھول جائے گی اس رشتے کا غم۔" افشی ابھی یہ بات کر ہی رہی تھی کہ اندر سے اسے اماں کی باتوں کی آواز آئی۔

"لگتا ہے اماں کسی سے فون پر بات کر رہی ہے۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔ چند لمحے سننے کی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ "میں دیکھ کے آتی ہوں۔"

"تجھے کیا کرنا ہے، کون سا تیرے سسرالیوں کا فون ہے۔" اشنہ چڑ گئی اس کے اٹھنے پر، وہ سننے کو رکی نہیں۔

مگر کچھ ہی لمحوں بعد وہ پھر سے آ کر اس کے سر پر چلائی۔

"سن، مامی کا فون ہے۔ اس ہفتے آ رہی ہیں صالحہ آپا کے ساتھ۔"

"سچ......" اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

"ہو سکتا ہے یوں ہی آ رہی ہوں۔" اس نے یہ سوچا تو دھیمی پڑ گئی۔

"کوئی نہیں۔" افشی نے ہاتھ ہلایا۔ "تیرے رشتے کے لیے آ رہی ہیں، ورنہ پھر آپا کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کو تھوڑی اپنے اسکول سے فرصت ملتی ہے۔"

"سن...... تو اشہد سے پوچھ ناں۔" اس نے افشی کا ہاتھ پکڑا۔

"ہاں، پوچھتی ہوں۔ بس اماں بات کر لے۔ میرے خود پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔" وہ ٹہلنے لگی تھی۔

پھر اشہد کی یقین دہانی کے بعد ہی اسے ذرا اطمینان کی سانس نصیب ہوئی۔ وہ خوش تھی اور کسی قدر مضطرب بھی۔ اشہد نے یقیناً انہیں مشکلوں سے منایا ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی، وہ کس موڈ اور کس مزاج میں اس کے گھر آئیں گی۔ کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا۔

ان لمحات میں اسے افسوس سا ہو رہا تھا، اگر اشہد سے بات ہوتی رہتی تو وہ اس وقت اس سے اپنی بے چینی تو بانٹ سکتی تھی۔ اب تو وہ اکیلے ہی ان پر تشویش زدہ سوچوں میں ڈوب اور ابھر رہی تھی۔

☆☆☆

افشی کی اماں اور اشنہ کی اماں آپس میں دوپٹا بدل بہنیں تھیں۔ ان کی دوستی اور بہناپا ایسا تھا کہ لوگ انہیں سگی بہنیں ہی سمجھتے بلکہ زرینہ خاتون کی تو اپنی بہن رقیہ سے اتنی نہیں بنتی تھی جتنی افشی کی اماں سے بنتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب ان کی بھاوج فون کر کے ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے پہلے ہی اشنہ کی اماں کو خبردار کر کے انہیں ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا۔ انہوں نے فون پر زیادہ تفصیل نہیں بتائی تھی، بس اتنا کہا کہ اشہد کی ضد کے آگے سر جھکا کر انہیں اشنہ کے گھر جانا ہے۔ مگر وہ سمجھ گئی تھیں۔

اماں بھی خوش تھیں۔ چلو نذیرا کا رشتہ ہاتھ سے گیا تو اللہ نے دوسرا سبب پیدا کر دیا۔ وہ بھی اس سے بہتر جگہ پر۔ اس دن کے لیے انہوں نے اشنہ کو ساتھ لگا کر بڑی تیاری کی کہ شہری لوگ ہیں، ان کے سادہ اور دیہاتی طرز زندگی کو دیکھ کر پیچھے نہ ہٹ جائیں۔ اشنہ خود بھی طرح طرح کے واہموں میں گھری اس دن کے جلدی سے گزر جانے کی گویا اس امتحان کو پاس کرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ان کی آمد ہوئی۔ افشی کی ممانی کو وہ کئی بار دیکھ چکی تھی۔ دیکھا تو آپا کو بھی تھا مگر اس بات کو کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اب ان میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ طویل قامت پر فربہی مائل جسم، سبز رنگ کے کاٹن کے لباس میں بالوں کا جوڑا بنائے سپاٹ اور مسلسل اطراف میں چکراتی کائیاں نظروں کا طواف...... جو بھی تھا انہیں دیکھ کر بندہ ایک لمحے کو دب ضرور جاتا تھا اور اشنہ بھی سہمی تھی۔

دونوں ماں بیٹی بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ اماں بے چاری بات کرنے کی کوششوں میں تھیں مگر خالہ کے علاوہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی ان سے بات کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔

چائے سرو کرتی اشنہ کو غصہ آیا۔

''اتنی اکڑ کا ہے کی، رشتہ لینے آئی ہیں یا ہم پر احسان کرنے۔''

''تم ہو ناں اشنہ۔'' وہ پلٹنے لگی تھی جب آپا کی کڑک دار آواز پر چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اماں اور خالہ بھی خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کتنا پڑھی ہو خیر سے؟'' اشہد انہیں بتا چکا تھا مگر اس وقت اگر وہ اس سے یہ سوال نہ پوچھتیں تو اشنہ کا یہ جھکا ہوا سر کیسے دیکھتیں۔

''ابھی میٹرک کلیئر نہیں کیا۔'' سر اور نظریں جھکائے اس کے حلق سے پھنسی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔ اسے پہلی بار شرمندگی ہو رہی تھی، اپنے میٹرک نہ کر پانے۔''

''ائے ہائے...... مر جانی! یہ کم بخت میٹرک کیا ہوتا تو آج یوں سر تو نہ جھکاتی۔'' اماں نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔

''لو اماں، ابھی میٹرک بھی نہیں کیا۔ اتنی چھوٹی لگتی تو نہیں ہو۔ خیر...... لڑکوں کو پھنسانے کی ڈگری تو لے رکھی ہے۔ میٹرک کر کے کرنا بھی کیا ہے۔''

ان کی طنزیہ پاٹ دار آواز اشنہ کی سماعت سن کر گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بے یقین سی نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی کہ آیا انہوں نے وہی کہا جو اس نے سنا یا پھر...... اس کے کان بج رہے ہیں۔

''دیکھو بہن! ہمیں لگی لپٹی رکھنی نہیں آتی۔ ہم تو صاف بات کریں گے۔'' اس کی ماں گم چپ بیٹھی اماں سے مخاطب ہوئیں۔

''کچھ عرصے سے اشہد کی یہاں آمد و رفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ ہم ٹھہرے سیدھے سادے لوگ، یہی سمجھے پھپھو کی یاد آتی ہے۔ یہ تو اب جا کر پتا چلا، یہ چکر ہے۔ لڑکے بالے تو ہوتے ہی جذباتی اور دل پھینک ہیں۔ یہ تو لڑکیوں کا کام ہے کہ احتیاط کریں۔ آپ نے اپنی بیٹی کو یہ بات سمجھائی ہوتی تو آج میرے بیٹے پر ڈورے ڈالنے کے بجائے اپنی پڑھائی پوری کر رہی ہوتی۔ وہ لڑکا ایک ضد پکڑ کر بیٹھا ہے، جانے کیا گھول کر پلا دیا ہے اس نے۔ نہ ماں کی سنتا ہے، نہ بہن کی۔ معاف کرنا مگر بیٹیاں ہم نے بھی پیدا کی تھیں، بڑی عزت اور شرافت سے پروان چڑھایا۔ جس کھونٹے سے باندھا، بندھ گئیں۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ جاؤ اپنے لیے خود رشتے ڈھونڈو۔ پرائے بھائی، بیٹوں کو اپنے بس میں کر کے انہیں تگنی کا ناچ نچاؤ۔ حیا اور تربیت بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہم تو مجبور ہیں۔ بیٹے نے بھیجا اور ہم آ گئے۔ ورنہ دل کی حالت ایک اللہ جانتا ہے۔''

وہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔

اشنہ کی آنکھوں کے آگے منظر دھندلے پڑنے لگے تھے۔ وہ کس طرح باہر آئی، اسے پتا نہیں چلا۔ اس میں اماں کی سمت دیکھنے کا بھی حوصلہ نہ رہا تھا۔

وہ کب گئے۔ اماں نے انہیں کیا کہا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ گھر پر یوں خاموشی طاری تھی، جیسے موت ہو گئی ہو۔

مغرب کے بعد اسے کچھ چہل پہل محسوس ہوئی۔ شاید ابا آ گئے تھے اور احمد بھی۔

''باجی! اماں بلا رہی ہیں، آ کر کھانا کھا لو۔'' احمد دروازے میں کھڑا اسے پکار رہا تھا۔ وہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اماں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر اسے اٹھنا پڑا۔ چہرے پر خوب سارا پانی بہانے کے بعد وہ آ کر ان کے بیچ بیٹھی تھی۔

''ہور سنا، مہمان آئے تھے آج؟'' ابا کو پہلا نوالہ توڑتے ہی اپ ڈیٹ لینے کا خیال آیا اور اشنہ کو انجانی خفت سے اپنا چہرہ تپتا محسوس ہوا۔

''ہاں آئے تھے، مگر مجھے اچھے نہیں لگے۔ میں نے انکار کر دیا۔'' اماں سنجیدگی سے بولیں۔

''ہیں......'' ابا ہاتھ روک کر حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ ''کیا اچھے نہیں لگے۔ تو تو کہہ رہی تھی، مشتاق کی زنانی کا بھائی ہے۔ اچھے لوگ ہیں اور تو انہیں جانتی ہے۔ تو تو بڑا خوش تھی اور اب کہہ رہی ہے، اچھے نہیں لگے۔''

''میں کہہ رہی ہوں، اچھے نہیں لگے تو کسی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ تم بھی ناں اشنہ کے ابا...... بال کی کھال اتارنے لگتے ہو۔ نہیں بھیجنا میں نے اشنہ کو اتنی دور۔

یہیں پنڈ میں کوئی رشتہ دیکھوں گی۔ میری نظروں کے سامنے رہے گی۔" اماں نے جھنجلا کر کہا تھا۔

اشنہ نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی اور اسے وہ چہرہ دنیا کا سب سے خوب صورت چہرہ لگا۔ جوان بیٹی کی فکر، ذمہ داری، تشویش اور محبت ان کی پرسوچ آنکھوں کی گہرائیوں، ان کے تھکے تھکے چہرے کی شکنوں سے عیاں تھی۔

اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔

"اماں کتنا خوش تھیں، اور انہوں نے...... کتنی بے عزتی کی ان کی۔ صرف اور صرف میری وجہ سے۔" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ بس یہی سوچ کر نڈھال ہو رہی تھی۔

"مجھے اماں نے بتایا، آپا اور ممانی کی کمینگی کے بارے میں۔ سچ مجھے اتنا غصہ آیا، دل چاہ رہا تھا ابھی انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔ اماں بھی بڑی شرمندہ ہے۔"

افشی دوسرے دن شام کو اس سے ملنے آئی تھی اور اب اس کے سامنے بیٹھی دل گرفتی سے کہہ رہی تھی۔ سہیلی کا دکھ اسے بھی بڑا رنجیدہ کر گیا تھا۔

"انہوں نے رشتہ لے کر نہیں آنا تھا، نہ آتے۔ ہماری اتنی بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت تھی، خاص کر اماں کی۔ میں یہ کیسے بھولوں گی، ہم جاہل ہیں، پینڈو ہیں تو کیا ہماری کوئی عزت نہیں۔" وہ پھر سے رونے لگی۔ اس کے ہمدردانہ لہجے نے زخم ادھیڑ دیے تھے۔

"ان کا بیٹا میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں نے تو نہیں کہا تھا مجھ سے شادی کرلو۔"

"تو تو کہتی ناں، ویسے تو منہ میں گز بھر زبان ہے۔ تھوڑی انہیں بھی دکھا دیتی۔ جیسے انہوں نے بے عزتی کی، جواب دینا تو بنتا تھا تجھے۔" افشی کو غصہ آیا۔

"میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی تھی، ان کے الزاموں پر۔ میں کیا بولتی۔ تو مان نہ مان افشی! مجھے نذیرا کی ہائے لگی ہے۔ میں نے بھی اس کی بڑی بے عزتی کی تھی۔" اس نے کانپتے ہاتھوں میں چہرا چھپایا۔

"ایسے نہ بول، کوئی ہائے وائے نہیں لگی۔ نہ تو نے کچھ غلط کیا۔ وہ بھی تو پیچھے پڑا تھا۔" افشی نے اس کی بکھرتی حالت دیکھ کر اسے خود سے لگایا۔

"نہیں......" اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ جسم کا سارا خون گویا رخساروں اور آنکھوں میں آ ٹھہرا تھا۔ "وہ پیچھے نہیں پڑا تھا۔ اس نے تو مجھے کبھی جتایا تک نہیں۔ اس نے اور اس کے گھر والوں نے تو مجھے بڑی عزت سے مانگا تھا افشی! اتنے چاؤ سے، اتنے مان سے۔ جس طرح اس کی اماں مجھے پاس بٹھاتی تھیں، جتنی محبت سے باتیں کرتی تھیں۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے، اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایسے قدر کرنے والے لوگ کہاں ملتے ہیں کہ اتنی بار انکار سننے کے بعد بھی ان کے ماتھے پر بل تک نہ آیا اور میں نے کیا کیا۔ مجھے یہ عزت ہضم نہیں ہوئی جا کے اس کے منہ پہ مار آئی میں...... اور آج میرے منہ پر پڑ گئی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"اشنہ!" افشی نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "تو اب چھوڑ یہ باتیں...... تجھے نذیرا سے نہیں کرنی تھی...... تو تو اور کیا کرتی۔ اب ویسے ہی تیرا دل بھرا ہوا ہے تو تجھے نذیرے پر ترس آنے لگا۔"

افشی نہیں جانتی تھی کہ اشنہ کی یہ ساری باتیں کسی جذباتی رو میں بہکنے کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ کل سے مسلسل کچوکے لگاتی سوچوں کا، پچھتاووں، ارادوں اور رت جگے کا نچوڑ تھیں۔

"تو بتا، اب آگے کیا کرے گی۔ اشہد کے گھر والوں نے جو کیا انہیں جہنم میں ڈال...... تو اشہد کا سوچ۔" افشی اصل میں اسی بات کے لیے تو آئی تھی۔

"تو پاگل ہوگئی ہے افشی!" اشنہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "اب کیا سوچوں میں اس کے بارے میں۔ اب سوچنے کے لیے رہا کیا ہے۔ تجھے لگتا ہے اماں اب میرا رشتہ اشہد سے کردیں گی؟"

"مگر تجھے سوچنا پڑے گا۔ اشہد تجھ سے پیار کرتا ہے اشنہ۔" اس نے یاد دلایا۔

"نذیرا بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔" اشنہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"تو کیا کہنا چاہتی ہے۔" وہ گھبرا گئی اس کے تیور دیکھ کر۔

"میں...... نذیرا سے شادی کروں گی۔" وہ ایک پل کو نہ ہچکچائی یہ بات کرنے میں۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے اشنہ!" افشی چلا اٹھی۔

"نہیں...... اب ٹھیک ہوا ہے۔ مجھے مت بتا، مجھے کیا کرنا ہے۔ میں فیصلہ کر چکی۔" اس کے انداز میں جتنی سختی تھی، افشی سانس روک کے اسے دیکھنے لگی۔

"تو ضد میں آ گئی ہے اشنہ! دیکھ تو ایک بار پھر اشہد سے بات کر لے۔ وہ بہت پریشان ہے۔ آیا بیٹھا ہے پھر جو چاہے کر۔" اسے لگ رہا تھا اب اشہد ہی اسے باز رکھ سکتا ہے۔

"کیا بات کروں گی میں اشہد سے، اور وہ کیا بات کرے گا۔ یہ معاملہ اب اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کے یا میرے بات کرنے سے ٹھیک نہیں ہو گا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو ٹھیک ہے پھر انتظار کر لے...... مگر یہ شادی والی بکواس مت کر۔" افشی بھی بگڑ گئی۔

"انتظار کرنے سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے اب اشہد سے شادی کرنی ہی نہیں ہے، جو بے عزتی اس کی ماں بہن نے میری اس روز کی تو چاہتی ہے میں وہ ہر روز سہوں۔"

"مگر اشنہ! تو بھی تو اسے پسند کرتی تھی۔" وہ روہانسی ہو گئی اسے سمجھاتے سمجھاتے۔

"صرف پسند کرتی تھی افشی! اور شادی صرف ایک بندے سے نہیں ہوتی اس کے پورے ٹبر سے ہوتی ہے۔ دیکھ لیا میں نے اشہد کا ٹبر اور مجھ میں ہمت نہیں ہے ان کا حصہ بننے کی۔ اس لیے مجھے نذیرا کا ٹبر سو سو بار قبول ہے، تو فکر مت کر۔ میں نذیرے کے ساتھ بہت خوش رہوں گی، تو دیکھے گی۔" اس کے لہجے، اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا عزم تھا، مضبوطی تھی۔ افشی مزید کچھ نہ کہہ پائی۔

☆☆☆

اس دن جب وہ نذیرے کی دکان تک آئی تو کسی ڈر، کسی جھجک نے اس کا رستہ نہ روکا۔ کوئی اندیشہ دامن گیر نہ ہوا۔ دل یوں پرسکون تھا، جیسے اب اپنے اصل ٹھکانے پر پہنچا ہو۔

وہ حسب معمول دکان کے اندر تھا۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر متحیر رہ گیا تھا اور آنکھوں میں وہی والہانہ سی بے اختیاری۔

مگر آج اشنہ کو اس کی نظروں پر غصہ نہیں آیا۔

"مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔" وہ اسے متوجہ پا کے دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"ہاں، پوچھیں نا جی۔ میں سن رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کیسے بتاتا، تم بات کرتی ہو تو میرا ہر ایک عضو کان بن جاتا ہے۔

"کیا تو...... میری اس دن کی ساری باتوں کو بھول کر اپنی اماں کو دوبارہ میرے گھر بھیج سکتا ہے؟" وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کے سوال کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں جو ستارے اترے تھے، وہ اس کے جواب سے پہلے ہی اشنہ تک اس کا جواب پہنچا گئے۔ اس کی زبان گنگ تھی مگر اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر اشنہ مزید وہاں نہیں ٹھہری تھی۔

☆☆☆

"تو نے یہ اچھا نہیں کیا اشنہ! تو نے میرا ذرا نہ سوچا۔"

اس کا رشتہ طے ہو جانے کی خبر اشہد کو ملی تھی اور وہ تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اشنہ اس دن بھی اس سے نہیں ملی تھی، جب افشی نے اسے ملنے کا کہا تھا۔ عین وقت پر اشہد سے مل کے یا اسے دیکھ کے اس کا ارادہ پھر سے ڈانواں ڈول ہو جائے۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اشہد مزید کسی آس یا خوش گمانی میں رہے، اسی لیے اب خود پر نذیرے کے نام کا ٹھپہ لگا کر ہی اس سے ملنے آ گئی تھی۔

اور اس وقت وہ دکھ اور بے بسی اس کے لہجے

سے چھلکی تھی۔ شکوہ کرتے ہوئے آواز دھیمی پڑ گئی۔
''تیرا تیرے گھر والوں نے نہیں سوچا، میں کیوں سوچتی۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''بتایا ہوگا تجھے اشنی نے، تیری ماں اور بہن نے کیا کیا ہمارے ساتھ۔''
اشہد کا چہرا سرخ پڑا۔ کنپٹی کی رگ پھڑک اٹھی۔
''مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی، وہ میرے ساتھ یہ سب کریں گے۔ تم مجھے تھوڑا ٹائم تو دیتیں۔''
''تو کیا کر لیتا۔ اپنے گھر والوں کو دوبارہ آنے کے لیے راضی کرتا؟ وہ تو نہ آتے، آ بھی جاتے...... تو...... اتنی بے عزتی کے بعد میری ماں کبھی میرا رشتہ نہ دیتی۔ بھلے مر جاتی۔ بہت غیرت والی ہے میری ماں۔'' بیتی ہوئی تکلیف پھر سے اس کی آنکھوں سے مترشح ہوئی تھی۔ وہ نظریں چرا گیا۔
''ابھی بھی وقت ہے۔ بھاگ چل میرے ساتھ۔'' وہ بنا سوچے سمجھے بولا تھا۔ انداز میں شدت تھی۔ اشنہ ساکت سی رہ گئی تھی۔
''گھر والے تیرے نہیں مان رہے اور کالک میں اپنے ماں باپ کے منہ پر پوتوں۔ سچ ثابت کردوں تیری اماں اور بہن کی باتوں کو۔ اتنی ہلکی ہوں نا میں۔'' اس کا کاٹ دار لہجہ بھیگا۔
''میں جانتا ہوں تو خوش نہیں رہے گی اشنہ! یہ شادی مت کر۔'' وہ منت کرنے لگا۔
''میں بہت خوش رہوں گی، جیسے وہ سب ہیں۔ ویسی میں بھی ہوں۔ وہاں کوئی مجھے جاہل کہنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھے نیچا دکھانے والا خود کو مجھ سے اونچا سمجھنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھ سے یہ نہیں کہے گا کہ میں نے ڈورے ڈال کر ان کے بیٹے کو پھنسایا ہے۔ وہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ میں جہاں ہوں مجھے وہیں رہنے دے۔ تیرے گھر آ کر میں ویسے بھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتی۔ پودا جس زمین، جس مٹی کا ہو وہیں ہرا بھرا رہتا ہے۔ اور میں بھی مرجھانا نہیں چاہتی۔'' اس کا لہجہ بھرایا تھا۔
وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا بس۔ اس کی محبت کا پودا بھی اماں اور آپا نے ایسا اکھاڑا تھا کہ اب اس کے سرسبز رہنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔
''تو کسی اچھی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرلے، ہاں مگر اس لڑکی سے شادی مت کرنا جس سے تیری آپا اور اماں کرانا چاہتی ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد اب مجھے ان کی پسند پر بھروسا نہیں رہا اور میں چاہتی ہوں تو خوش رہے۔''
''کتنی فکر ہے میری خوشی کی۔'' اس کے لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ بکھری۔ ''میری خوشیاں تو تو اس سائنڈ کو دینے جا رہی ہے۔''
''اشہد! مت کر۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج آسمایا۔ ''تیری خوشیاں ہوتیں تو تجھے ہی ملتیں۔ سمجھ تیری تھیں ہی نہیں۔''
''میرے سامنے فلسفہ مت بگھار۔ جا، ہٹ جا میرے سامنے سے۔ چلی جا اشنہ! ورنہ سچ کہہ رہا ہوں، اٹھا کے لے جاؤں گا تجھے۔ تیرا احلوائی ڈھونڈتا رہ جائے گا۔'' دونوں ہاتھوں کو بالوں میں پھنسائے اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔
اشنہ چند لمحے اسے یوں ہی حیران و متاسف نظروں سے دیکھتی رہی، پھر نظریں چراتے، لب کچلتے وہ سرعت سے وہاں سے نکل آئی تھی۔ پیچھے ایک نشانی اشہد کے قدموں میں چھوڑ کے۔ اشہد نے جھک کے وہ ہیئر کلپ اٹھایا۔ مٹھی میں جکڑ کے اس نے اسے اپنے دل کے بے حد قریب رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

''اشنہ! تو تو پہچانی نہیں جا رہی...... یہ تو ہی ہے ناں؟''
وہ شادی کے بعد پہلی بار آئی تھی، نذیرے کے سنگ بنی سنوری۔ چہرے پر انوکھے رنگ لیے۔ نذیرا بھی سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں اپنے معمول کے حلیے کے برعکس کافی اچھا لگ رہا تھا۔
''تو خوش تو ہے ناں؟'' وہ اسے اکیلے گھیر کے بیٹھی تو پہلا سوال یہی کیا۔
''تجھے کیسی لگتی ہوں؟'' کانوں میں پڑے بھاری جھمکوں کے باعث دکھتی لو کو دباتے ہوئے اس

نے ہنس کر کہا۔
''لگ تو خوش ہی رہی ہے۔'' افشی کا انداز اب بھی ایسا تھا گویا یقین نہ کر پا رہی ہو۔
''اچھا سن...... تیرے لیے خوب سارا میوہ ڈال کے اسپیشل گاجر کا حلوہ تیار کروایا ہے۔ تجھے بہت پسند ہے ناں۔'' وہ اٹھ کر مٹھائیوں کے ڈبے دیکھنے لگی جو وہ ساتھ لائی تھی۔
''اگر مجھے پتا ہوتا کہ میری بات یوں پوری ہوگی تو میں اس وقت کوئی اور دعا مانگ لیتی۔'' افشی ہنسی۔
''کون سی بات؟'' وہ چونکی۔
''یہی کہ نذیرے سے شادی کرلے تاکہ پھر خود بھی حلوے کھائے اور ہمیں بھی کھلائے۔''
''ارے میں نہیں کھاتی، بلکہ اسے بھی نہیں کھانے دیتی۔'' اشنہ نے بے نیازی سے کہا۔
''وہ کیوں بھلا...... تیری جگہ میں ہوتی تو......'' افشی کو قلق ہوا۔
''مجھے میٹھا نہیں پسند، تو جانتی ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے جب تک اس کا وزن ستر کے جی پر نہیں آجاتا، وہ میٹھے کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔'' اس نے بڑے ناز سے بتایا تھا۔
افشی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
''واہ بھئی، تو نے اسے ابھی سے اپنی راہ پر لگا دیا۔ مجھے یقین ہے جلد ہی وہ تیرے برابر کا لگنے لگے گا۔''
اشنہ ہنستی چلی گئی۔
''وہ کہتا ہے تو بول تو مر کے دکھادوں۔ یہ وزن کم کرنا تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔'' پراندے کے موتیوں سے کھیلتی اس کے چہرے پر شرم آگیں مسکراہٹ تھی۔
''میں نے کہا تھا ناں، بہت پیار کرتا ہے تجھ سے۔'' افشی کو اپنا اندازہ درست ثابت ہونے پر خوشی ہوئی تھی۔
''دل کا بہت بھولا اور سادہ ہے۔ میں واقعی خوش ہوں افشی! جیسے میں نے تجھے کہا تھا۔'' اسے اپنے الفاظ سے یقین دلانے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے چہرے پر صاف نظر آرہا تھا۔
نذیرے نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تو تو اس دن بہت غصے میں آئی تھی پھر تجھے مجھ پر ترس کیسے آگیا۔'' وہ ابھی تک حیران اور بے یقین تھا۔ سارا سارا دن اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے وہ خود ہی خود کو اپنی خوش بختی کا یقین دلاتا رہتا۔
''بس آگیا ترس...... تو نے ہی کرایا ہوگا کوئی جادو ٹونا۔'' وہ اب اسے کیا بتاتی۔ آسمانوں کی سیر کرنے نکلی تھی، کسی نے زمین پر پٹخ کر اوقات بتادی۔
''جادو ٹونا تو نہیں...... میں تو بس ایک ہی دعا مانگتا تھا۔''
''کیا......؟'' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ حیرت بھی ہوئی۔ وہ دعا بھی مانگتا تھا۔
''کہ تیرا دل میرے لیے نرم پڑجائے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔
اور ایک پل کے لیے اس کی دھڑکن تھم سی گئی۔
''تو یہ تیری دعائیں ہی تھیں جس نے مجھے کسی اور کا بننے نہیں دیا۔'' وہ سوچ ہی سکی، کہا کچھ نہیں۔ بس مسکرادی تھی۔
وہ جان گئی تھی جس طرح صرف ظاہری شکل و صورت سب کچھ نہیں ہوتی۔ اسی طرح صرف محبت بھی سب کچھ نہیں ہوتی۔ جب تک اس محبت کے ساتھ عزت اور مان بھی نہ ملے، چاہے وہ محبوب سے ہو یا اس سے وابستہ رشتوں سے۔
محبت نذیرا بھی کرتا تھا اور محبت اشہد نے بھی کی تھی۔ مگر اشہد کی محبت کے ساتھ جو کانٹے تھے وہ تاعمر اس کی عزت نفس کو تار تار کرتے جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ وہ اشہد کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوتی تب بھی نہیں...... اور اسی لیے اس نے اس سیدھے سادے حلوائی کا ہاتھ تھام لیا تھا، جس کی محبت کی چاشنی نے اس کی زندگی میں بڑے خوب صورت رنگ بھر دیے تھے۔

☆

فائزہ ثمرین

بیلا نے سنگنگ کمپیٹیشن میں حصہ لیا اور جیت گئی۔ وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہاں اس کی اجازت نہ تھی۔ اپنے نانا کا خواب پورا کرنے کے لیے وہ اس میں حصہ لیتی ہے۔ جب ان کو پتا چلتا ہے تو وہ اپنی بیٹی کا سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک مشہور موسیقار ہیں۔

قاری عبدالوہاب صاحب ملک گیر شہرت کے حامل تھے انہیں قاری عبدالباسط کا شاگرد ہونے کی وجہ سے مصر میں بھی پذیرائی حاصل تھی۔

مایا بیلا کے گھر فون کر کے بتا دیتی کہ اس نے موسیقی کے پروگرام میں حصہ لیا ہے۔ اس کے گھر میں بھونچال

آجاتا ہے لیکن ابا بہت خوش ہوتے ہیں۔

بیلا کی خالہ اور کزن ییشا بھی بہت خوش ہوتے ہیں وہ خود بھی موسیقی کی دنیا سے وابستہ ہیں۔

تقسیم سے پہلے تارا سنگھ اور امانت علی کے گھر آمنے سامنے ہوتے ہیں دونوں کو موسیقی سے لگاؤ ہے۔ دونوں گھرانوں کے لوگ مغل دربار میں گا کر داد وصول کرتے تھے۔

تارا سنگھ اور امانت علی کے درمیان گائیکی کا مقابلہ ہونا ہے دونوں اس کی تیاری کرتے ہیں۔

مکمل ناول

1947 میں ساون کا مہینہ تھا، دونوں کے مقابلے کی گونج دور تک تھی مقابلے کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ یہ مسلم اور غیر مسلم موسیقار کا مقابلہ بن گیا۔ جگجیت خبر دیتا ہے کہ انہیں مارنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ امانت پاکستان جانے سے انکار کرتا ہے لیکن۔

گھر والے پاکستان چلے جاتے ہیں امانت چھپ جاتا ہے گھر کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچ جاتا ہے۔

بیلا مقابلے میں اس راگ کو گاتی ہے جو امانت علی نے سالوں سے اپنے دل میں چھپا رکھا ہوتا ہے۔

بیلا پھپھو کے گھر ان کے بیٹے عاطف کے لیپ ٹاپ سے دادا جی سے بات کرتی ہے ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے وہ سب ایمر جنسی میں پاکستان آتے ہیں۔

افنان اسے اسٹیج پر پروپوز کرتا ہے۔ بیلا جواب دیے بغیر آگے بڑھ جاتی ہے۔

بیلا کے والد افنان کے رشتے پر راضی ہوتے ہیں لیکن مریم اس کی مخالفت کرتی ہیں۔ تمام مخالفتوں کے باوجود افنان اور بیلا کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ ہنی مون کے لیے انڈونیشیا کے جزیرے پر جاتے ہیں۔

ان کی شادی کو تین سال ہو جاتے ہیں۔ وہ موسیقی کے میدان کامیابیاں اور ایوارڈ جیتتے ہیں۔ بیلا تھکنے لگی تھی۔ اس کی بہن کے پریگننٹ ہونے کی وجہ سے وہ بھی اب بچہ کی خواہش کر رہی تھی۔ اس دوران انکشاف ہوتا ہے کہ گانے کے ذریعے خفیہ پیغام دیا جاتا ہے، نوجوان خودکشی کرنے لگتے ہیں۔

ان کے خلاف مقدمہ چلتا ہے، وہ افنان اور میوزک کمپنی والوں کی بات سن لیتی ہے اور افنان کو یہ سب چھوڑنے کا کہتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔

افنان سے ناراض ہو کر بیلا پاکستان آجاتی ہے۔ یہاں آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ وہ پریگننٹ ہے۔ وہ دادا جان سے معافی مانگتی ہے۔ بیلا کمپنی کے خلاف گواہی دیتی ہے، تہلکہ مچ جاتا ہے۔ اس کا انٹرویو ہوتا ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

"جی......؟"

رابیل الجھی تھی۔ "میں رجونت سنگھ ہوں جی۔ افنان نے بتایا ہوگا میرے بارے میں۔"

"اوہ۔" بیلا چونکی تھی۔

"جی، جی۔" اسے اچانک ہی یاد آیا تھا، جاتے سے افنان نے اسی کا کارڈ دیا تھا۔

"بھابھی آپ ایئرپورٹ آجائیں، ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آپ کی فلائٹ ہے پاکستان کی۔"

"واٹ......؟" اس کی بات پہ بیلا چونک گئی تھی۔

"جی، میں وہیں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہیں آجائیں۔"

"دوبارہ ہوٹل جا کر سامان اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے کال کاٹ دی تھی اور گاڑی چلاتے، اسٹیرنگ پہ رکھے بیلا کے ہاتھ کپکپائے تھے اور آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے، وہ نہیں تھا مگر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ دور تھا مگر پاس محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن ایک خیال اب بھی رہ رہ کر اسے چبھ رہا تھا، کیا یہ بیلا اور اپنے بچے کی محبت تھی جس نے اس سے وہ بیان دلوایا تھا، یا اس کے دل میں ایمان کی بجی بجھی کوئی سلگتی چنگاری تھی، جو بھڑک کر الاؤ بن گئی تھی۔

☆☆☆

"بیلا! مجھے یاد ہے، تقریباً چار ساڑھے چار سال پہلے جب آپ دوستی سے سنگنگ کمپیٹیشن

پروگرام جیت کر آئی تھیں۔ تب بھی میں نے آپ کے ساتھ ایک پروگرام کیا تھا اور آج جب آپ انگلینڈ سے کیس جیت کر آئی ہیں، تو اب ایک بار پھر میرے پروگرام میں موجود ہیں۔ تب اور اب میں جو فرق آیا ہے وہ نظر تو آ رہا ہے کل کی فیشن ٹرینڈر آج گاؤن اور حجاب میں ملبوس ہیں مگر...... یہ چینج آیا کیسے اور تقریباً اس چار سال کے عرصے میں آپ نے کیا کھویا، کیا پایا، یہ جاننے میں ہمارے ناظرین یقیناً دلچسپی لیں گے۔"

مہر خان نے ابتدائی کلمات ادا کرنے کے بعد، سوسائیڈ اسکینڈل اور اس کے نتیجے میں بننے والے حالات سے بالکل ہٹ کر سوال کیا تھا۔

"چار سال کے سفر میں کیا کھویا کیا پایا۔" اس کا سوال دوہرا کر بیلا مسکرائی تھی۔

"جو کھویا ہے وہ بہت کم ہے، اس کے مقابلے میں جو بچا کر لے آئی ہوں، لیکن یہ ایک ایسا سفر تھا جس کی شروعات دیومالائی سی تھی۔ بالکل فیری ٹیلز جیسی۔ جس میں ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ ایک شہزادہ تھا۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بول رہی تھی۔

"اور شہزادہ اس لڑکی کا دل جیت کر، اسے پریوں کے دیس میں لے گیا، مگر حقیقت بہت تلخ تھی، ملکہ بننے کی بہت بھاری قیمت تھی جو اس لڑکی کو چکانی تھی۔"

اس کا مسکراتا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔

"اور بات صرف اس لڑکی تک ہی محدود نہیں تھی، ہزاروں لوگوں کی جان اور ایمان خطرے میں تھا۔ تو بس پھر وہ لڑکی قیمت نہیں چکا پائی۔ اپنی جان اور ایمان بچا لائی۔ اور جو بچا لائی وہ بہت قیمتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ایمان سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں اپنی جان بھی نہیں۔"

مہر خان نے اس نے خاموش ہونے پر اگلا سوال کیا۔

"بیلا اگرچہ میں بات کو اس رخ پہ لے جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر بات چل ہی نکلی ہے تو یہ بات بھی ہمارے ناظرین کے لیے باعث دلچسپ ہوگی، بیک ٹریکنگ کیا ہے؟ یہ تو آپ اپنی ویڈیوز میں، سوشل میڈیا پہ کافی تفصیل سے بتا چکی ہیں۔ مگر کون کون سی میوزک کمپنیاں اس میں ملوث ہیں، ہمارے ناظرین اس سے کیسے بچ سکتے ہیں اس پہ روشنی ڈالیے گا۔"

کیمرے کا رخ اب بیلا کی طرف تھا۔ پروگرام کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ عملے کے علاوہ ناظرین کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ بیلا ایک پل کو رکی۔

"دیکھیں، میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون کون سی میوزک کمپنیاں اس میں انوالو ہیں اور کس حد تک انوالو ہیں، ہوسکتا ہے کہ ساری میوزک کمپنیاں ہوں، ہوسکتا ہے کہ اکا دکا ہی ہوں۔ مجھے جتنی حد تک علم تھا، میں بتا چکی ہوں۔"

"او کے۔"

مہر خان کو اگر کسی انکشاف کی امید تھی تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔

"ناظرین میں سے اگر کوئی سوال کرنا چاہے اس بارے میں تو کر سکتے ہیں۔"

اس نے ہال میں بیٹھے ناظرین کی طرف رخ پھیرا تو ان میں ہلچل ہوئی تھی۔ مختلف لوگوں نے ہاتھ کھڑے کیے تھے۔

مائک ہاتھ میں لیے ایک لڑکی لوگوں تک چلی گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے بیلا پہ سلامتی بھیجی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" بیلا مسکرائی تھی۔

"بیلا جی! سب سے پہلے تو یہ بتادوں کہ میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں اور جب سے پتا چلا ہے کہ آپ نے سنگنگ چھوڑ دی ہے تو بہت افسوس ہوا ہے۔" وہ ایک پل کو رکی۔

"میرا سوال یہ ہے کہ مجھے میوزک بہت پسند ہے، اس کے بغیر تو میں کوئی کام کر ہی نہیں سکتی،

مطلب میرے لیے اسے چھوڑنا بہت مشکل ہے، لیکن جب سے آپ کی بیک ٹریکنگ والی ویڈیوز دیکھی ہیں تو، ڈر بھی لگنے لگا ہے۔ تو میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کوئی ایسا سائن بتا سکتی ہیں جس سے ہمیں پتا چل سکے کہ کسی گانے میں بیک ٹریکنگ ہوئی ہے، کوئی پوشیدہ پیغام ہے یا نہیں۔"

لڑکی واضح طور پہ نروس تھی۔ اس کے انداز میں بے ربطی بھی تھی لیکن اس نے اپنا سوال سمجھا دیا تھا اور اس کا سوال سن کر بیلا گہری سانس بھر کر رہ گئی تھی۔ ایک ایسی بات جسے سن کر وہ پوری کی پوری ہل گئی تھی اور اپنا سارا کیریر چھوڑ کر بلکہ اپنی جان داؤ پہ لگا کر آ گئی تھی۔ وہ اس لڑکی پہ اتنا اثر بھی نہیں کر سکی تھی کہ وہ گانا سننا ہی چھوڑ دے۔ واقعی دنیا میں ہونے والے واقعات مختلف افراد پہ مختلف اثرات چھوڑتے ہیں کسی کو پورا کا پورا بدل دیتے ہیں تو کسی کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

"اس کا کوئی سائن......؟" وہ ایک پل کو رکی۔

"دیکھیں، ایک مسلمان کے لیے اصل خوش نصیبی کی بات تو یہ تھی کہ اس کے رب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ گانا اور موسیقی شیطان کی آواز ہے تو ایک مسلمان کے لیے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے تھا اور اسے یہ کام چھوڑ دینا چاہیے تھا مگر خیر......" وہ رکی، ایک گہرا سانس ہوا کے سپرد کیا۔

"آپ اگر میوزک کی شوقین ہیں تو آپ نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ موسیقی سنتے وقت آپ بالکل مست اور بے خود سے ہو جاتے ہیں۔ اپنی انگلیوں سے موسیقی کی تان کا ساتھ دیتے ہوئے آپ اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں محسوس کرتے ہوں گے۔ ہے ناں۔"

وہ خصوصی طور پہ اس لڑکی اور عمومی طور پہ پورے ہال سے مخاطب تھی۔

"جی......" لڑکی نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تھا۔

"ایسے وقت میں اگر آپ سے کوئی کام کرنے کو کہا جائے، یا کوئی بات بتانے کی کوشش کی جائے، تو آپ ناگواری محسوس کرتی ہوں گی، بلکہ بتانے والے سے بدتمیزی تک کر جاتی ہوں گی۔ یعنی آپ اپنے اور اس میوزک کے درمیان رکاوٹ کو پسند نہیں کریں گی اور جب وہ میوزک بند ہوگا تو آپ اپنے آپ کو اندر سے بالکل خالی خالی سا محسوس کریں گی اور پھر یہ اس بات پہ بھی ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ کو کس قسم کا میسج دیا جا رہا ہے۔ موسیقی دل میں نفاق کے جذبات جگاتی ہے۔ موسیقی سننے والے کے دل کی تاریں جب جھرجھری لیتی ہیں تو اسے جو محسوس ہوتا ہے، جو کچھ کرنے کو اس کا دل چاہتا ہے، وہ اس پیغام کا معکوس نقش ہوتا ہے، جو اس کے کانوں کے ذریعے دماغ کے نہاں خانوں تک پہنچتا ہے۔ انہیں اگر اس شوق سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے تو وہ برہم ہو جاتے ہیں۔ یہ تو کچھ عمومی اثرات تھے، موسیقی کے جو میں نے آپ کو بتائے، باقی بیک ٹریکنگ کی کوئی خاص نشانی یا ایسے گانے کے بارے میں پتا چلانے کا طریقہ کار تو میں بھی نہیں جانتی تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ میوزک کم سے کم سنیں۔"

بیلا نے اپنی طرف سے خاصا تفصیلی جواب دیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ لڑکی سمجھی یا نہیں مگر مائک اب ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"میں میوزک سنتا ہوں۔ مگر ایسے اثرات سے بالکل محفوظ ہوں جیسا کہ آپ نے ابھی ذکر کیا ہے۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ شہرت حاصل کرنے کے لیے چھوٹی سی ایک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہی ہیں۔"

ہال میں موجود نفوس پہ سکتہ طاری تھا، یہ واضح طور پہ بیلا پر چوٹ تھی۔

"دیکھیں۔" وہ ایک پل کو رکی، اگرچہ وہ اس قسم کے سوالات کے لیے تیار تھی، مگر پھر بھی اسے دکھ ہوتا تھا۔

"جہاں تک شہرت کی بات ہے تو میں اور افنان شہرت کی جن بلندیوں پہ تھے، اس سے مزید اوپر

جانے کی خواہش نہیں تھی مجھے اور جہاں تک بات اس کے اثرات کی ہے تو بیک ٹریکنگ کا اثر لاشعوری طور پر ذہن سے ہوتا ہوا روح تک پہنچتا ہے، اب یہ اس شخص کی، روحانی، ذہنی اور جسمانی کیفیت پہ منحصر ہے، کہ جو ذہن اس پیغام کو ڈی کوڈ کر رہا ہے اس کی کیا کیفیت ہے، جیسے میڈیسن کو لے لیں۔ ایک شخص کو پہلی خوراک سے فائدہ ہوتا ہے، دوسرے پر یہی خوراک زیادہ استعمال کے بعد اثر کرے گی، بالکل اسی طرح کوئی شخص ایک بار سن کر متاثر ہوتا ہے اور کسی دوسرے پہ دس دفعہ سننے کے بعد بھی اتنا اثر نہیں ہوگا۔ جو لوگ مضبوط اعصاب کے ہوتے ہیں کم جذباتی، کم وہمی ہوتے ہیں، نشہ استعمال نہیں کرتے، ڈیپریشن کا شکار نہیں ہوتے، ان پر پوشیدہ پیغام دیر سے اثر انداز ہوں گے۔"

وہ بہت نرم سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دے رہی تھی اور اس کے الفاظ دل پہ اثر کرتے تھے۔

بیلا کے خاموش ہونے پر ہال میں گونجنے والی تالیاں بتاتی تھیں کہ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالوں کو جواب مل گیا تھا، مہر خان بھی ہولے ہولے اثبات میں سر ہلاتی متاثر سی لگ رہی تھی۔

"اچھا بیلا! ہم پروگرام کے موضوع سے بالکل ہٹ گئے ہیں اس بارے میں تو آپ کافی کچھ پہلے بھی بتا چکی ہیں۔ دراصل اس پروگرام میں ہم آپ سے کچھ الگ نوعیت کے سوال کرنا چاہ رہے تھے۔" اس نے گفتگو کا رخ موڑ دیا تھا۔

مہر خان اب بیلا سے مختلف سوالات کر رہی تھی اور اس کے سوالات میں آنے والا افنان کا ذکر بیلا کا دھیان بار بار بھٹکا رہا تھا، اسے پاکستان واپس آئے ڈیڑھ، دو ہفتے ہو گئے تھے اور افنان ابھی تک منظر سے غائب تھا۔ وہ کہاں تھا؟ وہ کب بیلا سے ملے گا؟ بیلا لاعلم تھی۔ مگر اس کا رواں رواں اس کا منتظر تھا۔ جس نے اسے بچانے کے لیے خود کو داؤ پہ لگا دیا تھا۔

☆☆☆

اپنے گیت کی کمپوزنگ کرتے ہوئے بیشا کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا کچھ مسنگ تھا مگر کیا......؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ بالکل درست سمت میں جا رہی تھی، مگر گیت کا تاثر ویسے نہیں بن پا رہا تھا، جیسا وہ چاہ رہی تھی۔ آخر وہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ چھاڑ کر نانا جی کی طرف جانے کا سوچتی گاڑی لے کر نکل گئی تھی، وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھی۔ اس کے زیادہ تر گیتوں کی کمپوزنگ اس نے اور نانا جی نے مل کر کی تھی اور وہ سب ہی بے حد پسند کیے گئے تھے۔ کبھی کبھی بیلا بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی تھی۔ نانا جی کے گھر کی طرف جاتے اس کا دھیان بیلا کی طرف بھٹک گیا تھا۔ اچھے بھلے کیریر کے عروج پہ پہنچ کر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر آ گئی تھی۔

"نانا جی سے کہتی ہوں کہ اس سے بات کریں، میرے نئے آنے والے البم میں اگر وہ بھی ایک دو گیت گا لے گی تو ریٹنگ آسمان کو چھونے لگے گی۔"

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ اس نے تو بیک ٹریکنگ کی وجہ سے گائیکی چھوڑی ہے اور اب یہ گیت تو ہم خود ہی کمپوز کریں گے۔ تو ظاہر ہے کہ اس میں تو کوئی پوشیدہ پیغام نہیں ہوگا، یہ تو وہ گا ہی لے گی۔

وہ جیسے جیسے غور کرتی جا رہی تھی، اس کا جوش بڑھتا جا رہا تھا، گاڑی گیٹ سے اندر لے جاتے، بریک لگاتے وہ اسی موضوع پہ سوچ چکی۔

"نانا جی......!"

وہ سیدھا پچھلے پورشن میں بنے ان کے کمرے کی طرف گئی تھی۔ اگلا پورشن جس میں کبھی ان کے شاگرد ریاض کرتے تھے، گرا کر اب نئے سرے سے بنوایا گیا تھا اور اس میں غلام حسین اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ البتہ پچھلا پورشن جوں کا توں برقرار تھا، وہی بڑے بڑے اونچی چھتوں والے کمرے، راہداریاں اور بڑا سا دالان...... اور جامن اور آم کے پیڑ جن پہ کبھی بچپن میں وہ جھولا جھولتے تھے۔ اس پورشن میں نانا جی رہائش پذیر تھے یا بھی نیلم

اور مریم آجاتیں تو وہ بھی اسی پورشن میں رہتی تھیں۔
"نانا جی......!" کوئی جواب نہ ملنے پہ یشا نے تھوڑا اونچی آواز میں ان کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ سامنے ہی جائے نماز پہ دوزانو بیٹھے تھے اور ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ یشا حیران ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھار ہی نماز پڑھتے تھے اور اب تو نماز کا ٹائم بھی نہیں تھا، یا شاید تھا، اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلنے پہ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تھا اور یشا کو لگا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر صرف ایک پل کی بات تھی۔ انہوں نے دعا مکمل کر کے چہرے پہ ہاتھ پھیرے تو اگر آنسو تھے بھی تو ان کا نشان بھی مٹا دیا اور ان کے کمرے میں موجود میوزک انسٹرومنٹ (آلات موسیقی) جنہیں وہ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے غائب تھے۔ یشا وہیں دروازے میں کھڑی حیرت سے دیکھے گئی۔

"آجاؤ بھئی رک کیوں گئیں......؟" اسے وہیں دروازے پہ ہی کھڑا دیکھ کر انہوں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"جی، میں بس......"
ان کی مسکراہٹ نے یشا کو حوصلہ دیا تھا اور وہ اپنی حیرت چھپاتے اندر آگئی تھی، وہ اب مسہری پہ آکر بیٹھ گئے تھے، یشا بھی ان کے ساتھ وہیں ٹک گئی۔
"ابھی کل ہی نیلم آئی تھی تو بتا رہی تھی......کوئی نیا البم لا رہی ہو مارکیٹ میں اور اسی میں مصروف رہتی ہو آج کل۔" اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے خود ہی بات شروع کی تھی۔
"جی، اسی وجہ سے تو چکر نہیں لگا پائی ادھر کا، مما سے بھی تفصیلی بات چیت کیے کافی دن ہو گئے۔ بس آتے جاتے یوں ہی سرسری سا حال احوال لے لیتی تھی، پتا تو ہے آپ کو کام کرتے ہوئے اردگرد کا ہوش کہاں رہتا ہے مجھے، ابھی بھی البم پہ ہی کام کر رہی تھی، مگر بات بن نہیں پا رہی تھی کچھ تھا جو مسنگ تھا، تو

آپ کے پاس چلی آئی۔"
یشا نے ہلکے پھلکے انداز میں تفصیلی جواب دیا تھا، اسے پتا تھا اب وہ اس سے گانے کی فرمائش کریں گے اور ساتھ ساتھ اصلاح بھی کرتے جائیں گے۔
"ہوں۔" وہ کچھ کہنے کے بجائے ہنکارا بھر کر رہ گئے تھے۔ یشا نے الجھ کر انہیں دیکھا، وہ خاموش سے تھے۔
"سناؤں......؟" آخر انہیں خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی کہا۔
"نہیں۔"
ایک لفظی جواب تھا، مگر یشا دنگ رہ گئی تھی حیرت اتنی تھی کہ کچھ کہنے کے بجائے وہ یک ٹک انہیں دیکھے گئی وہ خاموشی سے دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ یشا نے یونہی ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا وہاں جہاں کبھی ان کے پرکھوں کے طبلے پڑے ہوتے تھے۔ اب کچھ نہیں تھا۔"
"آ، آپ......آپ کی طبیعت......؟" یشا کی زبان لڑکھڑائی تھی۔
"طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کی کیا......؟" الفاظ میں واضح بے ربطی تھی۔
"ہاں ٹھیک ہی ہوں، بڑھاپا تو خود ایک بیماری ہے بٹی! بس اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے، ٹھیک ہی ہوں، شکر ہے اللہ کا، کیوں تمہیں بیمار لگ رہا ہوں؟" وہ پھیکا سا مسکرائے تھے۔
"ہاں......نہیں......مگر آپ نے کمرے کی سیٹنگ چینج کی ہے وہ آپ کے ساتھی کہاں گئے؟" وہ اپنے آلات موسیقی کو ساتھی ہی کہا کرتے تھے۔
"آہ، ساتھی؟ ساری زندگی جنہیں دوست اور ساتھی سمجھا، آخری عمر میں آکر پتا چلا کہ وہ تو سب سے بڑے دشمن تھے۔" وہ ہلکی سی آہ بھر کر کہہ رہے تھے۔
"کیا مطلب؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ کمرے سے سارے انسٹرومنٹس ہٹا دیے۔ میرا گیت سننے سے انکار کر

دیا...... بیلا۔" پھر جیسے ایک دم سے اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔

"بیلا کی وجہ سے نانا جی! آپ نے اپنا برسوں کا ریاض اور فن چھوڑ دیا ہے، کیا مذاق ہے۔" وہ سمجھ کر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ تو پاگل ہے، وجے اور افنان کی آپس میں کی گئی باتوں کو سن کر خود بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گئی ہے، جانتی کیا ہے وہ بیک ٹریکنگ کے بارے میں، نیٹ سے اٹھائی گئی انفارمیشن اور کچھ کتابیں پڑھ کر اب ہر جگہ وہی راگ الاپتی پھر رہی ہے اور چلیں مان لیا کہ ایسا کچھ ہے مگر آپ؟ آپ کو کیا ہوا؟ ساری زندگی آپ کی اسی فیلڈ میں گزری ہے، ہر کوئی تو ایک جیسا نہیں ہوتا، آپ یا آپ کے ہم عصروں میں سے تو کسی نے نہیں کیا ایسا کچھ۔"

وہ جیسے سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ انہیں کیسے سمجھائے۔

"ہوں، کیا خبر، کیا پتا کسی نے کی بھی ہو، کسی کا کچھ پتا تو نہیں چلتا، بیلا کو تو افنان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی خبر نہیں ہوئی تھی۔" وہ تو اس کی ہر بات ماننے سے انکاری تھے۔

"مگر، آپ تو نہیں کرتے تھے ناں اور آپ کو تو اب زیادہ گیت کمپوز کرنے چاہئیں۔ لوگ میوزک چھوڑ تو نہیں دیں گے۔ بیلا کے یوں شور مچانے کا کیا انجام ہوا جس پروگرام میں وہ آ کر سب بتا رہی ہوتی ہے، اسی پروگرام میں سنگرز آ کر لوگوں کو انٹرٹین بھی کر رہے ہوتے ہیں، تو اچھا نہیں ہے کہ ہم ایسے گیت کمپوز کریں جن میں کوئی مائنڈ پروگرامنگ نہ ہو، لوگ بس صرف میوزک انجوائے کریں۔"

وہ انہیں آمادہ کر رہی تھی، دراصل وہ یقین کرنے پہ تیار ہی نہیں تھی کہ استاد امانت علی۔ جن کی پوری زندگی ہی دھنیں ترتیب دیتے گزری ہے، یوں ایک دم ہی کنارہ کش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔

"ییشا میری بچی، یہ تو صرف ایک نقصان ہے، جو بیلا کے علم میں آیا ہے نہ جانے اس کے اور کتنے ذہنی، جسمانی اور روحانی نقصان ہوں گے، ان کی تو ہمیں خبر ہی نہیں آخر دین اسلام نے یونہی تو اسے گناہ قرار نہیں دیا۔"

"گناہ......" یہ آخری لفظ تھا جو ییشا ان کے منہ سے موسیقی کے بارے میں سننے کی توقع کر سکتی تھی۔

"تو آپ نے سب چھوڑ دیا؟" لفظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔

"ہاں۔" وہ استہزائیہ ہنسے، کانچ ٹوٹنے کی سی ہنسی۔

"اب اگر آ کر چھوڑا تو کیا چھوڑا، مگر خبر ہی بہت دیر سے ہوئی، مریم خود کو بچا کر لے گئی، مگر ہمیں بتانے کی، سمجھانے کی، روکنے کی کوشش ہی نہیں کی، کیا خبر وہ سمجھاتی، تو سمجھ ہی جاتے، روکتی تو رک ہی جاتے، گناہوں کی گٹھڑی کچھ تو ہلکی ہو جاتی۔"

"نانا جی......"

ییشا حیرت سے انہیں دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ الفاظ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اتنی تیزی سے اتنا بڑا بدلاؤ۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی، موسیقی جن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی، وہ اس موسیقی کو گناہ قرار دے رہے تھے، یہ ایک دو ماہ میں ان کے دل کی دنیا کیسے بدلی تھی، کس نے بدلی تھی، اسے خبر کیوں نہ ہوئی، وہ ان سے اتنی انجان کیوں رہی۔

"بیلا آتی ہے آپ سے ملنے......؟" اس نے بات کا سرا پکڑنا چاہا۔

"ہاں، روز ہی آتی ہے۔" ان کے جواب پہ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"تب ہی......" اس نے پرسوچ انداز میں انہیں دیکھا۔

نہیں، وہ موسیقی کے اتنے بڑے اثاثے کو یوں آخری عمر میں، گم نام نہیں ہونے دے گی، وہ انہیں واپس لے آئے گی۔ کہیں تو کوئی گنجائش ہوگی۔"

ان کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے وہ یہی سوچے جا رہی تھی اور پھر یہ ان کی باتیں ہی تھیں، جنہیں سن کر اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔ وہ

زیادہ تر اسلام اور تبلیغ اسلام کی باتیں کر رہے تھے تو اسی طرح ہی ان کی واپسی ممکن تھی۔

''ناناجی......'' اس نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ایک بات کہوں......؟''

''ہوں۔''

اسے ایک اسلامی کتاب دکھاتے وہ ٹھٹکے تھے۔

''ہم گیتوں کو اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی تو استعمال کر سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' اس کی بات سن کر وہ چونکے تھے۔

''گیت اور اسلام کی تبلیغ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''مطلب ہم اپنے گانوں میں ایسے پیغامات بھی تو پوشیدہ کر سکتے ہیں جو لوگوں کو دین اسلام کی طرف راغب کریں۔'' وہ اب داد طلب انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا......''

اس کی بات سن کر وہ ایسے ہنسے، جیسے کسی بچے کی بچگانہ بات پر بڑے روکتے روکتے بھی ہنس پڑتے ہیں۔

''یہ تو زبردستی لوگوں کے خیالات بدلنے والی بات ہوئی، جبکہ دین اسلام میں جبر نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو اللہ خود ہی سب کو مسلمان بنا دیتا، سارا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا، یہ تو امتحان ہے کہ کون اپنی مرضی سے، بنا کسی جبر کے اللہ کی رضا کے مطابق چلتا ہے۔''

وہ ایسے بات کر رہے تھے جیسے کوئی مذہبی اسکالر، یہ صرف بیلا نہیں تھی جو ان سے بات کر رہی تھی، پھر کون تھا، کس نے ان کے خیالات کو اتنا بدل دیا تھا، ورنہ دو ڈھائی ماہ کا عرصہ اتنا تو نہیں ہوتا کہ پورا فلسفہ حیات ہی بدل جائے، انہیں پر سوچ انداز میں دیکھتی وہ سوچ کے گھوڑے ادھر ادھر دوڑا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، خیالات کے بدلنے کے لیے، ہدایت کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے اور ابھی جان بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ وہ لمحہ اس سے ابھی دور تھا، بہت دور اور پتا نہیں اس کی زندگی میں آنا بھی تھا یا نہیں۔

☆☆☆

بیلا پہ عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔ سارا دن بے زاری کے عالم میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی گزار دیتی، یا بہت ہوا تو نیچے لان میں چلی جاتی۔ پہلے پہل کچھ عرصہ ناناجی کی طرف جاتی رہی تھی، مگر آج کل وہ داداجی کے ساتھ مقابلہ قرأت میں شرکت کرنے قاہرہ گئے ہوئے تھے، تو وہ مصروفیت بھی ختم تھی۔ ان بے زاری بھرے دنوں میں ہلچل، ایمن اور ثانیہ آپی کے آنے پر یا پھر رانیہ کے آنے پر ہوتی تھی، پھر وہی معمول سارا دن وہ موبائل اپنے ساتھ رکھتی تھی، کبھی کبھی اس کی سیاہ اسکرین کو یک ٹک دیکھے جاتی۔

تین ماہ ہو گئے تھے اور افنان ہنوز لاپتا تھا، اس کی پریگنینسی کا پانچواں مہینہ اسٹارٹ ہونے والا تھا۔

بیلا نے افنان کے پاپا اور مما سے بھی رابطہ کیا تھا، اس کی مما تو بیلا کی آواز سنتے ہی غصے میں شروع ہو گئی تھیں، وہ افنان کی گمشدگی کا ذمہ دار بیلا کو ٹھہرا رہی تھیں، اور اس کے پاپا بھی بے حد پریشان تھے، افنان نے اس دن کے بعد ان سے بھی کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا، پتا نہیں وہ کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ تھا بھی یا نہیں۔ وہ ہر قسم کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے اور ان کی باتیں سنتے بیلا کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ انہوں نے مما کی طرح اس پہ غصہ نہیں کیا تھا، مگر ان کا رویہ ایسا تھا کہ پھر بیلا کی ان سے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ افنان کے لیے پریشان تھے، مگر افنان کی جو نشانی بیلا کی کوکھ میں پرورش پا رہی تھی، اس کے بارے میں انہوں نے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

ابھی بھی وہ موبائل سامنے رکھے اس کی تاریک اسکرین کو یک ٹک دیکھتے یہی دعا کر رہی تھی کہ افنان کی کال آ جائے، یا کہیں سے کوئی خبر ہی مل جائے، کوئی اس کی خیریت ہی بتا دے، تاکہ اس بے قرار دل کو کچھ تو سکون مل جائے، کیس جیت جانے کے

بعد کچھ دن جو ہلچل رہی تھی، وہ اب رفتہ رفتہ ختم رہی تھی۔
کبھی کبھی وہ سوچتی تھی، اس کے یہ سب کرنے کا کیا فائدہ ہوا، لوگ تو ویسے ہی موسیقی کی تانوں پہ سر دھن رہے تھے، میوزک کنسرٹس میں جا رہے تھے۔ پھر وہ خود ہی یہ سوچ جھٹک دیتی تھی۔ اس نے اپنا فرض نبھا دیا تھا۔ ماننا نہ ماننا اب دوسروں پہ منحصر تھا اور اگر کوئی ایک شخص بھی مان لیتا توبہ کر لیتا تو وہ سمجھتی کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا، اور وہ کامیاب رہی۔ اور واقعی وہ کامیاب ہی تو تھی، کیونکہ کم از کم دو ایسے افراد کو تو وہ جانتی ہی تھی جو تائب ہوئے تھے۔ پاپا اور نانا جی۔
بیلا نے نانا جی سے خود بات کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دادا جی سے بھی ملاقات کروائی تھی اور بدل تو قاری صاحب بھی گئے تھے۔ زندگی میں کبھی ڈھنگ سے امانت علی سے بات نہ کرنے والے قاری عبدالوہاب کی اب ان سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اعمال کی بنیاد پہ خود کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا، کون جانے، کس کا، کون سا عمل، رب کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔
”بی بی جی! مریم باجی کہہ رہی ہیں، آپ نیچے نہیں آ رہیں تو آپ کا ناشتہ اوپر بھجوا دیں، گیارہ تو بج ہی گئے ہیں۔“
بنا دروازے پہ دستک دیے، دھڑاک سے اسے کھولتی، نازیہ اندر آئی تھی۔ بیلا نے اپنے خیالات سے چونک کر اسے دیکھا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دروازے پہ دستک دیے بنا آنے پہ اس کی اچھی طرح خبر لیتی مگر اب، بہت کچھ تھا جو بدل گیا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔
”تم جاؤ، میں آ رہی ہوں۔“ اس نے نازیہ سے کہا۔
”جی.....“ وہ پراندہ ہلاتی، کچھ گنگناتی مڑی تھی۔
”اور سنو.....“ بیلا نے اسے روکا۔
”ہاں جی۔“ وہ مڑ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔
”آئندہ دروازہ ناک کر کے، مطلب دستک دے کے اجازت لے کر اندر آیا کرو۔“ وہ آہستگی سے یہی کہہ سکی۔
”اوباجی جی۔ انگریجی آتی ہے مجھے۔ آپ کھل کر میرے ساتھ انگریجی میں باتیں کیا کرو۔ تبھی، اپنے پورے محلے میں میرے جیسا مے سج (میسج) کوئی نہیں لکھ سکتا۔ ساری پڑوسنیں اپنے اپنے فے آنسیوں (فیانسیوں) کو مجھ سے ہی مے سج لکھواتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر کئی دنوں بعد بیلا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ چمکی تھی۔
”اوکے۔ جاؤ اب آ رہی ہوں میں۔“ مسکراہٹ دباتی وہ بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔
”اوکے، جی.....“ وہ جاتے جاتے بھی باز نہیں آئی تھی۔ پہلے اس کی ماں ان کے گھر کام کرتی تھی۔ اب کچھ دنوں سے اس کی طبیعت ناساز تھی تو نازیہ آنے لگی تھی، اور ان کے گھر کے اطوار سیکھنے میں اسے کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ بیلا نیچے آئی تو مریم ڈائننگ ٹیبل پہ اس کی منتظر تھیں۔
”ارے آپ نے ابھی تک بریک فاسٹ نہیں کیا.....؟“ بیلا نے بے ساختہ گھڑی پہ نظر دوڑائی تھی، گیارہ تو بج ہی رہے تھے اور مریم تو بہت سویرے اٹھنے کی عادی تھیں۔
”نہیں، آج طبیعت تھوڑی بھاری تھی، تو صبح نماز کے بعد چائے ہی لی تھی، اب سوچا تمہارے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا لے لوں۔“ انہوں نے ہلکے سے مسکراتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
”اور کم از کم نیچے آنے سے پہلے فریش تو ہو جایا کرو، یہ کس قسم کے حلیے میں پھرتی رہتی ہو سارا دن بیٹا کچھ اپنے پاپا کا ہی خیال کر لو، تمہیں اس حال میں دیکھ کر بہت ٹینس ہو جاتے ہیں وہ..... پہلے ہی وہ گلٹ کا شکار ہیں۔ پھر تمہارا یہ حال.....“
”مما۔“ مریم شروع ہوتی تھیں تو ان کا یہ لیکچر بہت لمبا چلتا تھا۔ بیلا بے ساختہ انہیں ٹوک گئی۔

"اچھا چلیں، ابھی جاتی ہوں۔ چینج کرتی ہوں۔ آپ شروع تو کریں۔ بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے ان کا دھیان ٹھنڈے ہوتے ناشتہ کی طرف دلایا تھا۔

"بی بی جی ......" تبھی لاؤنج کی صفائی کرتی نازیہ نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"ہاں۔" گلاس میں جوس انڈیلتے مریم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"وہ میں ٹی وی چلا لوں جی۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کیوں......؟" مریم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کوئی خاص پروگرام آنا ہے کیا؟" وہ اب اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"ناں جی، وہ ناں سانگ سنے بغیر مجھ سے ورک نہیں ہوتا اور تو سارے گھروں میں ڈیک شیک چلتے رہتے ہیں، مگر آپ کے گھر جی، بڑا ہی سناٹا ہوتا ہے، میں تو جی اپنی موبیل پہ سانگ سن کر، یہ دیکھیں جی ہیڈ فون لگا کر سانگ سنتی ہوں، مگر اب، آج موبیل کی چارجنگ بھی ختم ہے۔" ان کے سوال کا خاصا تفصیلی جواب دیتی، وہ اب منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مریم نے ایک نظر بیلا کو دیکھا۔ ٹوسٹ ہاتھ میں لیے وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

"اچھا چلو، کوئی نیوز چینل لگالو۔ اس میں بھی تو نیوز سے زیادہ میوزک ہی ہوتا ہے۔" مریم نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"مما۔" بیلا نے احتجاجی انداز میں انہیں دیکھا۔

"بیٹا! میانہ روی اختیار کرنا سیکھو، دین میں جبر نہیں ہے، تم ایک ایک کو پکڑ کر زبردستی گانا سننے سے نہیں روک سکتیں۔ تم نے انہیں بتا دیا یہ گناہ ہے، نقصانات بھی بتا دیے، بس کافی ہے۔ اب دیکھو، تم اس کے گانا سننے پہ خفا ہو رہی ہو۔ اسے روک دو، مگر یہ تمہارے سامنے، تمہارے گھر نہیں سنے گی، باہر جائے گی تو پھر وہی کام کرے گی، اس کے بجائے تم اسے وقت دو، پیار سے کبھی کبھی سمجھاتی رہا کرو تو اس پہ اثر بھی ہوگا، جو آواز خود انسان کے اندر سے اٹھے وہ اسے بدلتی ہے، میں بھی تو تمہیں روکتی تھی ناں، تمہارے دادا جی نے بھی روکا تھا، مگر کیا تم رک گئی تھیں۔"

مریم کی آواز کے بیک گراؤنڈ میں اب ٹی وی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ نازیہ نے کوئی نیوز چینل لگا ہی لیا تھا۔ بیلا گہری سانس بھرتی بے دلی سے ٹوسٹ چبانے لگی۔

"بریکنگ نیوز۔" تبھی نیوز کاسٹر کی چیختی آواز نے ماحول میں در آنے والی خاموشی کو توڑا تھا۔

"اب تو بریکنگ نیوز بھی مذاق بن کر رہ گئی تھی، سڑک پہ کوئی بھینس بھی مر جائے تو یہ لوگ بریکنگ نیوز بنا دیتے ہیں۔"

مریم نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے بیلا کی طرف دیکھا، مگر اس کا دھیان شاید کہیں اور تھا، ان کی بات پہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی اور انہیں مسکراتے دیکھ کر زبردستی مسکرائی تھی۔ مگر وہ نیوز کاسٹر کیا کہہ رہی تھی۔

"ناظرین آپ کو بتاتے چلیں، مشہور انڈین سنگر افنان گزشتہ تین ماہ سے لاپتا تھے، اب ان کے دوست کے فارم ہاؤس سے ملنے والی لاش کو ان کے والد نے افنان کے طور پر شناخت کر لیا ہے ایک بار پھر بتاتے چلیں، کل رات دہلی کے مضافات میں بنے ایک فارم ہاؤس جو مجوزہ طور پر افنان کے دوست راجندر کا بتایا جا رہا ہے وہاں سے ایک لاش ملی ہے۔"

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہے۔"

بیلا حواس کھونے لگی تھی۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ ڈائننگ روم سے ملحقہ ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی تھی۔ جہاں ایک بار پھر نیوز کاسٹر وہی خبر دہرانے میں مشغول تھی۔ ساتھ ساتھ سفید چادر سے ڈھکی ایک لاش بھی دکھائی جا رہی تھی۔

مگر کیا وہ افنان تھا......؟ بیلا آنکھیں پھاڑ

پھاڑ کر چادر سے ڈھکے وجود کو دیکھ رہی تھی۔
"مما۔" بیلا نے پیچھے مڑ کر مریم کو دیکھا۔ جن کا چہرہ زرد تھا۔
"کوئی انڈین نیوز چینل لگاؤ۔" جب نیوز کاسٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر ایک ہی بات دوہرائے گئی، تو مریم نے بیلا سے کہا تھا۔ مگر وہ حواسوں میں کب تھی۔
یک ٹک ٹی وی اسکرین کو دیکھتی پتھرائی سی کھڑی تھی، سفید پڑتا چہرہ لیے ایک زندہ لاش کی طرح۔
"حوصلہ کرو، آج کل ریٹنگ کے لیے، بغیر تصدیق کے خبریں چلانے کا ٹرینڈ چل پڑا ہے۔ کل رات کا واقعہ ہے تو خبر اتنی دیر سے کیوں چلی، جھوٹ بھی ہوسکتا ہے۔"
مریم اسے سنبھال رہی تھیں۔ مگر وہ ان کے سنبھالتے سنبھالتے بھی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پہ ڈھیر ہوئی تھی۔
منہ کھولے کھڑی نازیہ، مریم کو مشکل میں دیکھ کر اسے سنبھالنے بھاگی تھی، جو افنان کے مرنے کی خبر سن کر مرنے والی ہوگئی تھی، اور اگر جو وہ سچ مچ مر گیا تو کیا وہ جی پائے گی......؟

☆☆☆

"آنٹی! ہماری انفارمیشن کے مطابق، بیلا کی جان بھی خطرے میں ہے۔" ہاسپٹل کوریڈور میں مریم کے ساتھ کھڑی نیا نے آہستہ سے کہا تو مریم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔
"کیا مطلب؟ ابھی تمہارے سامنے ہی تو ڈاکٹر کہہ کر گئے ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں، شاک میں ہے اور وہ خود ہی مسکن ادویات دے کر اسے فی الحال ہوش میں نہیں آنے دے رہے۔" وہ حیرت سے اسے تک رہی تھیں۔ نیا پھیکا سا مسکرائی۔
"افنان کی طرح بیلا کا بھی خدانا خواستہ مرڈر ہو سکتا ہے۔"
"ک......ک......کیا......؟"
مریم نے اپنے سے کچھ فاصلے پہ کھڑے، عبدالرحمٰن، تانیہ اور ایمن کو دیکھا۔ وہ ابھی ابھی آنے والی نیلم اور ایشاع کو کچھ بتا رہے تھے اور ان کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ انہوں نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ایک بار پھر نیا کو دیکھا۔
"افنان کا مرڈر ہوا ہے......؟"
"جی لگ تو یہی رہا ہے۔" ان کی بات کا جواب دیتی وہ مضطرب سی تھی۔
"بیٹا مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ میں تو بیلا کو لے کر ادھر ہاسپٹل آ گئی تھی، اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔"
ان کا سفید پڑتا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے ایک دم سے ہی آ جانے والے سیاہ حلقے، ایک دن میں ہی وہ جیسے نچڑ کر رہ گئی تھیں۔ نیا کو افسوس ہوا۔ اسے یہ بات مریم کے بجائے عبدالرحمٰن انکل سے کرنی چاہیے تھی شاید۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
"آپ آرام سے بیٹھ تو جائیں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس نے انہیں قریب پڑے بینچ پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہوں میں......" وہ بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے بھی اس کے ہم قدم ہوئی تھیں۔ اور پھر اس کے ساتھ بینچ پہ بیٹھ بھی گئیں۔
نیا بیٹھ تو گئی تھی، مگر اب سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بات کیسے شروع کرے سو خاموشی سے بیٹھی سامنے سفید دیوار کو دیکھے گئی۔
"ہاں اب بتاؤ کیا کہہ رہی تھیں تم......؟"
"میں ادھر بیلا کی حفاظت کے لیے کچھ سیکورٹی گارڈ تعینات کرنا چاہتی ہوں، اس کے لیے آپ لوگوں کا تعاون درکار ہے، اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بات کر چکی ہوں میں، کچھ پاپا نے بھی اپنے ریسورسز استعمال کیے ہیں بیلا کی سیکورٹی ضروری ہے۔"
لب چباتے وہ بدستور سامنے دیکھ رہی تھی۔ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔
"مگر تم افنان کا کیا کہہ رہی تھیں۔ مرڈر...... مرڈر ہوا ہے اس کا؟" مریم متوحش سی تھیں۔
"آنٹی، لاش سوئمنگ پول سے ملی ہے اور

تقریباً بہتر گھنٹے پرانی ہے، اور پھول کر ناقابل شناخت ہو چکی ہے۔''

''تو پھر یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ وہ افنان ہے؟ ہو سکتا ہے، کوئی اور ہو۔'' وہ بے قراری سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''افنان کے والد نے اس کے کندھے پہ موجود پیدائشی نشان سے اسے شناخت کیا ہے۔'' نیا نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''لیکن پھر مرڈر؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ، وہ ڈوب گیا ہو خود ہی۔''

مریم کو بات کرنے کے ساتھ ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تھا، افنان ماہر تیراک تھا، اس کا یوں ایک چھوٹے سے سوئمنگ پول میں ڈوب کر مرنے کا خیال ہی عبث تھا۔

''اس مرڈر کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ افنان کے معدے سے کثیر مقدار میں الکوحل ملی ہے اور سوئمنگ پول کے کنارے اسٹیریو پہ پتا ہے کون سا گیت چل رہا تھا۔'' نیا کی آواز کپکپا گئی تھی۔

''کون سا؟'' مریم کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

''وہی مشہور زمانہ متنازعہ سونگ سوسائیڈ اسکینڈل والا، یہ کیسے ممکن ہے کہ افنان اس گانے کے خلاف بیان دے کر اسے سن بھی رہا تھا مگر، مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ وہ چھپتے چھپتے تھک گیا تھا اور اس نے تنگ آ کر سوسائیڈ کر لی، کوئی کہتا ہے اسے قتل کیا گیا ہے۔ وہی بیان دینے کی پاداش میں۔''

''اور تم......؟ تم کیا کہتی ہو؟'' مریم نے بغور اسے دیکھتے سوال کیا تھا۔

''مرڈر۔'' نیا نے یک لفظی جواب دیا تھا۔

''اور آپ لوگوں کو بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس مرڈر کی کڑیاں، یقیناً اسی سوسائیڈ کیس سے مل رہی ہیں اور اب بیلا بھی اسی خطرے کی زد میں ہے۔''

اس نے قریب آتے عبدالرحمٰن صاحب کو دیکھا۔

''میں انکل سے بات کر لوں۔''

وہ اٹھ کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

وہ عبدالرحمٰن صاحب کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس وقت بیلا کی حفاظت ہی سب سے اہم ایشو تھا اور وہ جب تک اس کی حفاظت کا مناسب بندوبست نہ کر لیتی، اسے چین ملنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

بیلا اور مریم فق چہرہ لیے، بیلا کے بیڈ روم میں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے بیٹھی نیا بھی بے چین سی تھی۔

''میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ فی الحال بیلا کو باہر لے کر مت نکلیں۔'' ہاتھوں کو آپس میں ملتی، وہ پریشان سی تھی۔

''مگر بیٹا! بیلا کا آٹھواں منتھ چل رہا ہے۔ روٹین چیک اپ کے لیے جانا تو پڑے گا ناں اور گاڑی کے بریک فیل تھے، حادثہ تھا یہ، کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا، کوئی بیلا پہ اٹیک تو نہیں ہوا۔'' نیا کی بات پہ وہ الجھی تھیں۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مما، تم نے تو نیا مجھے قیدی ہی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہیں جا ہی نہیں سکتی اور جاؤں تو سیکورٹی گارڈز کی پوری فوج ہمراہ ہوتی ہے۔ میں فیڈ اپ ہو گئی ہوں، اس سب سے یار! نارمل لائف جینا چاہتی ہوں۔''

بیلا کے لہجے میں بے زاری تھی، اگرچہ افنان کی وفات کو تین چار ماہ گزر چکے تھے، مگر اس کا زرد، بے رونق چہرہ، اور آنکھوں سے چھلکتی ویرانی کسی اجنبی کو بھی بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ موت کی دہلیز سے پلٹی ہے۔

''قیدی کی بھی خوب کہی۔ ابھی تو عدت میں ہی ہو تم، اس میں تو ویسے بھی باہر نہیں نکلتے۔''

بیا نے بے ساختگی میں کہہ تو دیا تھا، مگر اس کا پھیکا

پڑتا چہرہ دیکھ کر خفیف سی ہوگئی تھی، افنان کا ذکر جس طرح اس کے چہرے سے زندگی نچوڑ دیتا تھا، وہ کوشش کرتے تھے کہ یہ ذکر نہ ہی کریں مگر......اب بھی وہ بے جان، پتھرایا چہرہ لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی، گویا افنان کی وفات کی خبر ابھی ہی ملی ہو۔

''ہاں، افنان چلا گیا، وہ چلا گیا مجھے چھوڑ کر یقین ہی نہیں آتا نیا۔'' وہ خودکلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''آئے بھی کیسے......؟ انہوں نے......'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے مریم کی طرف مڑی۔

''مما! انہوں نے مجھے افنان کے جنازے پہ نہیں جانے دیا، اسے آخری بار دیکھنے بھی نہیں دیا، آخری بار ملنے بھی نہیں دیا۔ وہ...... وہ مر گیا...... چلا گیا، مجھے چھوڑ کر۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی تھی، مریم اور نیا آنکھوں میں آنسو لیے اسے سنبھالنے لگیں۔

''ہاں میری جان! صبر کرو......'' مریم بے بسی سے ہاتھوں سے نکلتے اس کے وجود کو سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ کچھ وہ اب پہلی سی نازک، چھوئی موئی سی لڑکی بھی تو نہیں رہی تھی۔ ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی، جسم بے ڈھنگے انداز میں پھیل سا گیا تھا۔

نیا جلدی سے مسکن ادویات اور پانی لے آئی۔

''یہ لو پانی پی لو بس، شاباش۔''

بمشکل پانی کے ساتھ اسے ٹیبلٹ کھلا کر وہ ہولے ہولے اس کے بالوں کو تب تک سہلاتی رہی جب تک وہ مریم کی گود میں سر رکھے سو نہ گئی......

''اس کا یہ حال کب تک رہے گا، کب سنبھلے گی یہ لڑکی، اپنی حالت تک کا بھی ہوش نہیں ہے اسے۔''

آنکھوں میں آنسو لیے مریم نے بے بسی سے نیا کو دیکھا تو وہ لب چبا کر رہ گئی۔

''آجائے گا صبر، ابھی ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ کچھ وقت گزرے گا، گود میں افنان کی نشانی آئے گی، تو خود ہی سنبھل جائے گی۔''

ان کے ساتھ بیٹھی۔ ان کا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں تھپتھپاتے، وہ یہی کہہ سکی۔ پھر ان کا دھیان بٹانے کو بات پلٹ دی۔

''خیر، آپ احتیاط کیا کریں۔ ابھی تو شکر ہے کہ آپ اپنی گلی میں تھیں اور گاڑی کی اسپیڈ بھی کم تھی۔ آپ نے گاڑی کو بروقت درخت سے ٹکرا کر روک لیا۔ اگر خدانخواستہ یہی حادثہ کسی مصروف سڑک پہ پیش آتا تو......'' وہ جھرجھری لے کر خاموش ہوگئی تھی۔

''مگر بریک فیل تھے، تو پھر تم کیوں اتنے یقین سے کہہ رہی تھیں کہ بیلا کو ٹارگٹ کیا گیا ہے، گاڑی میں خرابی تو کبھی بھی آسکتی ہے۔''

مریم کو اچانک نیا کی کچھ دیر پہلے کہی بات یاد آئی تو انہوں نے پوچھ لیا۔

''بریک فیل نہیں تھے۔ کیے گئے تھے۔ بریک آئل لیک تھا اور ایسا لگتا ہے، جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔''

نیا ہولے سے بولی تو مریم اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''یہ کس چکر میں پھنس گئی ہے میری بچی؟'' وہ بے بسی بھرے انداز میں اسے دیکھتی کہہ رہی تھیں۔

''کب تک چلے گا ایسے۔ کیا اب یہ ساری زندگی یونہی ڈر ڈر کر جیے گی۔'' مریم بے چین ہوگئی تھیں۔

''آنٹی آپ کو تو اسی وقت محتاط ہو جانا چاہیے تھا، جب سیڑھیوں پہ آئل گرا کر بیلا کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی، آپ تب بھی نہیں مانیں اور اب، آج یہ حادثہ......'' وہ ایک پل کو رکی۔

''پلیز بی کیئرفل، تب تک، جب تک ہم بیلا کی سیفٹی کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار نہیں کر لیتے۔''

''مگر، کب تک اور کتنی احتیاط کریں، اس دن کے بعد بیلا اپنا روم چھوڑ کر نیچے، اس روم میں شفٹ

ہوگئی، حالانکہ تمہیں پتا ہے، کتنی تچی ہے وہ اس روم کے بارے میں۔ افنان جب آیا تھا تو بیلا کے ساتھ تقریباً ایک ماہ اس نے، اسی بیڈروم میں گزارا تھا۔ اپنے گھر تو اب وہ جا ہی نہیں سکتی، یہاں کی یادوں سے ہی جی بہلا لیتی تھی مگر......"

ان کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو سوئی ہوئی بیلا کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

نیا بے بس سی ہوگئی۔

"آنی نو، بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ آپ بیلا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں۔ اسے اکیلا مت رہنے دیں۔ فی بی اور بیا ہوتیں تو میں ان سے کہتی، وہ ادھر بیلا کے ساتھ رہ جاتیں کچھ دن مگر وہ ادھر اسلام آباد میں اپنے پروجیکٹ میں بزی ہیں تو......" وہ ایک پل کو رکی۔

"بلکہ آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ رانیہ سے کہیں، وہ کچھ عرصہ ادھر بیلا کے پاس آجائے۔ آیان اور ریان کی وجہ سے اس کا بھی دھیان بٹے گا۔"

نیا کے کہنے پہ مریم پرسوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

پھر اس کے پیچھے کمرے سے نکلتے ہوئے لائٹ آف کردی تھی۔ بیلا نے تو اب دو تین گھنٹے یوں ہی بے سدھ رہنا تھا۔

☆☆☆

بیلا کی آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے، وہ کچھ دیر کسل مندی سے بستر پر پڑی مریم کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ تو عصر کی نماز پڑھ کر پانچ ساڑھے پانچ تک اس کے کمرے میں آتی تھیں۔ پھر چائے، وہ، مریم اور عبدالرحمٰن صاحب اکٹھے ہی پیتے تھے، کبھی کبھی رانیہ، تانیہ وغیرہ آجاتی تھیں تو رونق سی ہوجاتی تھی۔ بیلا کا دھیان بھی بٹ جاتا تھا۔

وہ کچھ دیر یوں ہی چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھی اور فریش ہو کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں سناٹا چھایا تھا۔ کچن میں کھٹ پٹ کی آوازیں سن کر وہ وہیں چلی گئی۔ نازیہ نگٹس اور شامی کباب فرائی کررہی تھی۔ وہ وہیں دروازے کی دہلیز پہ کھڑی خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔

وہ شاید کچھ گنگنا رہی تھی۔

"اف کتنا کھیل رہی ہو تم سروں سے......"

کچھ دیر سننے کے بعد وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی تھی۔

"جی......؟" شازیہ چونک کر مڑی تھی۔

"اوہ، جی۔ آپ ہیں......" اسے دیکھ کر اس نے گہرا پرسکون سانس لیا تھا۔

"بی بی جی! میں نے آپ کی وائس نہیں سنی، اپنے ہی خیال میں تھی، کیا کہہ رہی تھیں آپ جی......؟"

"کچھ نہیں۔"

بیلا سر جھٹک کر رہ گئی۔ جو چیز بچپن سے سیکھی تھی، ایک دم سے اس سے کنارہ کر لینے کے باوجود وہ بھولی تو نہیں تھی اور نہ ہی بھول سکتی تھی۔

"آپ کو کچھ چاہیے......؟" اسے یونہی کھڑے دیکھ کر نازیہ نے پوچھا تھا۔

"نہیں، مما کدھر ہیں......؟" اس نے مریم کا پوچھا۔

"وہ تو جی، یہیں پڑوس میں میلاد تھا، وہاں گئی ہیں، کہہ رہی تھیں پانچ بجے تک آجائیں گی۔" نازیہ کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

"بی بی جی آپ کی ڈلوری (ڈلیوری) میں کتنا ٹیم رہ گیا ہے پھر۔"

کچھ دیر بعد نازیہ نے اس کے پھیلے ہوئے وجود پر نظر ڈال کر جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بس...... ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ہی رہتا ہے۔" بیلا نے دھیرے سے جواب دیا تھا۔

"پھر تو جی آپ نے شاپنگ کرلی ہوگی ساری، میری تو جی بھانجی پیدا ہوئی تھی ناں، ہم نے جی سب کچھ خود ہی بنایا تھا۔ آپ تو لارج (بڑے) لوگ ہو آپ نے تو سب اے ڈی مڈ (ریڈی میڈ) ہی لیا ہوگا۔" وہ اشتیاق بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"لارج لوگ......؟" بیلا نے کچھ الجھ کر اسے

دیکھا۔

''ہا آجی اتنی انگریجی بھی نہیں آتی آپ کو، لارج مطلب......وڈے...... بڑے لوگ۔''

نازیہ نے ماتھا چھوتے اسے جواب دیا تھا۔

''اوہ اچھا، کیا کہہ رہی تھیں تم......؟''

''وہ جی شاپنگ کرلی آپ نے بے بی کے لیے۔''

نازیہ نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

''شاپنگ......؟'' بیلا نے پرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں، مما نے کی ہوگی۔'' اس نے نازیہ کو تو جواب دے دیا تھا مگر خود جیسے سوچ میں پڑ گئی تھی، واقعی شاپنگ تو کرنی چاہیے تھی۔ پتا نہیں مما نے کی بھی ہوگی یا نہیں۔

وہ الجھی الجھی سی اپنے روم میں آئی اور وارڈ روب کھول کر کھڑی ہوگئی، پھر اس نے واڈ روب کیا پورا کمرہ دیکھ ڈالا، چھوٹے بچے کے لیے کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی۔ شاید ان کے اپنے روم میں ہو۔ یہی سوچتی وہ ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑی دستک دے رہی تھی...... مگر کمرے میں تو کوئی تھا ہی نہیں۔

''میں بھی پاگل ہوں، پاپا تو پانچ بجے تک آتے ہیں۔ ابھی تو ساڑھے چار بھی نہیں ہوئے۔'' دروازہ کھول کر وہ اندر چلی گئی۔

کچھ دیر یونہی، ادھر ادھر ہاتھ مارتے، وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مما نے کچھ بھی نہیں لیا۔ بکھرے بالوں کو سمیٹتی وہ الجھی سی بیٹھی تھی۔ مجھے بھی کہیں نہیں جانے دیتیں۔ اگر نازیہ نہ پوچھتی تو مجھے بھی خیال نہ آتا۔

''میں خود ہی جا کرلے آتی ہوں۔'' کچھ سوچ کر وہ اٹھی۔ کمرے میں جا کر اپنے پھیلے وجود کے گرد بڑی سی چادر لپیٹی، ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اور باہر نکل گئی۔

''بی بی جی! کہاں جارہی ہیں......؟''

نازیہ اپنا کام ختم کر کے لاؤنج میں آئی تھی۔ اور اسے کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''یہیں قریبی شاپنگ مال تک جارہی ہوں۔ آجاؤں گی ابھی......''

رکے بغیر اسے جواب دیتی وہ باہر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''مگر...... وہ ڈاکٹر جی نے آنا ہے ابھی آپ کے چیک اپ کے لیے، مریم باجی کہہ گئی تھیں۔''

اس کے پیچھے پیچھے باہر کی طرف آتے نازیہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

بیلا ایک پل کو ٹھٹکی۔

''آجاؤں گی میں ابھی......''

''آپ اکیلی بھی تو جارہی ہو۔ مریم باجی نے منع کیا ہے۔ آپ کے یوں اکیلے نکلنے پر۔''

نازیہ بے چاری اپنی طرف سے اسے روکنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

''اکیلی کہاں جارہی ہوں، ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز کے ساتھ جاؤں گی۔'' بیلا نے اکتا کر اسے دیکھا۔

''اور جاؤ اب، میرا سر مت کھاؤ۔ اپنا کام کرو جا کر۔'' اس نے خاصے غصے سے اسے گھورا۔

''ہاہ! نہ میں شاپنگ کا پوچھتی نہ اس جھلی بی بی کو خیال آتا۔ اب تو یہ جا کر ہی رہے گی۔ اور میری پھر خیر نہیں۔ وہ یہی سوچ سکی تھی۔ جبکہ بیلا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور بھی بھاگ کر گاڑی میں آبیٹھا تھا۔ اور نازیہ کے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے بیلا کی گاڑی اور اس کے پیچھے سکیورٹی گارڈز کی گاڑی فراٹے بھرتی گیٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔

''لوکرلوگل۔ مریم باجی کو تو بتاؤں ان کی ڈاٹر (بیٹی) تو Go, went, gone ہوگئی۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے گریبان سے اپنا موبائل نکالا اور مریم کو کال ملانے میں مصروف ہوگئی۔

''خامخاہ (خوامخواہ) کا بیلنس بھی ختم ہوگا۔'' ساتھ ساتھ وہ سوچتی تھی۔

''بک ہاں، لارج لوگاں دی لارج ہی گلاں۔''

☆☆☆

بیا تک سک سے تیار نیچے آئی تو رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''لیہا کہیں جا رہی ہو کیا؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔

''جی مما، وہ علی آ رہا ہے لینے، اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہ رہا تھا۔''

گلابی سوٹ میں، گلابی پڑتی رنگت لیے، وہ تھوڑی جھجکتی جھینپی سی تھی۔

رابعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دباتے، اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اپنے طبقے کی دیگر لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی وہ۔

''اپنی فیملی کو کب بھیجے گا وہ ......؟'' وہ اب مسکراتے ہوئے اس کے تھوڑے شرمائے ہوئے روپ کو دیکھ رہی تھیں۔

علی سے وہ اور نیب مل چکے تھے۔ وہ سلجھا ہوا ڈیسنٹ اور بردبار سا لڑکا دونوں کو ہی بہت پسند آیا تھا۔ اسی لیے آج انہوں نے بیا سے اس کی فیملی کو گھر لانے کی بات کی تھی۔ گویا اپنی طرف سے مثبت اشارہ دیا تھا۔

''وہ تو کب کا کہہ رہا ہے۔ میں ہی ٹالے جا رہی تھی۔''

بیا کے کہنے پہ رابعہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''مگر کیوں بیٹا۔ اب جب ایجوکیشن کمپلیٹ کر لی ہے۔ بزنس بھی سیٹ کر لیا ہے۔ تو اب کس بات کی دیر......''

بیا نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا تھا۔ اور اب اپنے برانڈ کے ساتھ ساتھ بوتیک بھی کھول لی تھی۔

''جی کہتی ہوں آج اسے......''

روکتے روکتے بھی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے چھلکی تھی۔

''آج تو بیلا کے چیک اپ کے لیے جانا تھا ناں آپ نے۔''

انہیں دلچسپی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے جیسے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں جانا تو تھا، مگر گاڑی مسئلہ کر رہی ہے۔ تمہارے پاپا آتے ہیں تو ان کی گاڑی لے جاؤں گی۔ تم لوگوں کا بھی تو ارادہ تھا بیلا کے پاس کچھ دن رہنے کا۔'' انہوں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''جی آج جائیں گے۔ فی بی اور نیا تو چلی گئی ہوں گی، میں علی فیملی سے ملنے کے بعد ادھر ہی جاؤں گی۔ دو تین دن ادھر ہی اسٹے کریں گے ہم۔'' وہ ایک پل کو رکی۔

''کچھ مل بیٹھ کر پرانی یادیں دوہرائیں گے۔ شاید اس طرح اس کا دھیان بٹ جائے۔'' بیا پھیکا سا مسکرائی تھی۔

''ہاں ...... بس ...... کڑا وقت ہے اس کے لیے، اللہ آسانی کرے۔'' وہ یہی کہہ سکی تھیں اور جیسے حالات تھے وہ کر بھی کیا سکتے تھے سوائے بیلا اور اس کی فیملی کی ڈھارس بندھانے کے۔

''چلتی ہوں ...... علی آ گیا ہے۔'' موبائل کی روشن ہوتی اسکرین پہ علی کا نمبر دیکھ کر وہ فوراً اٹھی تھی۔

''اندر نہیں آئے گا وہ ......؟'' رابعہ کو خیال آیا تھا۔

''نہیں، پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے......'' وہ باہر کی طرف جاتے ہوئے کچھ سوچ کر رکی تھی۔

''آپ ایسا کریں، ہمارے ساتھ آ جائیں۔ آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔ بابا تو پتا نہیں کب آئیں۔ پھر ادھر سے آپ گاڑی منگوا لیجیے گا۔'' اس نے منٹوں میں پروگرام ترتیب دیا تھا۔

''او کے۔ چلو۔'' رابعہ گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

پہلے ہی ان کا کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ اور اس طرح وہ علی سے بھی مل لیتیں۔ بیا سے مزید بحث کرنا فضول خیال کرتے ہوئے وہ اس کے ساتھ چل پڑی تھیں۔

☆☆☆

''اف' آج اس روڈ پر اتنا رش کیوں ہے؟''

وہ ''فی بی'' نیا اور بیلا ایک ہی ایریا میں رہتے تھے اور ابھی جس راستے سے وہ جا رہے تھے یہ بیلا کے گھر کی طرف شارٹ کٹ تھا۔ اور کافی سنسان رہتا تھا۔ بیا نے بھی اسی لیے علی کو اسی سائڈ سے بیلا کے گھر جانے کا کہا تھا۔ مگر یہاں پر ہجوم دیکھ کر الجھ گئی تھی۔ اور ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کار، موٹر سائیکل، حتیٰ کہ رکشہ اور چنگ چی بھی، پورا شہر ہی جیسے ان کا راستہ روکنے کی مہم میں شریک تھا۔

بیا جھنجلا رہی تھی۔

آج اس کی علی کی فیملی سے پہلی ملاقات تھی تو وہ چاہتی تھی کہ اس کا بہت اچھا امپریشن پڑے ان پر۔ مگر پہلی ہی بار وقت پر نہ پہنچ کر وہ کیا تاثر دیتی انہیں۔

پر ہجوم سڑک پر رینگتی گاڑی میں سکون سے بیٹھے علی کو دیکھ کر وہ اور بھی جھنجلا رہی تھی۔

''شاید کوئی حادثہ ہوا ہے مین روڈ پر۔ اسی لیے اس شارٹ کٹ پر رش ہو گیا ہے۔'' بوکھلائے ہوئے تیزی سے ایک دوسرے کو اوورٹیک کرتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے علی نے اندازہ لگایا تھا۔

''اللہ خیر کرے......''

خود رابعہ کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی۔ اسی لیے دہل کر انہوں نے رب سے فوراً خیر مانگی تھی۔ بیا بھی علی کی بات سن کر ایک پل کو چپ رہ گئی تھی۔

واقعی...... ایک دوسرے پر زور زور سے چلاتے، ہارن بجاتے لوگ، یوں لگ رہا تھا۔ یہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتے ہوں۔ اس کا دل ایک پل کو سکڑا، فی بی اور نیا بھی، بیلا کے گھر کے لیے نکل چکی تھیں اور راستے میں تھیں۔

وہ بے چین سی ہو گئی تھی اور پھر رہ نہ سکی تو موبائل نکال کر فی بی کو کال ملانے لگی...... بیل جا رہی تھی۔

علی اور رابعہ نے بیک وقت سوالیہ انداز میں اسے دیکھا، مگر وہ نظر انداز کر گئی۔ فی بی نے کال پک کر لی تھی۔

''ہیلو، فی بی! کہاں ہو تم......؟''

اردگرد ہوتے شور کے باوجود، اسے صاف لگا تھا۔ جیسے فی بی بھی سڑک پر اور تقریباً ایسی ہی پر ہجوم سڑک پر موجود ہے۔

''ہم راستے میں ہیں۔ بیا تمہیں پتا چلا......؟''

فی بی کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''کیا......؟'' بیا کے لبوں سے بمشکل آواز نکلی۔ کسی انہونی کے احساس نے حلق میں کانٹے اگا دیے تھے۔

''بم بلاسٹ ہوا ہے۔ النور شاپنگ مال میں......؟'' فی بی نے دھیرے سے کہا۔ بیا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے صرف ہونٹ ہی ہل رہے تھے۔ آواز تو کہیں گم ہو گئی تھی۔

''بم بلاسٹ ہوا اور پھر فائرنگ بھی، اور......''

فی بی کی لڑکھڑاتی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

''اور بیلا وہیں تھی، اسی شاپنگ مال میں اس کا ایک گارڈ زخمی اور ایک مردہ حالت میں ملا ہے اور بیلا......؟ بیلا کہیں نہیں ہے۔'' رک رک کے بولتے وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

''کیا......؟'' بیا کے حلق سے چیخ سی آواز بلند ہوئی۔

''کیا کہہ رہی ہو۔ کس نے کہا ہے تمہیں؟'' چلاتے ہوئے وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ اب تک خاموشی سے اسے دیکھتے علی اور رابعہ پریشان سے ہو گئے تھے۔

''نیا کو رپورٹ ملی ہے ابھی۔''

''بات کراؤ میری نیا سے......'' بیا چلائی تھی۔

''ہم تمہارے گھر کے قریب ہی ہیں۔ ادھر ہی آ رہے ہیں۔ تم نکلنا مت......''

فی بی نے کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟'' رابعہ نے پریشانی سے اسے دیکھتے سوالیہ انداز میں کہا تھا۔

''ما، وہ......'' اس کے لبوں سے اب گھٹی گھٹی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"علی گھر چلیں...... واپس گھر چلیں۔ بتاتی ہوں۔" بری طرح روتی وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ ہی تھی۔

"اوکے، اوکے، ریلکس، واپس چلتے ہیں۔" گاڑی کو ریورس کرکے، علی نے اشارے سے رابعہ کو فی الحال کچھ بھی کہنے سے منع کیا تھا۔ وہ اب ہونٹ بھینچے رش میں واپسی کا راستہ ڈھونڈتے پریشان سا...... کبھی کبھی روتی ہوئی بیا پر بھی نظر ڈال لیتا۔ جس کی سسکیاں گاڑی میں گونج رہی تھیں۔ مگر فی الحال وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ بڑی سی گارمنٹس شاپ نومولود سے لے کر نو، دس سال کے بچوں کے لیے تھی۔ اور اس میں نہ صرف یہ کہ ہر ورائٹی کے کپڑے دستیاب تھے بلکہ ان کے ساتھ میچنگ شوز، چھوٹی بچیوں کے لیے ہیر بینڈز، چھوٹی چھوٹی پنیں، نازک نازک بریسلیٹ، چوڑیاں، رسٹ واچ کھلونے، یعنی چھوٹے بچوں کی دلچسپی کا ہر سامان موجود تھا۔ بیلا کو الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پتا چل چکا تھا کہ اس کا بیٹا ہے۔ مگر پھر بھی گرلز سلیکشن میں موجود وہ نازک نازک سی سنڈریلا ٹائپ شیشے کی جوتیاں، اور پنک باربی فراک اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ بے ساختہ اس طرف کھنچی چلی گئی۔ وہ پیارا سا باربی فراک تین چار سال کی بچی کے لیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی نازک سا تاج، چھوٹا سا ہینڈ بیگ، وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گئی۔

اگر اس کی بیٹی ہوتی تو...... جانے کیسے یہ سوچ اس کے ذہن میں آئی اور اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔ افنان کو بھی تو بیٹی کا شوق تھا بہت۔

وہ کہتا تھا۔ "بیلا...... میرا دل چاہتا ہے۔ ہماری بیٹی ہو۔ بالکل تمہاری طرح، مگر اس کی آنکھیں میری طرح ہوں۔ بیلا کے چہرے پر افنان کی آنکھیں۔"

تیزی سے پلکیں جھپکتے اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ افنان یاد آیا تھا۔ اور بہت غلط وقت پر یاد آیا تھا۔

پریگنینسی کے بعد جو تھوڑا بہت وقت اس نے افنان کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ اس سے اتنی بدگمان تھی کہ اس کی محبت اور والہانہ پن، اس کی بچے کے لیے کی گئی باتوں کو درخور عتنا ہی نہیں سمجھتی تھی۔ مگر اب وقتاً فوقتاً اس کی یاد آنے والی باتیں آنکھوں میں آنسو لے آتی تھیں۔ خود پر قابو پاتے وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ جب مخالف سمت سے آتی اس لڑکی سے ٹکرا گئی......

وہ بھی پریگنیٹ تھی۔ اور شاید اسی کی طرح اپنے بچے کے لیے شاپنگ کرنے آئی تھی۔ دیوار کا سہارا لیتے اس نے اس کے لڑکھڑاتے وجود کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے ساتھ کوئی تھا جس نے اسے تھام لیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نہ......؟"

اس کی طرف جھکتے پریشانی سے دیکھتا وہ یقیناً اس کا شوہر تھا۔

وہ اب مسکراتے ہوئے۔ اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھوں سے ہولے سے چھڑاتی اسے تسلی دے رہی تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں......؟"

ساکت کھڑی، یک ٹک اپنی طرف دیکھتی بیلا سے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں...... آئی...... آئی ایم فائن......" بمشکل اثبات میں جواب دیتے وہ اس کی سائیڈ سے نکلتی چلی گئی تھی۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے شوہر نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور جانے کون سی حکایت دل سنا رہا تھا کہ اس کے سفید چہرے پر گلابی لہریں سی بن رہی تھیں۔ اور یوں شرماتے وہ کتنی حسین لگ رہی تھی......

اگر افنان ہوتا تو وہ دونوں بھی اکٹھے شاپنگ کرتے، اور وہ بھی یونہی کسی نازک، کانچ کی گڑیا کی طرح اس کا خیال رکھتا۔ مگر...... افنان...... وہ نہیں تھا ناں......، کہیں بھی، روکتے روکتے بھی آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ بھول گئی

تھی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اور یہاں کس لیے ہے۔ یاد تھا تو بس یہی کہ افنان اسے چھوڑ گیا تھا۔ بھری دنیا میں تنہا کر گیا تھا۔

"میم! آر یو او کے......؟"

وہ کوئی سیلز مین تھا۔ جو یوں اسے بیچ راستے میں بری طرح روتے دیکھ کر اس کی طرف آیا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بنا، اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بنا، وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی تھی۔ اسے نہیں کرتی تھی شاپنگ، افنان کے بنا، وہ یہ کیسے کرتی......؟ تیزی سے باہر نکلتے وہ ایک سائیڈ پر کھڑے، سکیورٹی گارڈ کو نظر انداز کیے۔ بنا سوچے سمجھے ایک طرف بڑھتی چلی گئی تھی۔

دکان کی طرف پشت کیے۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگاتے دونوں سکیورٹی گارڈز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سات، آٹھ منٹ پہلے انتہائی شوق سے شاپنگ پر جانے والی ان کی "میم" رابیل عبدالرحمٰن، بنا شاپنگ کیے ہی لوٹ آئے گی۔ اور ان کو متوجہ کیے بنا، ان کو اپنے ساتھ لیے بنا اکیلی ہی کسی انجان سمت میں نکل کھڑی ہوگی۔ ایک دوسرے کے ساتھ اطمینان سے باتیں کرتے وہ انجان ہی رہے۔ اور بیلا برستی آنکھوں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

ٹی بی اور بیا کے آنسوؤں سے نظریں چرائے، بمشکل خود پر ضبط کیے نیا مختلف افراد سے رابطے میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر رابعہ دونوں کو چپ کروانے کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد خاموشی سے ایک طرف بیٹھی۔ بیلا کی خیریت کی دعا مانگنے میں مشغول تھیں۔ بیا کو تسلی دے کر بیلا کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے علی تھوڑی دیر پہلے ہی نکلا تھا۔

"ہیلو...... عظمی صاحب...... جی کچھ پتا چلا۔"

نیا بات کرتے کرتے تھوڑا سائیڈ پر ہوگئی تھی۔

"کیا......؟ سکیورٹی گارڈ کو ہوش آگیا ہے، پھر......"

"کیا بتایا ہے اس نے۔"

نادانستگی میں ہی اس کی آواز اتنی بلند ضرور ہوگئی تھی کہ کمرے میں بیٹھے باقی تینوں نفوس بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"اچھا......"

دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور اب تک بمشکل روکے ہوئے آنسو آنکھوں سے پھسل پڑے تھے۔

"کیا ہوا ہے......؟" ڈاکٹر رابعہ نے ہی پوچھنے کی ہمت کی تھی۔

"بیلا نہیں رہی......" کپکپاتی سرگوشی سے مشابہ آواز نے کمرے میں گویا صور پھونکا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟ کیسے پتا چلا ہے؟" ڈاکٹر رابعہ نے پوچھا تھا جبکہ بیا اور ٹی بی رہا سہا ضبط کھو کر اب باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی تھیں۔

"سکیورٹی گارڈ کو ہوش آگیا ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ جس گارمنٹس شاپ میں بم بلاسٹ ہوا ہے۔ بیلا وہیں تھی۔ شاپنگ کرنے گئی تھی وہاں...... اپنے بے بی کے لیے۔"

نیا نے ڈوبتی آواز میں بتایا۔ ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی جیسے، بمشکل خود کو سنبھالے وہ قریبی صوفے پر ڈھے سی گئی۔

"تو...... اس کا یہ مطلب کہاں سے نکلا کہ خدانخواستہ...... پتا تو کرو...... ہوسکتا ہے، زخمیوں میں ہو وہ بھی۔"

بیا کی آس بھری آنکھوں میں دیکھتے نیا نے بمشکل نفی میں سر ہلایا۔

"کچھ نہیں بچا...... بہت بڑا سانحہ تھا...... راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے وہ گارمنٹس شاپ، جو بھی تھا...... سب ختم......"

"اف......"

اب تک حوصلہ دکھاتی ڈاکٹر رابعہ بھی جیسے ڈھے سی گئی تھیں۔

"یا اللہ تو رحم کر۔" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”یہ سکیوریٹی گارڈز تو باہر تھے۔ پھر بھی ایک کی ڈیتھ ہوگئی اور ایک زخمی ہے بہت، اور فائرنگ بھی ہوئی۔ تو خود سوچو جو اندر تھے......“

نیا خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی اور انٹر کام کی مسلسل بجتی بیل کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جا رہا تھا...... شاید اسی لیے سکیوریٹی گارڈ کو اندر آنا پڑا تھا۔ اور اندر کا ماحول دیکھ کر وہ بے چارا ٹھٹک گیا تھا۔

”کیا ہوا......؟“ ”کیا بات ہے......؟“

ڈاکٹر رابعہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”وہ باہر کوئی خاتون آئی ہیں۔ آپ سے ملنے، وہ مسلسل اصرار کر رہی ہیں طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ان کی...... شاید......“ وہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر رک گیا۔

”مشکل میں لگ رہی ہیں بہت۔ بیا بی بی کا نام بھی لے رہی ہیں۔ آپ کہیں تو اندر لے آؤں۔“

”اچھا تم اسے کلینک میں لے آؤ۔“

ایک گہرا سانس لیتی ڈاکٹر رابعہ اس مریضہ کی مدد کے لیے خود کو آمادہ کر چکی تھیں۔ جو ایسے حالات میں ان کی طرف مدد کی امید سے آئی تھی جب ان کا دل کچھ بھی کرنے کو آمادہ نہ تھا۔ بیلا انہیں بیا کی طرح ہی عزیز تھی مگر...... وہ صرف ایک ماں تو نہیں تھیں۔ ڈاکٹر بھی تھیں۔ ایک گہرا سانس لیتی وہ اپنے گھر ہی کے ایک سائیڈ پر بنے اپنے کلینک کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ جس کا دروازہ گھر کی پچھلی طرف سے بھی کھلتا تھا۔ اور چوکیدار یقیناً اسی راستے سے عورت کو لانے کے لیے مڑ چکا تھا۔

☆☆☆

کافی سارا رونے اور چلنے کے بعد نڈھال سی بیلا اس کیفے ٹیریا میں چلی آئی تھی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ کہاں چلی آئی تھی۔ اگرچہ وہ اسی شاپنگ مال میں تھی مگر اسے یہ تک اندازہ نہ تھا کہ جس گارمنٹس شاپ کے باہر وہ اپنے سکیورٹی گارڈ چھوڑ آئی ہے۔ وہ اس کیفے ٹیریا سے کتنے پر فاصلہ پر ہے۔ جوس کا آرڈر دینے کے بعد اس نے بیگ سے موبائل نکال کر ریحان (سکیوریٹی گارڈ) کو کال کرنی چاہی مگر......“اس کا بیگ کہاں تھا......؟

اوہ خدایا! وہ اپنا بیگ اسی مال میں چھوڑ آئی تھی۔ یا کہیں اور گرا آئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ کپکپاتی انگلیوں سے اس نے ایک بار پھر اپنے کندھے کو ٹٹولا۔ جیسے ایسا کرنے سے اس کا گمشدہ بیگ خود بخود اس کے کندھے پر پھر سے آن موجود ہوگا۔ میرا ایسا کہاں ممکن تھا۔ بیگ وہ کھو چکی تھی۔ اور اس میں موجود اپنا سیل فون بھی۔ ویٹر نے اس کے سامنے جوس کا گلاس لا کر رکھا تو وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا کسی سے موبائل مانگ کر مما کو کال کرے۔ مگر مما کا نمبر، وہ اسے کہاں یاد تھا۔ بلکہ کسی کا بھی نمبر اسے کہاں یاد تھا بھلا۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے چھلکنے کو تیار تھے۔ اور تب ہی ایک زوردار دھما کا ہوا تھا۔ کیفے ٹیریا کی کھڑکیوں اور دروازے کے شیشے چکنا چور ہو کر بکھرے تھے کچھ ٹکڑے اڑ کر بیلا کی طرف بھی آئے تھے۔ وہ اگر بے ساختہ نیچے کی طرف جھکی تھی تو اس میں اس کے ارادے سے زیادہ جان بچانے کی فطری اور خواہش کارفرما تھی۔

کیفے ٹیریا کا ماحول ایک دم سے بدلا تھا۔ لوگ دھماکے کی آواز سے خوف زدہ تو ہوئے ہی تھے۔ رہی سہی کسر فائرنگ کی آوازوں نے پوری کر دی۔ اور اب وہ سب باہر کی طرف دیوانہ وار لپک رہے تھے۔

بیلا اس حالت میں باہر کی طرف کبھی نہ نکلتی مگر، لوگ باہر نکلتے ہوئے جس طرح میزوں اور کرسیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ اور گری ہوئی کرسیوں کو جیسے پھلانگ رہے تھے۔ تو ایسے میں یہاں بیٹھے رہنا بھی خطرے سے کم نہیں تھا۔ دھیرے سے اپنے بھاری وجود کو سنبھالتے وہ بھی حتی الامکان تیزی سے باہر بھاگتے ہجوم کا حصہ بن گئی تھی۔ اور باہر نکلتے ہی اسے صحیح معنوں میں تیزی سے بگڑتے حالات کا ادراک ہوا تھا۔ روڈ بلاک تھا۔ کچھ لوگ راستہ نہ ملنے پر گاڑیوں کو وہیں لاک کر کے پیدل ہی مین روڈ کی

طرف جارہے تھے۔
بیلا بھی پارکنگ میں جانے کے بجائے پیدل چلنے والوں کے ساتھ شامل ہوگئی۔ فی الحال اسے یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ اور اس ہجوم کا حصہ بنتے ہی نہ جانے کس احساس کے تحت اس نے اپنے وجود کے گرد لپٹی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ مین روڈ تک آتے آتے اس کا پورا وجود پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ جسم میں رہ رہ کر درد کی ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ درد کو برداشت کرتی، کراہوں کو بمشکل دباتی وہ وہیں فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گئی تھی۔ اب وہ کیا کرے......؟ پسینہ پسینہ وجود اور زرد پڑتی رنگت لیے وہ سوچ رہی تھی۔ تب ہی ایک ٹیکسی اس کے قریب آن رکی۔
''کہاں جانا ہے بیٹی......؟''
ٹیکسی میں موجود باریش بزرگ، فکرمندی سے اسے دیکھتے پوچھ رہے تھے۔ اور نڈھال ہوتی بیلا کے وجود میں اتنی بھی ہمت نہیں بچی تھی کہ انہیں اپنا پتا ہی بتا دے۔ جسم میں موجود طاقت کو یکجا کرتی وہ بمشکل اٹھی اور ٹیکسی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر ڈھے سی گئی۔ ناتجربہ کاری کے باوجود اپنی حالت اسے سمجھا رہی تھی کہ اسے کسی ڈاکٹر کی فوری ضرورت ہے۔ اور ڈاکٹر......؟ اس کا دھیان فوری طور پر صرف ایک نام کی طرف ہی گیا تھا۔

☆☆☆

نومولود بچے کے رونے کی آواز نے دو ڈھائی گھنٹے کی پریشانی کا خاتمہ کیا تھا۔ کلینک کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر رابعہ کو گمان بھی نہیں تھا کہ انہیں اتنی غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر آج کا دن ہی غیر معمولی تھا۔ اور شاید ان کی زندگی کا یادگار ترین دن بھی۔ معمول کے مطابق آدھا دن گزارنے کے بعد ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ صورت حال اتنی تیزی سے اور اچانک پلٹا کھائے گی۔ کہ جس بیلا کے روٹین چیک اپ کے لیے انہوں نے سہ پہر کو اس کے گھر جانا تھا۔ اسی بیلا کا بیٹا شام کو ان کے گھر کے اس چھوٹے سے کلینک میں پیدا ہوگا۔ جس میں گائناکالوجی سے متعلق سامان کا فقدان تھا۔ اور یہ بھی ان کو کہاں خبر تھی کہ بیلا کے بیٹے کی ولادت ان ہی کے ہاتھوں ہوگی۔
وہ ایک اسکن اسپیشلسٹ تھیں اور گائنی سے وابستہ ایک ایک پیچیدہ کیس کو یوں ہینڈل کرنا ان کی بڑی کامیابی تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ غیر معمولی بات یہ تھی کہ جس لڑکی کو وہ مردہ تصور کر رہی تھیں، اس لڑکی کا یوں زندہ سلامت اور بالکل ٹھیک ٹھاک اپنے بچے کے ساتھ یہاں موجود ہونا بہرحال ایک معجزہ ہی تھا۔
بہرحال...... جسے اللہ رکھے، سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے انہوں نے صاف ستھرے تولیے میں لپٹے بچے کو غنودہ سی بیلا کے پہلو میں لٹایا۔ جس کے زرد چہرے پر پھیلا ممتا کا نور بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اور نیا وغیرہ کو خوش خبری سنانے باہر کی طرف چل دیں۔
کلینک سے باہر نکلتے ہی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے نے ان کا استقبال کیا تھا۔ دور کہیں سے اذانوں کی آواز سنائی تھی۔
''ارے دن ڈھل بھی گیا۔'' لان پہ تیزی سے پھیلتے شام کے سائے دیکھ کر انہوں نے حیرت سے سوچا۔ لان کی لائٹس آف تھیں۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔ ان تینوں کو انہوں نے وہیں چھوڑا تھا۔ مگر ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی انہیں رکنا پڑا۔ اندھیرے میں ڈوبا، ویران کمرہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ ''نیا، نی بی......'' گھر کے اندھیرے اور سناٹے سے گھبرا کر انہوں نے بے ساختہ ہی اونچی آواز میں پکارا۔
''کہاں چلے گئے سب؟'' اپنی ہی آواز پلٹ کر آئی، تب ہی قدموں کی چاپ پر انہوں نے مڑ کر دیکھا رضیہ تھی۔
''میں جاؤں بی بی ...... کام ختم ہوگیا ہے سارا......؟''
وہ ان کی وقتی ملازمہ تھی اور صبح سے شام تک

یہیں ہوتی تھی۔
"ہاں، مگر...... یہ بیا وغیرہ کہاں گئے......؟ ابھی تو یہیں تھیں۔" انہوں نے الجھے انداز میں اسے دیکھا۔
"وہ تو جی...... بیا بی بی کی سہیلی نہیں فوت ہوگئی۔ ادھر گئی ہیں۔ بہت رو رہی تھیں جی، اور کہہ رہی تھیں کہ ساڑھے نو بجے جنازہ ہے، بتادوں آپ کو۔" رضیہ نے افسردہ سے انداز میں بتایا۔
"کیا......؟" ڈاکٹر رابعہ ہکا بکا سی رہ گئیں تھیں۔
"یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟"
"کیا کہیں جی...... بڑا خطرناک بم دھماکا تھا جی...... بس اللہ رحم کرے...... میں جاؤں بی بی۔" رضیہ نے تبصرے کے ساتھ ساتھ اجازت بھی مانگی۔
"وہ اصل میں ناجی پپو کو بخار ہے تو......" ان کی خاموشی سے ان نے جانے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"ہاں......" وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"ہاں، ہاں جاؤ......" سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے کر وہ اپنا سیل فون اٹھا کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھی تھیں۔ نیا سے رابطہ ضروری ہوگیا تھا۔ ایک زندہ انسان کا جنازہ......
اف...... انہیں سوچ کر ہی جھرجھری آئی تھی۔

☆☆☆

درد سے نیا کا سر پھٹا جارہا تھا۔ مگر وہ ضبط کیے مختلف معاملات نپٹانے میں مشغول تھی۔ زخمی اور مرنے والے سکیورٹی گارڈز کا تعلق اس کے ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ اور اس کے کہنے پر ہی وہ بیلا کی حفاظت پر مامور ہوئے تھے۔ اسی لیے اسے کئی سوالات کا سامنا تھا۔
دوسری طرف مریم اور بیلا کی بہنوں کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مریم اور رانیہ پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اور فی بی اور بیا بجائے انہیں سنبھالنے یا تسلی دینے کے خود ہاتھ پاؤں چھوڑے بیٹھی تھیں۔ اور وہی کیا۔ بیلا کے ننھیال اور ددھیال سے آئے ہوئے رشتہ دار اور کزنز وغیرہ سب ہی سخت صدمے کی حالت میں تھے۔ کافی لوگوں کو تو بیلا کی موت کا یقین ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک کسی معجزے کے انتظار میں تھے اور یقین آتا بھی کیسے؟ جیتی جاگتی بیلا کے مردہ ہونے کا تصور بھی کیسے کرتے جبکہ دفنانے کے لیے ان کو لاش کے بجائے تابوت میں مٹھی بھر راکھ ملی تھی۔ وہ اس راکھ کو بیلا کیسے مان لیتے بھلا۔ بیلا کے دادا جی بھی مسلسل انکاری تھے۔ مان ہی نہیں رہے تھے کہ وہ اب نہیں رہی۔ ان کی باتیں اور ان سب کی حالت۔
نیا کے غم وغصے میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنی دوست کو بچا نہیں پائی تھی۔ اس کے لیے کچھ کر نہیں پائی تھی۔ مگر اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اپنا کردار ضرور ادا کرنا چاہتی تھی۔ اور ابھی تو اس سارے سانحہ کی تحقیقات بھی کرنی تھیں۔ پتا نہیں یہ بم بلاسٹ حالیہ آنے والی دہشت گردی کی لہر کا نتیجہ تھا۔ یا بیلا کو ٹارگٹ کیا گیا تھا۔
کیا خبر اس بم بلاسٹ کے پیچھے بھی انہی لوگوں کا ہاتھ ہو جنہوں نے افنان کو قتل کیا تھا۔ اس کا شک اس لیے بھی بڑھ جاتا تھا کہ دونوں سکیورٹی گارڈز پر باقاعدہ فائرنگ ہوئی تھی۔ کیا جس نے بلاسٹ کیا تھا اس نے اسلحہ ہاتھ میں لیے ان دو افراد کو اپنے یا اپنے ساتھیوں کے لیے خطرہ سمجھا تھا یا وہ اس لیے مارے گئے تھے کہ بیلا کی حفاظت پر مامور تھے ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔
"میڈم، درانی سر بات کریں گے۔" تب ہی اعجاز اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "آپ کا موبائل آف ہے شاید......"
"ابھی تو کال آرہی تھی، بیٹری ختم ہوگئی شاید۔" اس نے ایک نظر موبائل کی تاریک اسکرین پر ڈالی۔
"لیس سر......"

وہ اعجاز سے اس کا موبائل لے کر برآمدے کی طرف آگئی تھی۔

"عنایا......! میں جبرائیل کو بھیج رہا ہوں۔ آگے کے معاملات وہ دیکھ لے گا۔ ویسے بھی جنازے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ سب مرنے والوں کا مشترکہ جنازہ ہوگا۔ یہ تو جانتی ہی ہوں گی آپ......"

"لیس سر......" اپنی آواز کو ہموار رکھنے کے لیے اسے سرتوڑ کوشش کرنی پڑی تھی۔

"ٹھیک ہے باقی بات پھر کل میٹنگ میں ہوگی۔"

وہ مرنے والی سے اس کے تعلقات کی نوعیت جانتے تھے تب ہی مزید کوئی بات کیسے بنا انہوں نے کال ڈسکنٹ کردی تھی۔

موبائل اعجاز کو واپس دیتے۔ نیا نے یونہی اس کی روشن اسکرین پر نظر ڈالی...... آٹھ بج کر پچپن منٹ۔

"اف......"

یعنی جنازہ میں صرف آدھا گھنٹہ ہی رہتا تھا۔ پھر اس کی پیاری دوست نے اپنے سارے خوابوں سمیت، مٹھی بھر راکھ کی صورت منوں مٹی تلے جا سونا تھا......

☆☆☆

ڈاکٹر رابعہ سرتوڑ کوششوں کے باوجود نیا سے رابطہ کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ انہوں نے بے بسی سے گھڑی کی تیزی سے بھاگتی سوئیوں کو دیکھا۔ وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

"بیا...... ہاں بیا کو کرتی ہوں۔" کوندے کی طرح یہ خیال ان کے ذہن میں لپکا تھا۔

"اف، سامنے کی بات تھی اور ان کے ذہن میں ہی نہیں آئی۔ دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا شاید......؟ انہوں نے تیزی سے بیا کا نمبر ڈائل کیا مگر موبائل کی رنگ ٹون یہیں کہیں بجی تھی۔ انہوں نے چونک کر آواز کی طرف گردن گھمائی۔ صوفے کے پاس رکھی میز پر پڑا موبائل زور شور سے بجے جا رہا تھا۔

"میرے اللہ۔ گاڑی بھی نہیں ہے...... ورنہ خود چلی جاتی۔ رکشے پر جاؤں؟"

"مگر نہیں...... ادھر بیلا کو ہوش آگیا تو...... اس کے ساتھ بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔"

وہ گومگو کی حالت میں تھیں۔

"منیب...... منیب کو کال کرتی ہوں۔ پتا نہیں کہاں رہ گئے، اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔ منیب صاحب پلاسٹک سرجن تھے۔ وقت پر گھر آجاتے تھے۔" انہوں نے تیزی سے ان کا نمبر ڈائل کیا۔

"کہاں ہیں آپ......؟ کب آئیں گے؟"

ان کی آواز سنتے ہی وہ بنا سلام دعا کے شروع ہوئی تھیں۔

"کیوں خیریت...... راستے میں ہوں۔ بس پہنچ رہا ہوں۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں...... آں...... ہاں...... میرا مطلب ہے آپ آئیں تو بتاتی ہوں۔" انہوں نے فوراً کال کاٹ دی تھی۔ اور پھر ان کے آنے تک وہ جلے پیر کی بلی کی مانند، ڈرائنگ روم سے لان اور لان سے ڈرائنگ روم کے کتنے ہی چکر کاٹ چکی تھیں۔

"کیا ہوا خیریت ہے......؟" منیب آئے تو وہ لان میں ہی تھیں۔ وہ بھی وہیں چلے آئے تھے۔

"نہیں خیریت نہیں ہے منیب......"

الجھی الجھی سی رابعہ نے وہیں کھڑے کھڑے ہی انہیں مختصراً حالات سے آگاہ کیا۔

"مائی گاڈ......" وہ ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"بیلا کہاں ہے اب......؟ خیریت سے ہے وہ......؟"

"سو رہی ہے...... خطرے سے باہر ہے اب......"

"ہوں...... ساڑھے آٹھ تو ہو گئے ہیں......" انہوں نے کلائی پر پہنی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔

"اور میرا خیال ہے اب بتانے سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا۔" وہ پرخیال انداز میں بولے۔

''کیا مطلب...... بتائیں گے نہیں انہیں......
جس کا جنازہ ہے وہ ہمارے گھر سکون سے سو رہی ہے اور اس کے گھر والے؟'' ڈاکٹر رابعہ کے سمجھ میں نہیں آیا کہ اب آگے کیا کہیں......

''دیکھو تم تمام حالات سے واقف ہو۔ اگر یہ حملہ بیا پر کیا گیا ہے تو ان لوگوں کو یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ بیا اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا، جب ان کے گھر سے مہمان رخصت ہو جائیں گے تب نیا سے بات کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔''

ان کے کندھے پر ہاتھ پھیلائے اندر کی طرف بڑھتے وہ دھیرے دھیرے انہیں سمجھا رہے تھے۔

''پھر اب؟ کیا کرنا ہے ابھی؟'' ڈاکٹر رابعہ نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''میں بیلا کے جنازے مطلب۔'' وہ ایک پل کو گڑبڑائے۔

اجتماعی جنازہ ہے...... میں جنازہ میں جاتا ہوں۔ سب مرنے والوں کو دعائے مغفرت کی ضرورت ہے۔ تم بیلا کے پاس رہو۔''

''او کے، مگر پھر اس کے بعد؟'' وہ الجھی ہوئی سی تھیں۔

''میں نے کہا ناں ڈونٹ وری۔ میں چینج کر لوں، تم ایک کپ چائے پلا دو پھر میں چلوں۔'' انہوں نے جان بوجھ کر ان کا دھیان بٹایا۔

''ہاں ہاں۔ چائے لاتی ہوں۔''

ڈاکٹر رابعہ ہولے سے سر جھٹکتی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

اور تین دن بعد مریم، عبدالرحمٰن اور قاری صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے بیٹھی جیتی جاگتی بیلا اور اس کے پہلو میں لیٹے بچے کو دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ نیا، بی بی اور بیا انہیں ذہنی طور پر تیار کر کے لائی تھیں۔ مگر پھر بھی ان پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ بیلا نم آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ ان کی طرف دیکھتی ان کے کچھ بولنے کی منتظر تھی۔ بیا اور ڈاکٹر رابعہ نے اسے سب بتا دیا تھا۔ اور ان کی کیفیت کا کچھ کچھ اسے بھی اندازہ تھا۔

''آؤ مریم! اپنے نواسے کو دیکھو...... دیکھو تو کس پر گیا ہے......''

''ہاں......''

مریم کے بت بنے وجود میں جان پڑی تھی۔ انہوں نے چونک کر رابعہ کو دیکھا پھر بیلا کو۔

''بیلا میری بچی...... میری جان۔''

وہ ہولے ہولے خواب کی سی کیفیت میں یوں قدم بڑھا رہی تھیں، گویا وہ ایک واہمہ ہو، جو ان کے پلک جھپکتے ہی غائب ہو جائے گا...... انہوں نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں کو چھوا...... پھر آنکھوں کو، پھر بال، پھر ہاتھوں کو...... پھر گردن...... وہ گویا اسے چھو کر اس کے ہونے کا یقین کر رہی تھیں۔

''بیلا...... بیلا...... میری جان بیلا......''

ان کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکل رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں آ رہے تھے۔ کچھ نہیں۔ اس سے لپٹی، اسے بے تحاشا چومتی وہ وہاں موجود ہر آنکھ کو اشک بار کر چکی تھیں۔ عبدالرحمٰن اور عبدالوہاب ابھی تک بت بنے دروازے میں ہی ایستادہ تھے۔ آنکھوں سے بہتے آنسو سامنے کا منظر دھندلا رہے تھے۔ مگر، بہتے آنسوؤں کے بیچ، وہ جو دھندلا سا منظر آ رہا تھا۔ کیا وہ حقیقت تھا...... اور اگر حقیقت تھا۔ تو خواب سے زیادہ خوب صورت تھا۔

قاری عبدالوہاب صاحب کے پورے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ دل اس رب کی عظمت کے حضور سجدہ ریز تھا۔ تو پھر سر کو بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ وہ وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ انہیں قبلہ رخ کا پتا نہیں تھا۔ مگر اللہ تو ہر جگہ تھا ناں۔

''بابا......''

انہیں یوں ڈگمگا کر بیٹھتے دیکھ کر عبدالرحمٰن صاحب بوکھلا گئے تھے۔ وہ پہلے ہی سمجھ نہیں پا رہے

تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ آنکھوں سے جو آنسو بہہ رہے تھے وہ بے اختیار تھے۔ وہ تو خود کو ہی سنبھال نہیں پا رہے تھے اور اب بابا؟ انہوں نے بوکھلا کر عبدالوہاب صاحب کو دیکھا، وہ سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

''اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

سجدے میں گرے ان کے ہچکیوں سے لرزتے وجود اور کپکپاتی آواز نے، سب کو رلا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب بھی بے اختیار سجدے میں جھکے تھے۔ اور وہی کیا وہاں موجود ہر شخص کا دل گویا اللہ کی نعمتوں کا شکر بجالانے کے لیے سجدہ ریز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''رانیہ، تانیہ اور ایمن کو کال کر کے ادھر ہی بلالیتی ہوں۔ انہیں تو میں نے بتایا ہی نہیں...... اب یوں اچانک دیکھیں گی تو...... کہیں خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جائیں۔''

جذبات کا طوفان تھوڑا تھما، تو مریم نے اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے پہلی بات یہی کی تھی۔

''نہیں آنٹی......'' نیا نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

''کیوں......؟'' مریم نے چونک کر اسے اور پھر عبدالرحمٰن صاحب کو دیکھا۔

''بتانا چاہیے نا انہیں......؟'' وہ الجھ گئی تھیں اور عبدالرحمٰن صاحب نے بے ساختہ ان سے نظریں چرائی تھیں۔ بیلا کی سکیورٹی سے متعلق ان کی نیا سے تفصیلی بات چیت ہو چکی تھی۔ عبدالوہاب صاحب بھی اس میٹنگ میں موجود رہے تھے۔ لہٰذا مریم کی نسبت وہ پرسکون تھے۔

''آنٹی! بیلا کے صحیح سلامت ہونے کی جتنے کم لوگوں کو خبر ہوگی۔ اتنا ہی اس کی زندگی کے لیے بہتر ہوگا اور......''

''مگر وہ بہنیں ہیں بیلا کی، کوئی غیر تو نہیں۔'' مریم نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''اور اب بیلا ماشاء اللہ محفوظ ہے۔ صحیح سلامت ہے۔ اس کی طبیعت تھوڑی بہتر ہوئی ہے تو ہم اسے گھر لے جائیں گے، پھر کیا اپنے کیا غیر سب کو خبر ہو ہی جانی ہے......'' تو ابھی کیوں نہیں......؟''

''نہ اپنوں، اور نہ غیروں کو، آپ تینوں کے علاوہ کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ بیلا زندہ ہے۔'' نیا کے کہنے پر مریم بھنا گئیں۔

''کیا مطلب......؟ کیا جیتے جی مر جائے سب کے لیے؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

انہوں نے ناراضی سے کب سے چپ بیٹھے عبدالوہاب بول اٹھے۔

''تم پہلے نیا کی بات آرام سے بیٹھ کر سن لو۔ وہ جو بھی کہہ رہی ہے۔ بیلا کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہے۔ ہم نے بیلا کو ایک بار کھو کر پھر سے پایا ہے۔ اب پھر سے کھونے کی ہمت نہیں ہے ہم میں۔''

ان کے تھکے تھکے لہجے اور دکھ سے لرزتی آواز میں کچھ تھا۔ مریم چند لمحوں کے لیے چپ سی رہ گئی تھیں۔

''کیا...... کیا بات ہے نیا؟ اب کیا ہونا رہ گیا ہے؟''

دھیرے دھیرے لب چباتی وہ نیا کی طرف متوجہ تھیں۔ اور ان کی آنکھوں میں آئے آنسو...... اب تک خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی۔ بیلا بے چین سی ہو گئی تھی۔ اس کی ایک ضد کی وجہ سے اس کے پیارے کیسی مشکل میں پڑ گئے تھے۔ اولاد کو کھونے کا کرب کیا ہوتا ہے، یہ ان کے زرد چہرے اور بے خواب آنکھیں بتا رہی تھیں۔ اور انہیں ایک بار پھر اسی کرب سے گزرنا تھا۔ کاش، اپنی خواہشوں کی رتھ پر سوار بے لگام بیٹے اور بیٹیاں یہ جان لیں کہ جب وہ اپنی غلطیوں کی بدولت منہ کے بل گرتے ہیں تو ان سے زیادہ تکلیف ان کے پیاروں کو اٹھانی پڑتی ہے۔

''آنٹی......'' نیا ایک پل کو رکی۔

''ہم بیلا کو پوری لائف کے لیے سکیورٹی نہیں دے سکتے۔ اور فرض کیا، آپ اس کے لیے پرائیویٹ سکیورٹی گارڈ کا بندوبست کر بھی لیں تو کیا گارنٹی ہے

کہ دوبارہ حملہ ہونے کی صورت میں بیلا محفوظ رہے گی۔ اور نہ ہی ہم بیلا کو پوری زندگی کے لیے گھر میں قید رکھ سکتے ہیں اور پھر اب بیلا اکیلی بھی تو نہیں ہے۔ اس کا بیٹا بھی تو ہے۔"

نیا نے بیلا کی گود میں لیٹے اس ننھے سے گڈے کے گلابی گالوں کو ہلکے سے چھوا...... اس نے نیند سے کسمسا کر ہونٹوں کو گول کرلیا تھا جبکہ ماتھے پر ننھے سے بل پڑ گئے تھے۔

"تو پھر...... ؟" مریم کو آگے جاننے کی جلدی تھی۔

"کیا سوچا ہے تم نے پھر......"

"پلاسٹک سرجری......"

نیا کے یک لفظی جواب پر مریم تو مریم اب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے ایک طرف بیٹھی۔ ڈاکٹر رابعہ، بیا اور بی بی بھی چونک اٹھے تھے۔

"کیا مطلب......؟"

"کیا کہہ رہی ہو......"

"یہ کیسے ممکن ہے......؟"

"یہ کوئی کورین مووی نہیں ہے۔"

وہ سب ایک دم سے ہی بولنا شروع ہوئی تھیں۔ ایسے میں صرف عبدالرحمٰن صاحب، عبدالوہاب صاحب اور ڈاکٹر منیب ہی تھے جو پرسکون رہے تھے۔ نیا نے ان سے سب کچھ پہلے ہی تفصیلاً ڈسکس کرلیا تھا۔

"ہاں...... ہم بیلا کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کے ذریعے چند ایسی تبدیلیاں لائیں گے۔ کہ یہ بیلا کی حیثیت سے پہچانی ہی نہ جاسکے۔ اسی بدلے چہرے کے ساتھ اس کا آئی ڈی اور پاسپورٹ بنے گا اور یہ ایک نئی حیثیت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی جس میں کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔"

"مگر ہم لوگوں کا کیا......؟"

"کیا ہم بیلا سے پھر کبھی نہیں مل سکیں گے؟"

"کھودیں گے اسے ہمیشہ کے لیے۔"

بی بی اور بیا بے اختیار ہوگئی تھیں۔ اور بولے چلی جارہی تھیں مگر مریم تو ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ جو کچھ نیا کہہ رہی تھی۔ وہ ان کے گمان سے پرے کی باتیں تھیں۔

"نہیں...... ہم دوبارہ ملیں گے...... بیلا کو ہمیشہ کے لیے کھونے سے بچنے کے لیے ہی تو ہم کررہے ہیں یہ سب...... بیلا کو کسی اور حیثیت سے...... فیملی فرینڈ کے طور پر...... دوبارہ انٹروڈیوس کروائیں گے ہم...... یہ میرا ہی نہیں میرے سارے ڈیپارٹمنٹ کا وعدہ ہے۔ بیلا کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ بیلا ہم سے دوبارہ ضرور ملے گی۔ ان شاء اللہ۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے نیا......" ڈاکٹر رابعہ دھیرے سے بولی تھیں۔ "یہ کوئی مووی نہیں ہے......"

"آنٹی! حقیقت مووی سے زیادہ حیران کن...... زیادہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ بلیومی۔ میں نے اپنے تین سالہ کیریر میں ایسے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ......" وہ ایک پل کو رکی۔

"اور ویسے میری منیب انکل سے تفصیلی بات چیت ہوچکی ہے۔ یہ یقیناً پاسیبل ہے۔" اس کے کہنے پر سب نے ڈاکٹر منیب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سب کی سوالیہ نظریں خود پر محسوس کرکے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بالکل ایسا ممکن ہے...... بلکہ آپ جانتے ہیں کوریا میں بچیوں کی بارھویں یا اس کے بعد آنے والی برتھ ڈیز پر سب سے قیمتی تحفہ کیا ہوتا ہے......؟"

انہوں نے صورت حال کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے نادانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اختیار کیا۔

"آنکھوں کو خوب صورت کرنے کے لیے سرجری کروانے کا بلکہ کوریا میں تو آنکھوں، ناک وغیرہ کے آپریشن عام سی بات ہیں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے بھی بڑے شوق سے سرجری کرواتے ہیں۔ بیلا کی تو پھر یہ ضرورت ہے بلکہ اگر بیلا راضی ہو تو اس کے گلے کا چھوٹا سا آپریشن ہوگا۔ اور اس کی آواز بھی بدل جائے گی......"

انہوں نے بیلا کی طرف دیکھا۔ گود میں لیے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے وہ یوں بیٹھی تھی جیسے یہ ساری بات چیت کسی اور کے متعلق ہو رہی ہو۔

''نیا...... تم نے بیلا سے بات کر لی، وہ راضی ہے۔'' فی بی کو اچانک ہی خیال آیا تو وہ نیا سے پوچھ بیٹھی۔

''ہاں......'' نیا کے بجائے بیلا نے جواب دیا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں چھپتے چھپتے۔ مجھے سکون چاہیے۔'' اور اس کے اس جواب کے ساتھ ہی سب کے اعتراضات دم توڑ گئے تھے۔ وہ تیار تھی۔ ایک نئی شروعات کے لیے۔ ایک نئے جہاں میں نئی زندگی کے آغاز کے لیے۔

☆☆☆

چھ سال بعد

سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ ہر طرف کاریں اور ٹیکسیاں رینگتی سی دکھائی دے رہی تھیں اور اس بے پناہ رش میں وہ نازک سی لڑکی ایک چھ سات سالہ بچے کا ہاتھ پکڑے لوگوں کے ہجوم میں بمشکل راستہ بناتی گزر رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے کے پرسکون تاثرات بتاتے تھے کہ وہ اس معمول کی عادی ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ چلتا بچہ بھی جیسے۔ اس دھویں، گرد و غبار اور بے پناہ رش کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب ہی تو بنا کسی جھجک کے اس کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر اب وہ ایک شاپنگ مال میں داخل ہو چکے تھے اور بے پناہ رش کے باوجود سڑک کی نسبت وہاں کا ماحول کافی پرسکون تھا۔ وہ بچہ اس لڑکی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ قدموں کو روکے بنا آگے بڑھتے وہ لڑکی اس کی طرف کچھ کہنے کے لیے جھکی تھی، اور کسی سے ٹکرا گئی تھی۔

''اوہ، معلش'' (اوہ، معذرت چاہتی ہوں)۔ وہ جانتی تھی غلطی اس کی ہے، اسی لیے فوراً معذرت کی تھی اور آگے بڑھ گئی۔ یہ جانے بنا کہ کوئی اسے دیکھ کر ساکت ہو چکا ہے۔

☆☆☆

اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اپنے اپارٹمنٹ کا لاک کھولا، وہ اندازے سے تھوڑی لیٹ ہو چکی تھی۔ مگر یہاں کون تھا اس کا انتظار کرنے والا، اس شہر، بلکہ اس ملک میں ایک حبیب ہی تھا اس کا اپنا اور وہ اس کے ساتھ تھا اس نے ایک نظر اپنے ساتھ اندر آتے خبیب پر ڈالی۔ وہ پرجوش تھا اور خوش بھی۔ بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ وہ چھ سال کا ہو چکا تھا اور اگلے ہفتے سے اس کی اسکولنگ شروع ہونی تھی، اسی سلسلے میں وہ آج شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ یہاں کے تعلیمی نظام کے مطابق پرائمری سیکشن میں چھ سال کی عمر سے ایڈمیشن شروع ہوتے تھے۔ خبیب کو اسکول جانے کا بہت شوق تھا اور اس نے بہت خوشی سے آج کی شاپنگ میں حصہ لیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ بے صبری سے اپنے اسکول میں ایڈمیشن کا انتظار کر رہا تھا۔ پاکستان میں ہوتا تو شاید اسے اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ادھر تو بے ساختہ اسے پاکستان کی یاد آئی تھی۔ ہر موقع پر ہی آتی تھی۔ وہ ان سب سے بچھڑ ضرور گئی تھی۔ بھولی تو نہیں تھی۔

سر جھٹک کر شعوری کوشش سے وہ حبیب کی طرف متوجہ ہوئی۔ جواب پھر سے سارے شاپنگ بیگ کھول کر اپنی شاپنگ دیکھنا چاہتا تھا۔

''بیٹا! اس طرح تو سب بکھر جائے گا پھر سمیٹنا پڑے گا۔ مما تھکی ہوئی ہیں ناں، کھانا کھا کر تھوڑا ریسٹ کر لیں۔ پھر مروہ آئے گی تو اسے سب دکھائیں گے ناں تب آپ بھی دوبارہ دیکھ لینا۔''

اس کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ لے کر ایک طرف رکھتے وہ پیار سے بولی تھی۔ اور مروہ کے ذکر پر وہ فوراً ہی مان گیا تھا۔ مروہ ان کے قریب ہی رہتی تھی اور خبیب سے اس کی دوستی تھی، پچھلے سال اس کے اسکول میں ایڈمیشن لینے کے بعد ہی حبیب کو بھی اسکول جانے کا شوق ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ بے حد سمجھ دار اور فرماں

بردار تھا۔ عام بچوں کی طرح اس نے کبھی بھی اسے تنگ نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ فوراً ہی مان گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ اس کے پھولے گالوں پر پیار کیا تھا۔

"او گڈ بوائے۔" وہ بے ساختہ ہنسی اور پھر اپنی ہی ہنسی کی بازگشت پر چونک گئی۔

آج پندرہ جنوری کا دن تھا...... ایک اہم کال آنی تھی۔ پاکستان والوں کی کوئی خبر آج ہی کے دن ملنی تھی۔ پچھلی کال پر یہی طے ہوا تھا۔ پھر کھانا گرم کرنے، خبیب کو کھلانے اور نماز پڑھ کر اسے سلانے تک اس کے دھیان کے دھاگے الماری کے سیف میں حفاظت سے رکھے اس فون میں الجھے رہے۔ خبیب کے سونے کا یقین کرتے ہی اس نے سیف میں رکھے فون کو باہر نکالا اور ایک نظر خبیب کو دیکھتے باہر لاؤنج میں آ گئی۔ تین بج کر چالیس منٹ تھے۔ پانچ منٹ بعد وہ کال آئی تھی۔ جس سے اسے اپنے پیاروں کی خبر ملنی تھی۔ وہ دھڑکتے دل سے سامنے میز پر رکھے فون کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس پر کال آنے لگی......

"ہیلو......"

طے کیے گئے طریقہ کار کے مطابق اس نے چھٹی بیل پر کال پک کی تھی۔ اسے یہاں آئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اور ہر بار کال آنے پر اسے جتنے سال ادھر آئے ہوئے گزرے ہوتے۔ اتنی تعداد میں بیل ہونے کے بعد ہی وہ کال ریسیو کرتی تھی۔ یہ ایک طرح کا کوڈ تھا۔ اور بچھڑتے یہی طے ہوا تھا۔

اس نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کر لی تھی۔

"مس فاطمہ......؟" لڑکی کا انداز سوالیہ تھا۔

اجنبی آواز، اجنبی لہجہ...... ہر سال کی طرح اس سال بھی مخاطب آواز اجنبی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں خود اس سے زیادہ باخبر ہے۔

"بول رہی ہوں......" اس نے بمشکل اپنا لہجہ سپاٹ رکھا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں......؟"

بولنے والی کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔

"ہاں......"

"کوئی پرابلم......؟" لڑکی کا انداز سوالیہ تھا۔

"نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔" اس نے تسلی کروائی تھی۔

"گڈ......" وہ شاید مسکرائی تھی۔

"ادھر بھی سب ٹھیک ہیں اور ایک گڈ نیوز ہے۔"

"کیا......؟" اس کی بات پر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"لوٹنے کا وقت آ گیا ہے......" اس نے سپاٹ انداز میں اسے گویا زندگی کی نوید سنائی تھی۔

"کب......" کپکپاتے لبوں سے بمشکل نکلا تھا۔

"بہت جلد...... طریقہ کار بتا دیا جائے گا۔ فی الحال ایک مہمان کے استقبال کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"مہمان......؟ کون......؟" آج کا دن شاید عام دنوں سے کچھ ہٹ کر تھا۔

"خبیب کے فادر......"

"کیا......؟" لگنے والا جھٹکا اتنا شدید تھا وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"کیا......؟ کہ کہ کیا مطلب ہے؟ کون ہو تم......؟" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"ریلیکس...... پرسکون رہو۔" لڑکی کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"وہ مر چکا ہے۔ کیا مذاق ہے یہ......؟" وہ رو دی تھی۔ وہ کال اگر اس فون پر نہ آ رہی ہوتی تو وہ کب کی کال ڈراپ کر چکی ہوتی۔ وہ لڑکی اس کے مشکل سے رفو کیے گئے زخموں کو پھر سے ادھیڑ رہی تھی۔

"ہم نے پوری تسلی کر لی ہے۔" ادھر لڑکی اس کی حالت سے بے خبر بول رہی تھی۔

"ایک سال پہلے تمہاری کچھ فیملی ممبرز سے رابطے کی کوشش کرتے ہوئے وہ ہماری نظروں میں

آیا تھا۔ ہم گزشتہ ایک سال سے اسے واچ کر رہے ہیں۔ اسے جانچتے رہے ہیں، وہ وہی ہے۔ ہم نے اس کا اور خبیب کا ڈی این اے ٹیسٹ بھی کروایا ہے ان کا ڈی این اے میچ کر رہا ہے۔ اس کا مطلب سمجھتی ہو۔ وہ خبیب کا باپ ہے۔ وہ بچ گیا تھا دنیا کی نظر میں مر کر بھی زندہ رہا تھا۔ بالکل تمہاری طرح......"

اگرچہ اس فون پر کال ٹریس کرنا یا سننا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر بھی وہ محتاط تھی۔ اور اس کا یا افنان کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"وہ ابھی کچھ دیر تک آئے گا۔ تمہارے گھر سے پانچ دس منٹ کی دوری پر ہے۔ اس کا حلیہ کافی بدل چکا ہے مگر مجھے یقین ہے تم اسے پہچان لوگی۔"

کال کٹ چکی تھی۔ جبکہ وہ سن سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کیا بتا رہی تھی...... کیا یہ ممکن تھا؟ اور اس کا وجدان چلا رہا تھا۔ ہاں یہ ممکن تھا۔ اس کے والدین بیلا کے خاندان سے زیادہ اثر رسوخ کے مالک تھے۔ ان سے زیادہ دولت مند، زیادہ سوشل بلکہ افنان کے فادر کے تو شاید انڈر ورلڈ سے بھی تعلقات تھے تو......

اس نے دھندلائی آنکھوں سے فون کو دیکھا۔ وہ بے جان ہو چکا تھا۔ مگر اس کے مردہ تن میں گویا جان پڑ گئی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے فون اٹھا کر سیف میں رکھا، واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گویا چہرے سے آنسوؤں کے نشانات مٹانا مقصود ہو۔ وہ آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ بچھڑتے سے نیا نے یہ فون اسے دے کر اس پر رابطہ رکھنے کا نہ کہا ہوتا۔ تو وہ کبھی یقین نہ کرتی مگر وہ جانتی تھی یہ فون کال پاکستان کی ایک معتبر ایجنسی کی طرف سے کی جا رہی ہے، یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ واقعی زندہ تھا۔

تب ہی کال بیل کی آواز آئی۔ وہ آ گیا تھا...... بیلا نے واش روم سے نکل کر ایک نظر سوئے ہوئے خبیب پر ڈالی۔ وہ بے خبر تھا۔ پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ دوسری کے بعد تیسری بیل اس نے اسے بجانے نہیں دی تھی۔ دروازہ کھول دیا تھا۔ اور سامنے دیکھ کر ساکت ہو گئی تھی۔ وقت کی نبضیں تھم گئی تھیں۔ اور وہ پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا ناں۔" اس کے لب ہلے تھے...... شاید کسی اور سرزمین پر، کسی اور روپ میں ہم اور تم ملیں گے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے گنگنایا تھا۔ کسی شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ افنان ہی تھا۔

"افنان......" وہ برستی آنکھوں سے اس سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

"تم آج کل کہاں ہوتے ہو......"

جذبات کا طوفان تھوڑا تھما تو بیلا نے افنان سے دریافت کیا۔

"ترکی...... اور تم مصر شفٹ ہو گئی تھیں۔"

"ہاں......"

بیلا پھیکا سا مسکرائی۔ ان کی طرح اپنی شناخت چھپانے والے اکثر افراد اپنا ملک بھی چھوڑ دیتے تھے۔ اس سفر میں ان دونوں ہی نے اپنا وطن اور شناخت کھوئی تھی۔

"پر مصر ہی کیوں......؟"

افنان کا لہجہ پرتجسس تھا۔

"میں خبیب کو قاری بنانا چاہتی تھی۔ بہت اچھا...... یوں کہ اس کی قرأت سیدھی دل میں اتر جائے میرے دادا جی کی طرح اور قاہرہ کی سرزمین اس معاملے میں بہت زرخیز ہے۔" "قاری باسط" جیسے ہیرے اسی کی پیداوار ہیں۔ دادا جی نے بھی یہیں سے سیکھا تھا۔ اور اب خبیب بھی یہاں سے سیکھ رہا ہے۔

"خبیب...... ہمارا بیٹا۔"

کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتے آخر میں اس کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

''ہاں......'' سائیڈ ٹیبل پر پڑی فوٹو فریم میں خبیب کی تصویر دیکھ کر افنان بے ساختہ مسکرایا تھا۔

''افنان کے چہرے پر بیلا کی آنکھیں۔''

کوئی بھولی بھٹکی یاد تازہ ہوئی تھی۔

''اچھا۔''

بیلا نے مصنوعی حیرت سے اس کے حلیے کو دیکھا۔ ترکی لباس اور داڑھی۔ وہ بالکل بھی پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

وہ مسکرائی تھی۔ مگر پھر فوراً لب بھینچ لیے جانے کون یاد آیا تھا۔

''کیا ہوا......؟''

افنان نے اس کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھا۔

''کچھ نہیں...... تمہاری فیملی؟ تم ملتے ہو اپنی ممی اور ڈیڈ سے......؟''

''نہیں......''

بیلا کے پوچھنے پر افنان نے گہری سانس آہ کی صورت نکالی تھی۔ ''مگر اب شاید ہم پھر مل سکیں۔ بیچ میں کچھ لوگ ہیں جو رابطہ بنائے رکھتے ہیں۔ وہ اب انڈیا سے کسی اور ملک میں شفٹ ہوں گے تو شاید ٹوٹا ہوا رابطہ بحال ہو جائے۔ میں کسی واقف کار کے طور پر تو ان سے رابطہ رکھ ہی سکتا ہوں۔''

افنان کے لہجے میں امید تھی۔

''وہ انڈیا سے شفٹ ہو رہے ہیں؟ کیا ہمیشہ کے لیے......؟ اور تمہاری ممی!...... وہ مان گئیں انہیں تو تمہارے انگلینڈ شفٹ ہونے پر بھی بہت اعتراض ہوا تھا۔'' بیلا کو حیرت ہوئی تھی۔

''کیسے نہ مانتیں......؟ ماننا ہی پڑا۔ اور انڈیا اب رہنے کے قابل کہاں رہا ہے۔ خاص کر مسلمانوں کے لیے۔'' افنان پھیکا سا مسکرایا تھا۔

''این آر سی'' اور ''سی اے اے'' کی وجہ سے کہہ رہے ہو۔'' بیلا نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں......'' افنان دھیرے سے بولا تھا۔

''بیلا! وہاں موجود صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی شناخت داؤ پر لگی ہے صرف اس لیے کہ وہ ہندو بلکہ اونچی ذات کے ہندو نہیں ہیں۔ بنا کسی وجہ کے صرف ان کے مذہب کی بنیاد پر ان کی شناخت ان سے چھینی جا رہی ہے۔ تم نے بھی تو اپنی شناخت کھوئی ہے ناں......؟ جانتی ہی ہو گی کہ شناخت کھونے کا کرب کیسا ہوتا ہے۔'' بھری دنیا میں تمہارہ جانے جیسا...... ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اپنا نہ رہا ہو۔'' اس نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

''جانتی ہو جب تمہارے مرنے کی اطلاع ملی تھی تو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ تم اور میرا بچہ دونوں ہی اس دنیا سے چلے گئے تھے۔ بہت رویا تھا میں مگر اس سے بھی زیادہ کرب سے میں اس وقت گزرا تھا جب افنان سے ارسلان بنا تھا...... ایک ہی دن میں سب کو کھو دیا تھا میں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی، بچہ، دوست...... جب تمہارے مرنے کی اطلاع ملی اس سے پہلے ہی تم مر چکی تھیں میرے لیے۔ جانتا تھا تم سے بھی افنان کی حیثیت سے مل سکوں گا، نہ اپنے بچے کو باپ کا پیار ہی دے پاؤں گا کبھی...... کیونکہ میں اپنی شناخت کھو چکا تھا...... افنان رہا ہی نہیں تھا...... تمہارا اور میرا یوں ملنا تو ایک معجزے جیسا ہے......

اور انڈیا کے کروڑوں انسان بھی کسی معجزے کے ہی منتظر ہیں۔ ہم جیسے مسلمان تو بہت کم ہیں جو انڈیا سے مائیگریٹ (نقل مکانی) ہو رہے ہیں۔ باقی کروڑوں مسلمانوں کے لیے تو انڈیا کی زمین تنگ کر دی گئی ہے۔ وہ وہاں رہ بھی نہیں سکتے اور وہاں سے کہیں جا بھی نہیں سکتے۔''

دھیرے دھیرے پیشانی مسلتے وہ جیسے ایک کرب مسلسل میں تھا۔ اور بیلا تسلی دینے کے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتی تھی۔

افنان نے پرجوش انداز میں اسے دیکھا۔

''اکیلا انسان کیا کر سکتا ہے افنان۔''

بیلا کی آواز میں بے بسی تھی۔
"کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے نہیں تھے۔ ابتدا میں اللہ کے سوا اور کون تھا ان کا مددگار پھر کیا انہوں نے بدل نہیں دیا تھا سب کچھ...... پوری دنیا بدل دی تھی بیلا! ہم بھی بدل سکتے ہیں۔" وہ جیسے بیلا کو امید دلا رہا تھا۔
"وہ پیغمبر تھے افنان۔"
"اور ہم ان کے امتی ہیں بیلا۔"
افنان نے اسے دیکھا۔
"تمہیں پتا ہے وہ آخری پیغمبرؐ ہیں، آخری نبی ﷺ۔"
اس نے ایک نظر بیلا کو دیکھا وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اس کا مطلب سمجھتی ہو۔"
اس نے سوالیہ انداز میں بیلا کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
"اس کا مطلب ہے اب دین کو پھیلانے اور اس کو مضبوط کرنے کا کام امتی کریں گے۔ پیغمبر تو اب کوئی آئے گا ہی نہیں۔"

☆☆☆

قاری عبدالوہاب نے ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے امانت علی پر ڈالی۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور بہت کمزور مگر ضد کر کے ان کے ساتھ قاہرہ میں یہ مقابلہ قرأت دیکھنے چلے آئے تھے۔
بوڑھے تو خیر وہ خود بھی ہو چکے تھے۔ اور کمزور بھی مگر پھر بھی جانے کیسی آس تھی جو مرنے نہیں دیتی تھی۔ زندہ رکھے ہوئی تھی انہیں۔ انہوں نے عینک کے دھندلا جانے والے شیشے صاف کیے اور دوبارہ لگا سامنے دیکھنے لگے۔ وہ اگلی رو میں بیٹھے تھے۔ قاری باسط صاحب کے شاگرد کی حیثیت سے پورے قاہرہ بلکہ مصر میں ان کی پہچان اور عزت تھی۔ اور انہیں ہر سال باقاعدہ دعوت دے کر قاہرہ بلایا جاتا اور ان سے قرآن پاک کی قرأت کروائی جاتی۔ وہ بے حد لمبی سانس میں قرأت کرتے تھے۔ اس مقابلے میں انہیں بطور چیف گیسٹ مدعو کیا گیا تھا۔ ایک بچہ ابھی قرأت کر کے گیا تھا۔ اور اس کے فوراً بعد جو بچہ آیا تھا۔ اس نے سورۃ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ یہ سورۃ رحمٰن کی تلاوت اور اس کی آواز نہیں تھی جس نے قاری صاحب کو چونکا دیا تھا۔ یہ اس کا انداز تھا جس نے انہیں مسمرائز کر دیا تھا۔ اس کا انداز انہیں کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ بے اختیار تھوڑا آگے کو جھکتے انہوں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اور اسی وقت اس نے اپنی پلکیں اٹھائی تھیں۔ اور اس کی آنکھیں وہ ہیزل گرین آنکھیں۔ وہ بھول سکتے تھے بھلا...... ایسی آنکھیں انہیں کسی کی یاد دلا رہی تھیں۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ساتھ بیٹھے امانت علی کا ہاتھ تھام لیا تھا...... اگر وہ غلطی پر نہیں تھے تو آج انتظار ختم ہوا تھا۔ ان کی بیلا لوٹ آئی تھی۔
"اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

☆

سلویٰ سیف اللہ بٹ

نازیہ ایک اچھی فطرت کی سلجھی ہوئی عورت تھی۔ پوری دس جماعتیں پاس تھی۔ اس نے پندرہ برس کی عمر میں میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کا نوخیز خواب ڈگری کالج میں داخلہ اور ایف۔ایس۔سی کرنے کا تھا۔ اس کے ابا جی درزی تھے جو زیادہ تعلیم کو لڑکیوں کا ذہنی خلفشار گردانتے تھے۔ نتیجہ آنے کے دو دن بعد تک وہ ماں کی بغل اور کبھی کالا پرانده پکڑے، بڑبڑاتے ہوئے سیٹی نما سسکیاں لیے جاتی۔ اس کی گھریلو ماں کو اعتراض ڈھونڈنے کے لیے بہت سوچ بچار کرنی پڑی۔ بالآخر ان کی مشکل عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے بڑے بیٹے نے آسان کر دی۔

''ماں! اب اسے گھر کے کام کاج سکھاؤ۔ اٹھارہواں لگتے ہی یہ اپنے گھر بار کی ہو جائے، یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی۔''

اماں شوہر اور بیٹے کی فرماں بردار۔ ان کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتی تھیں۔ نازیہ سے چھوٹی تین اور بہنیں تھیں۔ سب سے چھوٹا دوسرا بھائی۔ وہ تعلیم اور کرایوں میں، پیسہ اور وقت برباد نہیں کر سکتی تھیں۔

تیسرے دن ماں نے اس کی کلائی جکڑ کر پکڑی اور چولہے کے سامنے بٹھایا۔

''انڈے ابالو۔'' پتیلی میں چار انڈے ڈال کے اس کے آگے رکھے گئے۔

''مجھے نہیں ابالنے آتے۔'' یہ مکمل جھوٹ تو نہیں مگر مبالغہ آرائی ضرور تھی۔

جب بھی انڈے ابالے گئے، وہ گیند کی مانند سخت اور کبھی چاولوں کی ٹھنڈی پیچ کی طرح زردی پھیل جاتی۔

''آدھی پتیلی پانی بھرو۔ چمچہ بھر کر نمک ڈالو۔ جب چھلکا تڑک (ٹوٹ) جائے تو سادہ پانی میں ڈبو کے چھیل لینا۔''

آنکھیں ماتھے پر اور لہجہ انتہائی سخت تھا۔ وہ ماں کی آنکھ کی گھوری کی پہچان رکھتی تھی' زیادہ چوں چراں کرنے پر مار پڑ سکتی تھی۔

''آگ کتنی رکھوں؟'' اس نے اپنی کھولن نکالنے کے لیے ماں کو زچ کیا۔

''پتیلی کے صرف پیندے کے نیچے تک۔ میرے سینے میں جتنی مرضی لگا دو۔''

اس کے دل سے کتابوں اور پڑھائی کی کسک کبھی نہ گئی۔ وہ محلے کی ہر کالج جاتی لڑکی کو بڑی حسرت اور توصیف بھری نگاہ سے دیکھتی۔ چاروناچار اسے گھریلو امور سنبھالنے پڑے۔ اگلے دو برس میں وہ امور خانہ داری میں اس قدر طاق ہو چکی تھی کہ بڑے بھائی کی منگنی والے دن پینتیس لوگوں کے طعام کے پتیلے اس نے خود ہی چڑھا لیے۔ ماں اس کے واری صدقے جاتی۔ بیسواں لگتے ہی اس کے باپ نے، مڈل پاس احمر جنرل اسٹور والے کے ساتھ اسے رشتہ ازدواج میں باندھ دیا۔

☆☆☆

ساس، سسر، اسکول کا طالب علم دیور اور نند پیا دیس سدھاری۔ طریقہ وسلیقہ اس کے اٹھنے بیٹھنے سے ہی واضح ہو جاتا۔ ہر کام میں پھرتیلی، فجر کی اذان کے ساتھ اٹھتی، فرض نماز اور قرآن پاک کی تلاوت

کے بعد باورچی خانے کا رخ کرتی۔ گھر والے اس کے گرویدہ، شریکاں برادری بھی اس کے اخلاق اور سگھڑاپے کی مثالیں دیتے۔ زبان اتنی شیریں جیسے شہد ٹپک رہا ہو۔ ہر رشتے کے ساتھ وہ ''جی'' کا صیغہ ضرور لگاتی۔

کفایت شعار اس قدر کہ لان کا عام سا سوٹ بھی تین سال چلا لیتی۔

سال بھر بعد اس کی گود میں حرم آئی۔ اس سے دو سال چھوٹا زین اور پانچ سال بعد ارحم نے آ کر ان کا خاندان مکمل کر دیا۔

یہیں سے اس کی ایک خامی پکڑی گئی۔ جو اس کے خیال اور دلائل کی روشنی میں ''کچھ'' بھی نہیں تھا۔

وہ بچوں کے معاملے میں بہت انتہا پسند تھی۔ ان کے کھانے سے لے کر پہننے تک اسے سب خاص اور اچھا والا چاہیے ہوتا۔ احمر کی کمر خرچے پورے

کرتے دوہری ہو جاتی، اسے پروا نہیں تھی۔ اس کی زندگی حسرتوں میں گزری تھی، وہ اپنی اولاد کو سب بہترین دینے پر کمر بستہ تھی۔

بچوں کو ناشتے میں بریڈ مارجرین، مکھن، جیم، پنیر یا پھر ڈبے والا دلیہ دیا جاتا۔ دوپہر کو نوڈلز، پاستا، میکرونی، ونگز اور چکن سینڈوچز کا اہتمام ہوتا۔ رات پلاؤ، شوارما، زنگر برگر، ٹرائفل کے علاوہ آئس کریم اور فریش جوسز سے دیے جاتے۔

حرم اور زین کے اسکول میں پلے گروپ کی فیس تین ہزار تھی۔ داخلہ فیس، پیپر فنڈ، سلیبس، کتابیں دیگر اخراجات پر اس کی پورے پچاس ہزار کی کمیٹی لگ گئی۔ دنوں اس کے دل میں قلق رہا مگر نازیہ بہت خوش تھی۔ اپنی ایک ایک بہن کو فون کر کے بتاتی کہ بچوں کو بڑے اور اچھے والے اسکول میں داخل کروایا ہے۔

احمر نے اسے کئی بار واضح الفاظ میں منع کرنا چاہا مگر وہ بچوں کے مستقبل کی افادیت پر ایک لمبی چوڑی تقریر اتنے جوش و خروش سے کرتی کہ وہ مکمل طور پر مطمئن نہ ہونے کے باوجود بھی اگلے اخراجات کے لیے کمر بستہ ہو جاتا۔ ساس سسر بھی دبا دبا اعتراض کرتے مگر نازیہ کی اس ایک معاملے میں ضد اور ہٹ دھرمی انہیں خاموش کروا دیتی۔

ان تمام شکایات اور مالی تنگ دستی کے باوجود دونوں بچے خاصے باتمیز اور سلجھے ہوئے تھے۔ اسکول، ٹیوشن اور سپارہ پڑھنے کے بعد بچ جانے والا وقت وہ کارٹون دیکھنے میں گزار دیتے۔

”احمر! آپ گیارہ بجے تک گھر آ جائیے گا۔ آج ان کا پیرنٹس ڈے ہے۔ حرم بیٹا! میں نے لنچ بکس نہیں بنایا۔ آتے ہوئے کچھ لے آؤں گی۔“

نازیہ نے زین کے کندھے پر بیگ ڈالتے ہوئے حرم کو سمجھایا۔

”ماما جی! پلیز۔ آپ میرے اسکول مت آئیے گا۔“ حرم نے منہ بسورتے ہوئے ناک چڑھائی۔

”کیا مطلب...... کیوں نہ آؤں؟“ وہ حیرت سے ٹھٹکی۔

”لاسٹ منتھ بھی آپ نے پرانا سا ڈریس خوب آئرن کر کے پہن لیا تھا۔ میں نے کتنی انسلٹ فیل کی اپنی فرینڈز میں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔ نازیہ کی رنگت زرد اور جسم سرد پڑ گیا۔ احمر بائیک کا تیل چیک کر رہا تھا، وہ بھی پلٹا۔

”حرم! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ وہ منمنا کے رہ گئی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی ماما جان۔“

حرم سر جھکا کے کہتی۔ آہستہ سے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

احمر نے زور سے سر جھٹکا۔ اس کے چہرے پر صبر و ضبط درج تھا۔ حرم کے سچ نے اس کے برسوں جلتے دل پر ٹھنڈے چھینٹے ڈالے تھے۔ بچوں کی اتنی مہنگی ضروریات، خواہشات پوری کرتے اس کے پاس اپنے لیے رقم ہی نہیں بچتی تھی۔

دن بھر گھر کے کام نپٹاتے، حرم کی باتوں کی چنگاری اس کے ذہن میں ہوتی رہی۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ ”بچی درست فرما رہی ہے“۔

اتنے مہنگے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے والدین کے اسلوب بھی مہنگے ہی ہونے چاہئیں۔

رات کو اس نے احمر سے پیسے مانگے۔ جو اس نے دینے کا وعدہ کر لیا۔ مگر تب تک حرم پھر نئی فرمائش لیے کھڑی تھی۔

”ہمارے اسکول میں مینگو ڈے ہے ماما جان! میں پارٹیسپیٹ (حصہ) کروں گی۔ مجھے ڈریس، شوز اور تھوڑا سا سامان چاہیے۔ کل سنڈے ہے۔ میں خود بازار جاؤں گی۔“

ساڑھے نو سالہ حرم اپنی خریداری خود کرنے کا ارادہ باندھ رہی تھی۔ نازیہ اس کے پر عزم چہرے پر دھیما دھیما جوش دیکھتی چپ رہ گئی۔

☆☆☆

رات دیر تک احمر اپنے والدین کے کمرے میں

بیٹھا رہا۔ دس بجے کے قریب نازیہ کچن کا پھیلاوا سمیٹ کے اسے بلانے گئی تو بلا ارادہ ہی اس کے قدم وہیں ٹھٹک گیے۔

''احمر! تمہیں تو اس عورت نے بالکل ہی کاٹھ کا الو بنایا ہوا ہے۔ ہر وقت اپنی منہ زوری...... وہ بچے تمہارے بھی ہیں، ہمارے بھی ہیں۔ مگر ان کی بہتری کا صرف وہ اکیلی سوچ سکتی ہے۔'' رشید صاحب کی آواز غصے سے بھری تھی۔

''احمر پتر! بے شک اس نے گھر کا سارا کام بڑے سلیقے سے سنبھال رکھا ہے۔ یہ بھی تو سوچ، تیری بیٹی کو دسواں سال لگ گیا ہے۔ گھر کی مرمت بھی نئے سرے سے ہونی ہے اور تیرے پاس بچت کا ایک دھیلا بھی نہیں ہے۔ کل کو اسے جہیز میں ڈگریاں دے گا۔ بغیر جہیز اور اس پرانے کھنڈر مکان سے کوئی بھی تیری بیٹی نہیں لے کر جائے گا۔''

ماں نے کڑوا سچ بولا تھا۔

نازیہ کے دل پر زور سے گھونسا لگا۔

''اور اگر تربیت استاد نے کرنی ہے تو پھر جنت کا حق بھی استاد کو ملنا چاہیے، ماں کو نہیں۔'' ابا جی کا موڈ بہت خراب تھا۔

احمر خاموش سب سن رہا تھا۔

''میں تجھے کہہ رہا ہوں احمر! جیسے تیسے بھی کر کے، لالے اکرم کے ساتھ کمیٹی ڈال لے۔ تیرے دو چھوٹے بچوں کے اتنے اخراجات ہیں، تیسرے کو تو یقیناً تو دکان اور موٹر سائیکل بیچ کر اسکول جمع کروائے گا۔''

ابا جی کبھی کبھار ہی مداخلت کرتے تھے۔

نازیہ کا اوڑھنا بچھونا اس کے بچے ہی رہ گئے تھے۔ ان کے لیے پکانا، اسکول، ٹیوشن کی فکر شام کا ہوم ورک اتنا کچھ کرنے کے بعد احمر کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ اگر وہ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے سب کر رہی تھی تو وہ بھی احمر کے والدین تھے، انہیں بھی حق تھا۔

☆☆☆

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ نازیہ کو ساس اور سسر کی کوئی بات ــــ بری نہیں لگی تھی۔ احمر بھی چپ سا ہو گیا تھا۔ نازیہ نے جان بوجھ کر خاموشی کی وجہ نہ پوچھی، اس کا اپنا دل بھی بوجھل سا تھا۔

شام میں حرم نے ٹیوشن جانے سے انکار کر دیا۔ وہ رو دینے کو تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی ٹیوشن۔ آپ ہمیں گھر میں ٹیوٹر رکھوا کے دیں۔ میری سب فرینڈز کو ٹیوٹر پڑھانے آتے ہیں۔ سارے محلے کے گندے بچے منہ اٹھا کے پڑھنے آجاتے ہیں۔''

اس کی سوچ، لہجہ کتنا کڑوا تھا۔

اس کا دماغ جس سمت اشارہ کر رہا تھا، وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا مستقبل روشن کل کس طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

نازیہ کا دو ماہ سے میکے کا چکر نہیں لگا تھا۔ اتوار

کے روز اس نے صفائی کے ساتھ شام کا کھانا بھی بنادیا۔ ساس کو دوپہر کے لیے روٹی ڈالنے کا کہہ کر وہ بچوں کی طرف آئی۔

"حرم بیٹا! آپ ابھی تک نہائی نہیں۔"

وہ صبح سے کارٹون دیکھنے میں مگن تھی۔ زین نہا کے، صاف ستھرا لباس پہنے، بال بنائے بیٹھا تھا۔

"مجھے نہیں جانا ماما جی۔" اس نے صفاچٹ انکار کردیا۔

"کیوں نہیں جانا۔" نازیہ کا یک دم پارہ چڑھا مگر اخلاق کے دائرے میں رہ کے ضبط کرنا پڑا۔

وہ بہت نرمی اور شائستگی سے بچوں کو مخاطب کرتی تاکہ ادب و آداب ان کی زبان میں بھی پروان چڑھے۔

"ایک ہی تو چھٹی ہے۔ وہ بھی میں وہاں جاکے، بور ہو کے نہیں گزارنا چاہتی۔" اس کا انداز نخوت بھرا تھا۔ ماں ــــــ دنگ رہ گئی۔ مگر جبر کرنا ضروری تھا۔

"بور کیوں ہونے لگیں۔ رحمہ ہے ناں تمہاری فرینڈ، اس سے باتیں کرنا اور کھیلنا۔" اس نے نرمی سے بہلایا۔

"اس ڈفر کے پاس گورنمنٹ اسکول کے تھرڈ کلاس قصے ہوتے ہیں۔ کانفیڈنس اس میں ذرا بھی نہیں۔ ماموں کے آجانے پر کیسے بڑے سے دوپٹے سے سر ڈھانپ لیتی ہے۔ کیبل ان کے گھر میں نہیں۔ اسپئیر ٹائم میں رحمہ ممانی جان کے ساتھ کچن کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہے۔ میرے لیے اس اولڈ ایج ہاؤس میں کچھ بھی انٹرسٹنگ نہیں۔ سوری ماما جان! میں نہیں جاؤں گی۔" ساڑھے نو سالہ حرم کا لہجہ صاف اور دوٹوک تھا۔

نازیہ کا دل اتنے برسوں میں پہلی بار ٹوٹا تھا۔ بھلا وہ کب کسی کے مشورے یا روک ٹوک کو سنجیدگی سے لیتی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی خوشی تھی کہ اس کی بیٹی اردو کے ساتھ انگریزی کے لفظوں کا تڑکہ لگاتی ہے۔ یہ تڑکہ اب اس کی آنکھوں اور منہ میں کڑواہٹ بھرنے لگا تھا۔ تربیت بڑے اسکول، مہنگی فیسیں دے کر نہیں بلکہ ماں کے جنت کا حق ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

سارا خاندان اس کے ادب و آداب اور رکھ رکھاؤ کی تعریف کرتا تھا۔ وہ بھی تو گورنمنٹ اسکول سے پڑھی تھی اور اس کی ماں چٹی ان پڑھ تھی پھر بھی اس نے ماں ہونے کا حق ادا کرتے اسے اپنی عقل اور سمجھ سے بڑھ کر بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو ایسی کوئی بھی کوشش نہیں کررہی تھی۔ سوائے مہنگے اسکول پر انحصار کرنے کے۔

اس سے پہلے کہ اس بچی کو رشتوں کے بعد والدین میں عیب نظر آنے لگتے۔ اسے اپنا آپ ڈھک لینا چاہیے تھا۔ اسے پاؤں اپنی چادر کے اندر کرلینے چاہیے تھے۔

نازیہ کو اتنے برسوں میں پہلی بار شوہر کے چہرے پر ملال، اداسی اور تھکن کھنڈی نظر آئی۔ اس کے روم روم میں بھی بھاری پن سرایت کرگیا۔

"احمر! آپ رحیم چاچا کے ساتھ بڑی کمیٹی شروع کرلیں۔"

اس نے کروٹ کے بل لیٹے احمر کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف منہ کیا۔

"مگر کیسے...... اخراجات اتنے بڑھ......"

"آپ کل دوپہر میں وقت نکال کے آئیے گا۔ مجھے اپنے ایریے کے پرائیوٹ اسکولز کا وزٹ کرنا ہے۔"

احمر کی آنکھیں جو نیند کے خمار سے بند ہوئی جارہی تھیں، پوری کھل گئیں۔ نازیہ کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ اور آنکھیں روشن تھیں۔ احمر کی نیند سے بوجھل پلکیں جڑ گئیں۔ اس نے کیوں اور کیا کا سوال نہیں اٹھایا تھا۔ اس کی دعاؤں کو قبولیت کا درجہ مل گیا تھا۔

اسے امید اور یقین تھا اس کا کل بہت سنہرا اور روشن ہوگا۔

☆

فروری 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکار "اسامہ اعظم خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "سحر خان" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "ثانیہ مرید" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- "کنارِ خواب جو" فرح بخاری کا مکمل ناول،
- "محبت فروری کی دھوپ" شائمہ دلعباد کا مکمل ناول،
- "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کا ناولٹ،
- "مجھے تیری ضرورت ہے" انعم خان کا ناولٹ،
- "انتقام" نادیہ امین کا ناولٹ،
- ام اقصیٰ، عذرا فردوس، کوثر ناز اور ان ظرنا فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- **"کرن کتاب"**

معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

فروری 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

نمرہ احمد

حالم

"آپ نے اپنا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"چ تالیہ.... آپ شاید مجھے پسند نہیں کرتیں۔" ایشا ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "یا آپ کو میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہے شاید۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کی شام تلخ ہو رہی ہے۔ میں اب سونے جاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے ویسے بھی یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں صبح یہاں سے اپنی بیٹی کے ساتھ موو کر جاؤں گی۔ آپ اپنا دل میری طرف سے صاف کر لیں کیونکہ اللہ شاہد ہے.... میں نے ہمیشہ آپ کی حمایت کی ہے۔" وہ باوقار انداز میں اپنی صفائی دیتے ہوئے سب کو شب بخیر کہہ کے مڑ گئی۔

"میری حمایت؟" تالیہ نے ابرو اٹھایا۔ اس کے تاثرات ویسے ہی تھے۔ ایشا گہری سانس لے کر پلٹی جیسے اب اس کے تفتیشی انداز سے تنگ آ گئی ہو لیکن مہمان ہونے کی وجہ سے لحاظ کر رہی ہو۔

"آپ جولیانہ سے پوچھ سکتی ہیں۔ کیا میں

۳۷

سینتیسویں قسط

نے نہیں کہا تھا کہ جولیانہ عدالت میں آپ کے حق میں گواہی دے؟"

فاتح نے بے اختیار پیشانی کو چھوا۔ ہر شے جیسے تلپٹ ہو کے رہ گئی تھی۔

"عدالت؟" تالیہ نے چونک کے فاتح کو دیکھا۔

"مسز ہیشا.... آپ ریسٹ کریں۔ میں ہینڈل کرلوں گا۔" فاتح کے کہنے پہ ہیشا سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگئی لیکن تالیہ مراد اپنی نشست پہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی فاتح؟"

جولیانہ نے ایک ناراض نظر تالیہ پہ ڈالی اور اٹھ کے ہیشا کے پیچھے چلی گئی۔

"تالیہ کیا میں تم سے اکیلے میں بات کر سکتا ہوں؟" وہ جو اب تک خاموشی سے ضبط کر رہا تھا' اٹھتے ہوئے بولا اور اسٹڈی کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے کی جھری سے سکندر نے ان دونوں کے بگڑے تاثرات کے ساتھ اسٹڈی کی طرف جاتے دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔

"ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتی؟" وہ دونوں اسٹڈی میں آئے تو تالیہ برہمی سے بولی۔ وہ اس کی طرف گھوما اور اس سے زیادہ تلخی سے بولا۔

"یہ کس طرح کا سلوک تھا تالیہ؟ میں تمہیں اپنی فیملی کا حصہ بنانا چاہتا ہوں اور تم...."

"مجھے آپ کی فیملی کا حصہ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن آپ کو بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہتی تھی۔ یہ عورت...' اس نے ہاتھ سے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ عورت فراڈ ہے۔ کون وومن ہے۔ آپ کو دعویٰ تھا کہ آپ اپنے گھر میں داخل ہونے والی عورتوں کی نیت سمجھ جاتے ہیں۔ آپ کی وہ حس اب بے کار ہوتی جا رہی ہے۔"

"یا اللہ.... اس بے چاری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" اس نے ماتھے کو چھوا۔ "ہم اس کو دو سال سے جانتے ہیں۔ وہ کوئی فراڈ نہیں ہے۔ وہ میری بیٹی کی ٹیوٹر ہے۔ برے وقت میں اس نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"وہ ایک بہروپیا ہے اور آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آپ کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔"

"اس کی سیکیورٹی کلیئرنس بہت دفعہ ہو چکی ہے۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو سامنے آجاتی۔"

بجلی زور کی کڑکی۔ ایسے جیسے دور کہیں کسی کے دل پہ گری ہو۔

"یعنی میری بات پہ آپ کو یقین نہیں ہے؟"

"تم یہ بات کس بنیاد پہ کہہ رہی ہو؟" وہ اب کے گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر یہ عورت واقعی فراڈ ہے تو اس کی پوری تفتیش کی جائے گی۔ مجھے کوئی ٹھوس وجہ دو ورنہ میں کیسے ایک مظلوم عورت کو مشکوک قرار دے کر سیکیورٹی ایجنسیوں کو اس کے پیچھے لگا دوں؟"

"مطلب وہی نا۔ تالیہ کے قول پہ آپ کو یقین نہیں ہے۔" وہ بے بسی بھرے غصے سے بولی۔ وہ دونوں اسٹڈی کے وسط میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے پہ تلخ تاثرات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے شیشے پہ بارش کے قطرے ایک دم تڑتڑاتے ہوئے گرنے لگے۔

"تمہیں کیوں لگا کہ وہ کوئی فراڈ ہے؟"

"کیونکہ اسے ذوالکفلی نے بھیجا ہے۔ تالیہ مراد کے سانچے پہ تراش کے تاکہ اسے آپ کی زندگی میں داخل کر سکے۔"

"کیا تم نے ذوالکفلی سے اس بارے میں پوچھا ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ اور ظاہر ہے اس نے انکار کر دیا... لیکن میں جانتی ہوں یہ اسی کا کام ہے۔"

فاتح نے ملال سے سر جھٹکا۔ کھڑکیوں پہ برستی بوندوں کی آواز تیز ہوگئی تھی۔

"تم چھ سال پہلے والے دور میں جی رہی ہو جب ذوالکفلی ہمارا دشمن تھا۔ تم یہ بات تب کہتیں تو میں مان جاتا۔ لیکن اب اس بات کو برسوں گزر چکے

ہیں۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔"

تالیہ بے بسی بھرے غصے سے اسے دیکھے گئی۔ اس کی چمکیلی شام کو کسی نے جلا کے راکھ کر دیا تھا۔

"آپ کو نہیں ماننا۔ آپ نہ مانیں۔ مگر مجھے بتائیں بیشا کیا کہہ رہی تھی۔"

"وہ جولیانہ کی بات کر رہی تھی۔" فاتح نے سر جھٹکا اور میز کے دوسری جانب آیا۔ ایک کھڑکی کھلی تھی۔ اس سے پانی اندر آرہا تھا۔ "جب وہ کیک آتے تھے تو جولیانہ انہیں دیکھتی تھی۔ ان پہ آئسنگ نہیں ہوتی تھی۔ یعنی آئسنگ بعد میں چھڑکی جاتی تھی۔" وہ کھڑکی بند کرتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"اور آپ خاموش رہے؟"

"اس نے مجھے بھی بہت عرصے بعد بتایا تھا۔ اور جولیانہ نفسیاتی طور پہ بہت کمزور ہے۔ وہ کبھی عدالت جا کے گواہی نہیں دے سکتی۔ اور اگر وہ بیان دے بھی دے تو میڈیا اس کو اتنے برس خاموش رہنے کی بہت بری سزا دے گا۔ وہ خبروں کا مرکز بن جائے گی۔ وہ اس سب کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ میری بیٹی ہے تالیہ اور....."

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جولیانہ میرے لیے گواہی دے۔ میں اتنی ظالم نہیں ہوں۔ لیکن آپ خاموش رہے۔ میرے سامنے۔ آپ نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟" وہ بے یقین تھی۔

"کیونکہ یہ ضروری نہیں تھا۔ جب اس نے گواہی ہی نہیں دینی تو اس کا کیا فائدہ ہوتا؟"

تالیہ نے دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ نے تالیہ کو بچانے کی کوشش کب کی ہے؟"

باہر بار بار بجلی چمکتی۔ سارا لان روشن ہو جاتا۔ اور پھر وہی اندھیرا چھا جاتا۔ روشنی کی زندگی بہت کم تھی۔

"اوہ.... تم واقعی ایسا سمجھتی ہو؟" فاتح کو اس کی بات سے جیسے دھکا سا لگا۔ "جب سلطان نے اس ننھے بچے کو مارا تھا تو کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ میں تمہیں بچاؤں؟ کیا میں نے تمہارے لیے چابی حاصل نہیں کی تھی؟"

"آپ نے وہ سب اپنے لیے کیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ نے یان سوفو سے کیا سودا کیا تھا۔"

فاتح نے افسوس سے اسے دیکھا۔ "تمہیں مجھ پہ بھروسہ ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا آپ کو مجھ پہ بھروسہ ہے؟ نہیں۔ آپ ہمیشہ میرے علم میں لائے بغیر فیصلے کر لیتے ہیں فاتح! میرے باپ سے سودا کرنا ہو یا یان سوفو سے.... آپ مجھے بتانا ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ آپ فیصلہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا اس کے مطابق خود کو بدلے۔ یان سوفو ٹھیک کہتی تھی۔ آپ خود غرض ہیں۔"

"کیا صرف میں ہوں جو ہر بات نہیں بتاتا؟ جب تم ایڈم کی دوا کے لیے اپنے باپ کے پاس واپس جانا چاہتی تھیں تو کیا تم نے مجھے بتایا تھا؟"

"اس بات سے آپ کا تعلق نہیں تھا۔ جولیانہ والی بات سے میرا تعلق تھا۔ آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ لیکن آپ مجھے کبھی نہیں بچائیں گے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔ "ایک میں کم عقل ہوں جو آپ کو اس عورت سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"تھینک یو۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔ میں دو دفعہ الیکشن جیتا ہوں اور تب میرے ساتھ تم نہیں تھیں۔"

بارش اتنی زور سے برس رہی تھی گویا پانی دیواریں توڑ کے اندر آ گھسے گا۔

وہ چند لمحے اسے غم اور غصے سے دیکھتی رہی۔ وہ بھی ایسی ہی شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی زندگی میں میری جگہ نہیں ہے۔ نہ

آپ کو میری ضرورت ہے۔"
"کیونکہ تمہارے لیے میں ہمیشہ ایک ایسا سیاست دان رہوں گا جو تمہاری پیٹھ پیچھے لوگوں سے سودے کر لیتا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ باہر برستی بارش کی آواز میں بادلوں کی گھن گرج بھی شامل ہو گئی تھی۔

"جب ایسا ہی کرنا تھا تو مجھے یہاں بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اچھا کیا۔ مجھے بلا لیا۔ میرے لیے فیصلہ آسان ہو گیا۔" وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں نے کہا تھا کہ آج کی شام کے اختتام پہ میں آپ کو اپنا جواب دے دوں گی۔ تو میرا جواب بھی سن لیں۔" وہ زخمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میری زندگی میں بھی 'فاتح' آپ کی اب جگہ نہیں رہی۔ ہمارے درمیان وقت آ چکا ہے۔"
یہ کہہ کے وہ اپنی سفید ہیلز پہ الٹی گھومی۔ دروازے کا ہینڈل گھما کے کھولا۔ پھر کچھ سوچ کے گردن موڑی۔
"میں آپ کو ڈائیورس پیپرز بذریعہ ڈاک نہیں بھیجوں گی۔ خود لے آؤں گی۔ سائن کر دیجیے گا۔"
"تم ایک دفعہ پھر حالات کا سامنا کرنے کے بجائے فرار اختیار کر رہی ہو۔ جیسے تم ہمیشہ کرتی ہو۔" وہ بھی اتنی ہی تلخی سے بولا۔ تالیہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ مگر اس نے ان کو رگڑ دیا۔

باہر سیڑھیوں کے قریب جولیانہ اور سکندر سر جوڑے کھڑے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کی اونچی آوازیں بارش کے شور میں بھی سن لی تھیں۔ تالیہ بیرونی دروازے کی طرف جاتے جاتے ان کے قریب رکی۔
"میں جانتی ہوں کہ تم سمجھتے ہو میں نے تمہاری ماں کا قتل کیا تھا۔" سکندر کو دیکھ کے وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولی۔ "میری طرف سے تم کیا بلکہ سارا ملک بھی یہ سمجھتا رہے تو تالیہ مراد کو فرق نہیں پڑتا۔

فائن بائے می۔"
سکندر لاجواب سا ہو گیا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر کہہ نہیں سکا۔ وہ پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اسے فرق نہیں پڑتا۔
"اور تم سمجھتی ہو کہ میں کوئی گولڈ ڈگر ہوں۔" اس نے اب کے سنجیدگی سے جولیانہ کو دیکھا۔ "جو تمہارے ڈیڈ کی زندگی میں داخل ہو کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ مگر بے فکر رہو۔ تمہارے ڈیڈ کے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جو میرے باپ کے پاس نہیں تھا۔ جانتی ہو میرے بابا کون تھے؟"
جولیانہ جو بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔ نفی میں سر ہلا کے رہ گئی۔
"میرے بابا اپنے ملک کے امیر ترین آدمیوں میں سے ایک تھے۔ اور جب وان فاتح اس اجنبی ملک میں گئے جہاں کوئی ان کو نہیں جانتا تھا تو وہ میرے بابا کے پاس ملازمت کرنے لگے۔" اس نے انگوٹھی والی انگلی اپنے سینے پہ دستک دی۔ "میرے بابا کے پاس۔ وان فاتح کو اس اجنبی ملک میں شناخت میرے بابا نے دی تھی۔"
"امریکہ میں؟" جولیانہ سانس روکے، آنکھیں تحیر سے پھیلائے اسے دیکھ رہی تھی۔
"اپنے ڈیڈ سے پوچھ لینا۔ وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کہا نا، تمہارے گھر میں ایسا کچھ نہیں ہے جو میں زندگی میں پہلے نہیں دیکھ چکی۔" یہ کہہ کے وہ آگے بڑھ گئی۔ اب وہ مزید ایک لمحہ اس گھر میں نہیں رک سکتی تھی، جس کے مکینوں کے دل میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ سارے فیصلے آسان ہو گئے تھے۔
"اس نے کہا..... ڈائیورس پیپرز۔" جولیانہ ابھی تک ہکا بکا تھی۔ ان دونوں نے اسٹڈی میں ہوتی لڑائی کا اختتام بہت واضح سنا تھا۔ "کیا ڈیڈ اور تالیہ نے شادی کر لی تھی؟"
"ایش نے کہا تھا ایسا کچھ ضرور ہو گا ان کے درمیان۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی تو فکر نہ کرو۔ وہ ختم

ہونے والا ہے۔" سکندر نے تسلی آمیز انداز میں گہری سانس لی۔

جولیانہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ تالیہ تو چلی گئی تھی لیکن ان کے گھر کا ماحول مکدر ہو چکا تھا۔

باہر بارش اسی طرح تڑاتڑ برسے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ایڈم بن محمد کے اپارٹمنٹ کی اونچی کھڑکیوں پہ بھی بارش کی بوندیں گر رہی تھیں۔ شہر کے اس حصے میں البتہ ان کی شدت ہلکی تھی۔ بادلوں کی گرج کی آواز بھی نہ آتی تھی۔ یہاں بارش قہر بن کے نازل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہ نرم پھوار کی صورت برس رہی تھی اور ایسے میں گرما گرم کافی کی مہک نے ماحول کو مزید خوب صورت بنا دیا تھا۔

"مجھے نہیں یاد میں نے آخری دفعہ کس کے لیے کافی بنائی تھی۔" اوپن کچن سے نکلتے ایڈم کے ہاتھ میں دو گرما گرم مگ تھے اور وہ مسکراتے ہوئے لاؤنج میں آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ایک مگ صوفے پہ بیٹھی داتن کو پکڑایا اور خود سامنے بیٹھا۔

"میں تو کافی بنانا بھول چکا تھا۔"

داتن نے ایک گھونٹ بھرا۔ پھر ماتھے پہ شکنیں ڈالیں۔ "ہاں۔ پتا چل رہا ہے۔"

ایڈم نے برا منائے بغیر ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور مسکرا کے گھونٹ بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔ "آپ کے بچے کیسے ہیں؟"

"ان کو پیسے بھیجتی رہتی ہوں۔ اس لیے خوش ہیں مجھ سے۔"

"اتنی تلخ نہ ہوں۔ ہم سب کسی نہ کسی رشتے کے معاملے میں قلاش ہوتے ہیں۔" وہ ہلکا پھلکا نظر آ رہا تھا۔ پھر سرسری سا پوچھا۔ "چے تالیہ سے ملیں آپ؟"

"ہاں۔ کل سے اس کے ایک واہمے کی تحقیق میں لگی ہوں۔" وہ برے منہ کے ساتھ ییشا والا قصہ بتانے لگی۔

"ییشا کے بارے میں کچھ منفی نہیں ملا؟" ایڈم حیران ہوا۔ "لیکن وہ تو کون آرٹسٹ تھی۔ کچھ تو ملنا چاہیے تھا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ واقعی فراڈ ہے؟"

ایڈم سوچ میں پڑ گیا۔ "مجھے چے تالیہ نے ایسا کہا تو کچھ دیر کے لیے میں بھی ان کی بات مان گیا۔ لیکن.... دو سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔" پھر وہ چونکا۔ "کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ چے تالیہ وہی دیکھ رہی ہیں جو وہ دیکھنا چاہتی ہیں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ یہ قبول نہیں کر پا رہی کہ فاتح کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔" پھر اس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بغور ایڈم کو دیکھا۔ "تم بتاؤ.... تمہاری زندگی کیسی جا رہی ہے؟"

"دیکھ نہیں رہیں؟ سب کچھ تو ہے میرے پاس۔ خوش ہوں۔ مزے میں ہوں۔"

داتن نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"میں بڑے فخر سے کہا کرتی تھی کہ ایڈم بن محمد ہمیشہ سچ بولتا ہے۔"

"آپ کی کہی اکثر باتیں سچ نہیں نکلتیں۔"

"نہیں بتایا تم نے اس کو؟" داتن کے سوال نے اسے چپ کرا دیا۔ لاؤنج میں سناٹا چھا گیا۔ بارش کی بوندوں کی ہلکی سی آواز بھی خاموش ہو گئی۔ یہ ایڈم کے اندر کا سناٹا تھا جو ایک دم سارے پہ چھا گیا تھا۔

"کوشش کی تھی۔ لیکن پھر ہم کئی سال کے لیے الگ ہو گئے اور اس بارے میں بات نہیں کر سکے۔"

"میں سمجھی تھی اب تک تم اپنے لیے لڑنا سیکھ چکے ہو گے۔ لیکن تم ایڈم.... تم اب بھی خود کو سیکنڈ بیسٹ سمجھتے ہو۔ اسی لیے تم اس کو کچھ نہیں بتا پاتے۔ کب نکلو گے اپنے احساس کمتری سے؟"

"اور اگر میرے بتانے سے وہ بھی ختم ہو گیا جو میرے اور چے تالیہ کے درمیان ہے؟ اگر ہمارے درمیان معاملات اتنے آکورڈ ہو گئے کہ ہم بات کرنے سے بھی رہ گئے تو؟"

"تو چھ سال تک سب ایسا ہی تھا۔ اس کے بغیر

مر تو نہیں گئے تم۔ ہٹے کٹے ہو۔ کما رہے ہو۔ کام کر رہے ہو۔" وہ جل کے بولی۔

"داتن۔" ایڈم نے مگ رکھا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ "سچ سچ بتائیں۔ اگر میں ان کو سب بتا دوں.... اور ان سے انتخاب کرنے کے لیے کہوں تو کیا وہ مجھے چنیں گی؟"

"نہیں۔" داتن سوگواریت سے بولی۔ "لیکن میری کہی اکثر باتیں سچ نہیں نکلتیں۔"

ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چہرہ بجھ گیا۔ "لیکن اگر انہوں نے مجھے نہیں چنا تو میں یہ بات ان سے کیوں کہوں؟"

"اگر وہ تمہارا انتخاب کر لے گی تو تمہیں محبت مل جائے گی۔ نہیں کرے گی تو کلوژر مل جائے گا۔ موو آن کرنے کے لیے کلوژر سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ اور پھر.... تمہارے پاس کھونے کو کیا ہے؟"

داتن کی بات پہ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے اندر کا سناٹا اب بولتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

حالم کا اپارٹمنٹ رات کے اس پہر خاموش پڑا تھا۔ عمارت کی بیرونی دیواروں پہ گرا بارش کا پانی اب تک سوکھ چکا تھا۔ کھڑکیوں پہ جمی ہوئی سفید لڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ طوفان خود رخصت ہو گیا تھا لیکن اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔

داتن اندر داخل ہوئی تو ایسی ویرانی تھی اس گھر میں کہ دل ہول جاتا۔ لیونگ روم کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ہوا اندر آ رہی تھی۔ بالکونی کی منڈیر پہ پرندے بیٹھے تھے۔ آہٹ پہ اڑ گئے۔ جانے کون سے پرندے تھے اور یہاں کیوں آئے تھے۔

داتن کچھ دیر اندھیرے لیونگ روم میں کھڑی رہی۔ ساری بتیاں بجھی تھیں۔ صرف نیچے سڑک سے آتی ٹریفک کی روشنی یا ارد گرد کی روشن عمارتوں کے باعث کمرے کے خدوخال نظر آتے تھے۔

سفید ساڑھی والی تالیہ بڑے صوفے سے کمر ٹکائے فرش پہ بیٹھی تھی۔ بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے، وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ ڈھیلے جوڑے سے الجھی الجھی لٹیں باہر نکل رہی تھیں۔ داتن کی نظریں اس کی سفید ہیلز تک گئیں جو مخالف سمتوں میں اتار کے پھینکی گئی تھیں۔ زیورات میز پہ لاوارث پڑے تھے۔ وہ خود کو ہیروں کی قید سے آزاد کیے اداس بیٹھی تھی۔

"میں سمجھی تھی کہ ایک زمانہ گزر چکا ہے۔" داتن سوگواریت سے بولی۔ "اب میں حالم کے گھر میں داخل ہوں گی تو منظر مختلف ہو گا۔ نیا گھر۔ نئی زندگی۔ لیکن پرانی تالیہ...."

تالیہ نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"تالیہ کبھی کسی کی نظر میں معتبر نہیں ہو گی۔"

"اور پرانے مسئلے۔" داتن نے فقرہ مکمل کیا اور اپنا پرس میز پہ رکھا۔ خود صوفے پہ آ بیٹھی۔ تالیہ کے بالکل ساتھ۔ پھر ترحم سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "میں نے کہا تھا نا۔ موسم کے تیور اچھے نہیں ہیں۔"

"اس گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" وہ گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے بھیگی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہوا کیا تھا؟"

"ان کے بیٹے نے مجھے میرا ماضی یاد کرایا۔ بیٹی نے چند لمحے تک مجھے پسند کیا لیکن جیسے ہی میں نے ان کو ان کے گھر میں سجی نقلی پینٹنگ کی حقیقت بتانی چاہی، وہ سب میرے خلاف اکٹھے ہو گئے۔"

"اور فاتح سے جھگڑا کیوں ہوا؟"

"اب تو یاد بھی نہیں کہ کس بات پہ جھگڑا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ان کے پاس میرے لیے کوئی مقام نہیں ہے۔"

کھلی کھڑکیوں سے آتی ٹھنڈی ہوا سے زمین پہ گرا اس کی ساڑھی کا سفید پلو پھڑپھڑانے لگا۔ داتن کی نظریں اس کی ساڑھی پہ پھسلیں۔

"اور تمہارا دل ٹوٹ گیا؟ کیونکہ تم فاتح کو بچا نہیں سکیں۔ تم اچھی تالیہ ہو اب۔ اور تمہاری ذمہ داری ہے سب کی زندگی بچانا۔ تمہارا دل ٹوٹنا ہی تھا۔"

''تو پھر میں اور کیا کرتی' داتن؟'' وہ رندھی آواز میں کہتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ ''میں کیسے اپنے سفید گھوڑے پہ دھبہ لگنے دے سکتی تھی؟''

''سفید گھوڑا؟''

''کیا تم کتابیں نہیں پڑھتیں' داتن؟ کتابوں میں لوگوں کو ان کا خوش گوار انجام صرف تب ملتا ہے جب سفید گھوڑے والا شہزادہ آتا ہے اور سب کو بچا لیتا ہے۔ تالیہ وہی سیویر ہے.... اسے اپنی کہانی کے کرداروں کے دل بھی جیتنے تھے اور انہیں بچانا بھی تھا۔ لیکن تالیہ کا گھوڑا داغ دار ہو گیا کیونکہ وہ ایسا نہیں کر سکی۔ سفید گھوڑے والوں کا ماضی داغ دار نہیں ہونا چاہیے نہ ان کی زبان سے تلخ انکشاف ہونے چاہیے ہیں۔''

''یعنی کہ پرنس چارمنگ۔'' داتن نے گہری سانس لی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''لیکن کیا میں تمہیں حقیقت بتاؤں تالیہ؟''

''ہوں؟'' تالیہ نے بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

''ہماری دنیا میں سفید گھوڑے نہیں ہوتے۔''

اس کی آواز ٹھنڈے گھر کی دیواروں سے پلٹ پلٹ کے سنائی دی۔

تالیہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور گال پہ لڑھک گیا۔

''سنا تم نے؟ اس دنیا میں کسی کا گھوڑا سفید نہیں ہے۔ اور تم سفید گھوڑے والی شہزادی نہیں ہو جو سب کو بچا لے گی تو اس کو اس کی ہیپی اینڈنگ مل جائے گی۔ تمہیں کسی کے اپروول کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ فاتح کے' نہ اس کے بچوں کے۔ تم اپنے اصل سے نہ بھاگو۔''

''یعنی میں اپنی پرانی زندگی کی طرف چلی جاؤں؟''

''میں یہ نہیں کہہ رہی۔ تم نے جرائم چھوڑ دیے۔ جھوٹ چھوڑ دیے۔ اچھا کیا۔ ہر ایک ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن تالیہ اپنا آپ نہیں چھوڑ سکتی۔ اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔''

''اور تالیہ کون ہے؟'' ٹھنڈی ہوا بار بار اس کے چہرے پہ بال بکھیر دیتی لیکن تالیہ ان کو پیچھے نہیں ہٹا رہی تھی۔

''تالیہ ایک معتبر لڑکی ہے۔ اپنی نظروں میں معتبر لڑکی۔'' داتن نے نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے۔ ''صرف ایک شخص ہے جسے تالیہ کو معاف کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہے خود تالیہ مراد۔ تم نے صرف خود کو معاف کرنا ہے اور تمہیں تمہاری ہیپی اینڈنگ مل جائے گی' تالیہ۔''

''کیا میں اپنی کہانی کا white knight نہیں ہوں' داتن؟''

''ہم سب اپنے اپنے وائٹ نائٹ خود ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں صرف اپنا ہی وائٹ نائٹ بننا چاہیے۔ تمہیں ساری دنیا کو بچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں ساری دنیا کی نظروں میں ہیرو بننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''اگر مجھے فاتح کے ساتھ رہنا ہے تو کیا مجھے ان سے جڑے لوگوں کی محبت نہیں چاہیے؟'' وہ کسی بچے کی طرح سوال کر رہی تھی۔

''نہیں' تالیہ۔ تمہیں صرف فاتح کی محبت چاہیے۔ تمہیں خود کو معاف کر کے اپنی زندگی بنانی ہے۔ تم فاتح کو نہیں چھوڑ سکتیں صرف اس لیے کہ اس کے بچے تمہیں پسند نہیں کرتے۔''

''بہت سی باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ صرف ایک یہ بات نہیں ہے۔'' تالیہ نے آنکھیں موند لیں۔ کرب سا کرب تھا جو اندر باہر چھایا تھا۔ ''میں کیا کروں؟''

''فاتح کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے کہ میں ہمیشہ فرار اختیار کرتی ہوں۔''

''کیا درست کہتا ہے؟''

''شاید۔ میں ہمیشہ فرار ہی تو اختیار کرتی ہوں۔ گھائل غزال کی حقیقت نہیں بتائی ان کو۔ فاتح

کی یادداشت کھونے پہ خاموشی سے ایک عرصہ ان کی اسٹافر بنی رہی۔ ان کو بتائے بغیر ایڈم کے ساتھ قدیم ملاکہ جارہی تھی میں۔"

"اور کیا تمہیں تمہاری ہیپی اینڈنگ مل گئی؟"

تالیہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اگر تم وہی غلط انتخابات کرتی رہو گی، تو تمہیں کبھی تمہاری ہیپی اینڈنگ نہیں ملے گی۔ ہیپی اینڈنگ درست فیصلے کرنے والوں کو ملا کرتی ہے۔ تم نے اب نہیں بچانا فاتح کو یا کسی اور کو۔ اب تم صرف خود کو بچاؤ گی۔ اب تم خود کو معاف کرنا سیکھو گی۔ تم کسی دوسرے کا گلٹ نہیں اٹھاؤ گی۔ تم صرف اپنی ہیرو ہو۔"

"اور اس سب سے کیا ہوگا؟ فاتح کو تو میں کھو چکی ہوں۔"

"کیا تم اس کو دوبارہ نہیں حاصل کر سکتیں؟ کیا تم اپنا جھگڑا نہیں چھوڑ سکتیں؟"

تالیہ نے آنکھیں رگڑیں اور تعجب سے اسے دیکھا۔

"کل تم کہہ رہی تھیں کہ میں ان کو چھوڑ دوں۔"

"تب میں نے تمہیں سفید ساڑھی میں اس لٹے پٹے حال میں نہیں دیکھا تھا۔ میں غلط تھی تالیہ۔ تمہیں اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ گزارنی چاہیے جو تم سے محبت کرے اور تم اس سے محبت کرو۔"

"نہیں، داتن۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" اس نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچی۔ "میں وان فاتح سے علیحدہ ہو رہی ہوں۔"

داتن چند لمحے ملال سے اسے دیکھتی رہی۔

"او کے۔ پھر تم خود کو معاف کر کے آگے بڑھو۔ اور دنیا کو دکھاؤ کہ تمہیں اپنے آپ پہ کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ تم وہ کام چھوڑ چکی ہو۔ اپنا آپ نہیں چھوڑ سکتیں۔ تم اپنی نظروں میں معتبر ہو۔ کیونکہ...."

"کیونکہ سفید گھوڑے ہماری دنیا میں نہیں ہوتے۔" وہ بڑبڑائی۔

"کیونکہ سفید گھوڑے ہماری دنیا میں نہیں ہوتے۔" داتن نے دہرایا۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر انگلیوں سے آنکھیں دوبارہ ملیں۔ اس کی آنکھیں بہتے کاجل سے سیاہ ہو چکی تھیں لیکن منظر اب کافی حد تک واضح تھا۔

"میں سفید گھوڑے کا بوجھ اپنے کندھوں پہ نہیں اٹھاؤں گی۔ مجھے خود کو اس بوجھ سے ہلکا کرنا ہے۔" وہ خود سے کہہ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کی ساڑھی کا پلو ہنوز پھڑپھڑا رہا تھا۔

☆☆☆

رات گزر رہی تھی اور سب کے لیے ہی گزر رہی تھی۔ رات سب کے لیے رات ہی تھی۔ سب کے لیے سیاہ اور تکلیف دہ تھی۔

تالیہ اب اپنے بیڈروم میں تھی۔ بیڈ پہ چت لیٹے وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔

موبائل بجا تو اس نے فون اٹھا کے دیکھا۔ اسکرین دھندلی تھی۔ اس نے آنکھوں کو رگڑا اور میسج کھولا۔

ایڈم کا پیغام آیا تھا۔

"ہم نے سرمد کو ٹریس کر لیا ہے۔ وان فاتح نے ہماری بہت مدد کی۔ ان کو میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ کل کے دن میں نے انہیں بہت تنگ کیا لیکن وہ میری ہر ای میل کا جواب دیتے رہے۔ ان کے تعاون کے بغیر ہم سرمد کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔"

اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ اور وہ کہتی تھی وہ اس کو بچانے نہیں آتا۔

وہ اس کے پیچھے قدیم ملاکہ بھی آیا تھا۔ وہ اس کے لیے کب نہیں آتا تھا؟ لیکن اب یہ باتیں بے معنی ہو گئی تھیں......

☆☆☆

وہ اسٹڈی میں بیٹھا فائلز دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں

پہ چشمہ چڑھا تھا اور ماتھے کے بل برقرار تھے۔

"وہ ٹھیک کہہ رہی تھی' ڈیڈ۔" آواز پہ فاتح نے سر اٹھایا۔ سفید فراک والی بچی کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے بالوں کو سفید ہیئر بینڈ میں جکڑ رکھا تھا اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ غلط کہہ رہی تھی۔" وہ ناپسندیدگی سے بڑبڑایا۔

"آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کو بچا لیں گے۔ اس کیس سے اس کو نکال لیں گے بس وہ قدیم ملاکہ سے واپس آپ کے ساتھ آجائے۔ لیکن آپ نے اس سے اس کے کیس کی ایک اہم بات چھپالی۔"

"چھپانے اور نہ بتانے میں فرق ہوتا ہے۔ میں جولیانہ کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ اور تالیہ اپنے آپ کو اس مشکل سے نکال سکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ اس سے نکل آئے گی۔"

"اگر اس نے خود کو خود ہی نکالنا تھا تو آپ نے اسے بچانے کا دعویٰ کیوں کیا تھا؟"

فاتح نے عینک اتاری اور فائل بند کی۔ اب یہ ساری باتیں بے معنی ہو گئی تھیں۔

آج کی شام سے واپسی ممکن نہیں تھی۔

رات گزر رہی تھی اور سب کے لیے گزر رہی تھی۔

رات سب کے لیے رات ہی تھی۔

☆☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ صبح گزشتہ شب کی بارش کی تازگی لیے اتری۔

لان اور پودے نہا دھو کے پہلے سے زیادہ سرسبز لگ رہے تھے۔ رات شاید کوئی بھی ٹھیک سے نہیں سویا تھا۔ اور صبح بھی ناشتہ کیے بغیر وہ تینوں گھر کے اندرونی صحن کے برآمدے کے زینوں پہ بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کمرے تھے اور درمیان میں چوکور سا صحن تھا۔ اوپر چھت کھلی تھی۔

صبح دوبارہ بارش ہوئی تھی اور صحن کا فرش گیلا گیلا سا تھا۔ فاتح نے یہ گھر اسی صحن کی وجہ سے منتخب کیا تھا کہ یہ اس کو ملاکہ والے سن باؤ کے گھر کی یاد دلاتا تھا۔

وہ تینوں اوپر نیچے زینوں پہ بیٹھے تھے۔ جولیانہ کا سر ادا سی سے جھکا تھا اور سکندر دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا' ڈیڈ؟"

"کیونکہ وہ یہاں نہیں تھی' سکندر۔ بہت ساری باتیں اسی لیے ہو رہی ہیں کیونکہ تالیہ یہاں نہیں تھی۔"

وہ ایک گملے پہ لگا پتا توڑ کر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولیانہ نے ہاتھ بڑھایا اور پتا توڑ کے اسے تھما دیا۔ فاتح عادتاً اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا۔

"آپ نے اس سے شادی کیوں کی؟ میں آپ کو جج نہیں کر رہا۔ صرف پوچھ رہا ہوں۔" سکندر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ رات کی نسبت اب وہ تینوں قدرے نارمل تھے۔

"اس کا باپ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر رہا تھا جو دولت مند تھا اور طاقت ور بھی لیکن وہ تالیہ کے لیے سونے کا دوزخ تھا۔ میں نے یہ صرف اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے کیا تھا۔ آئی ایم سوری میں تم لوگوں کو نہیں بتا سکا۔ لیکن شروع میں ہم نے اسے ایک پیپر میرج کے طور پہ جلد ختم کر دینا تھا۔"

"تو آپ نے اسے ختم کیوں نہیں کیا؟" جولیانہ نے سر اٹھا کے امید سے اسے دیکھا۔

"میں نہیں کر سکا۔ پھر دوسرے مسئلوں میں گھر کر میں تالیہ کو بھول گیا۔" وہ سر جھکائے دکھ سے کہتے ہوئے پتے کو توڑ توڑ کے نیچے گرا رہا تھا۔ "جب یاد آیا تو حالات ایسے ہو گئے کہ اس کو چھوڑنا اس وقت تک ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور جب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آیا کہ ہم نے ساتھ رہنا ہے یا نہیں' تب وہ غائب ہو گئی۔ چھ سال کے لیے۔"

"اور اب... ڈیڈ؟" جولیانہ نے امید سے پوچھا۔ "اب آپ ساتھ رہیں گے یا نہیں؟"

"کیا کل رات کے بعد بھی اس سوال کی گنجائش ہے؟" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ گیلے صحن میں اداس سی خاموشی چھا گئی۔ جولیانہ کھنکھاری۔

"کیا آپ واقعی اس کے والد کے ملازم تھے؟"

"ہوں؟" فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ پتا توڑتا ہاتھ رک گیا۔

"کل جاتے وقت تالیہ نے ہمیں کہا کہ اس کے بابا ایک بہت امیر آدمی تھے اور ایک اجنبی ملک میں انہوں نے آپ کو اپنے پاس ملازمت دی تھی۔ کیا ایسا ہی ہوا تھا ڈیڈ؟"

وان فاتح کے لبوں پہ اداس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے پتا گملے کی طرف اچھالا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ غلط نہیں کہہ رہی۔" اسے آگے بڑھتے دیکھ کے سکندر نے جلدی سے پکارا۔

"ڈیڈ۔" فاتح پلٹ کے اسے دیکھنے لگا۔ "اگر وہ پیپرز لائی تو آپ ان پہ دستخط کر دیں گے؟"

وان فاتح کے چہرے پہ ایک وقت میں کئی تاثرات آ کے گزر گئے۔

"اگر وہ لائی تو ہاں۔" اس نے قطعیت سے کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ سارے سوالات کی گنجائش ختم ہو گئی۔

سکندر نے گہری سانس لی اور زیر لب بڑبڑایا۔ (شکر)

فاتح اندر آیا اور آفس کے لیے تیار ہونے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو راہداری سے ییشا نکل کے آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کے کھنکھاری۔

"داتو سری۔" ساتھ ہی لاؤنج کی میز انگلی سے بجائی۔

وہ اس طرف متوجہ ہوا تو ییشا مسکرائی۔ البتہ اس کا چہرہ اداس اور کملایا ہوا لگتا تھا۔

"مجھے آپ کی اجازت چاہیے تھی۔ میں اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ اس کے گھر شفٹ ہو رہی ہوں۔"

فاتح نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "اور آپ کا ایکس ہزبینڈ؟ کیا وہ جگہ اس سے محفوظ رہے گی؟"

"میری فرینڈ کا فارم ہاؤس شہر سے دور ہے۔ مجھے لگتا ہے میں وہاں محفوظ رہوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنا عرصہ مجھے اپنے گھر میں رکھا۔"

"آپ یہ سب تالیہ کی باتوں کی وجہ سے کہہ رہی ہیں۔" فاتح نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"میں نہیں چاہتی میری وجہ سے کوئی پیچیدگی ہو۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ "میں پہلے ہی بہت سے مسائل کا شکار ہوں۔ مجھے مزید ایک مسئلہ نہیں چاہیے۔"

"ییشا پلیز..." وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "تالیہ اس وقت ایک مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ وہ تھوڑی سی پیرانائڈ ہے۔ اسے ہر شخص اپنا دشمن لگتا ہے۔ میں اس کی طرف سے معذرت خواہ ہوں۔ مگر آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ آپ یہیں رہیں۔ میں اس مسئلے کو حل کر لوں گا۔"

"مگر...."

"ییشا.... آپ کو اجازت چاہیے تھی۔ میں نہیں دے رہا۔ آپ کے جانے سے جولی بہت ڈسٹرب ہو جائے گی۔ اگر آپ کو جانا ہی ہے تو تھوڑے دن رک جائیں۔ پھر آپ بے شک چلی جایئے گا لیکن اس طرح نہیں۔" فاتح نے مسکرا کے ہدایت دی تو ییشا مسکرا دی۔ اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر آیا اور دروازہ بند کیا۔ پھر سوچتے ہوئے موبائل پہ کال ملائی۔

"میں نے رات تمہیں کہا تھا کہ مجھے ییشا تاج کی سیکیورٹی کلیئرنس دوبارہ کر کے دو۔ کیا تم نے کی؟"

”جی سر۔ میں نے تمام سرکاری ذرائع استعمال کر کے چیک کیا ہے۔“

”اور؟“ فاتح نے بے چینی سے پوچھا۔

”سر مجھے اس کے بارے میں کوئی قابل گرفت بات معلوم نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے گھر کے قریب رہنے والے لوگوں سے بھی معلوم کیا ہے۔ وہ واقعی وہی ہے جو وہ خود کو کہہ رہی ہے ایک فوٹوگرافر اور ٹیچر۔ اس کے اسٹوڈنٹس کے والدین تک اس کے اچھے کردار کی گواہی دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس کا شناختی کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس' پاسپورٹ.... سب گورنمنٹ کا ایشو کردہ ہے۔ کرمنل تو دور کی بات اس کو آج تک پارکنگ ٹکٹ نہیں ملا۔ سوری لیکن آپ کے دوست کا شک بالکل بے بنیاد ہے۔“

فاتح نے افسوس سے آنکھیں بند کیں اور سر جھٹکا۔ ”اوہ تالیہ.... تمہارا paranoia ....“

وہ سمجھ سکتا تھا کہ تالیہ اس دھوکے میں کیوں ہے کہ ییشا فاتح کو نقصان پہنچائے گی۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی مسئلہ تھا جس میں ایک شخص کو دوسرے کے saviour کا کردار ادا کرنے کی اتنی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ایسے حالات ڈھونڈنے لگتا ہے جن میں اسے دوسرے کو بچانا پڑے۔ اسے یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ دوسرے شخص کو اس کی مدد اور حفاظت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

آج سارا شہر گیلا گیلا سا تھا۔ سورج بھی اتنے پانی کے باعث ناراض سا ہو گیا اور ٹھیک سے نہیں نکلا۔ مگر بادل تھے کہ برس برس کے تھکتے نہیں تھے۔ اپنی ساری سیاہی سمیت وہ آسمان پہ فخر سے پھیلے بوندیں برسائے جاتے تھے۔

ایسے میں ایک کافی شاپ کی شیشے کی دیوار پہ بوندیں ٹھہری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ روسٹ ہوئے کافی بینز کی مہک ساری شاپ میں پھیلی تھی۔ کچھ آفس کے لیے تیار لوگ تیزی سے کافی مگ پکڑتے باہر نکل رہے تھے۔ کچھ لوگ میزوں پہ بیٹھے گرم کافی یا ہاٹ چاکلیٹ کے ساتھ ڈونٹ کھاتے ہوئے موبائل پہ لگے تھے۔

ایسے میں ایک کھڑکی کے ساتھ وہ بیٹھی تھی۔ اس نے میز پہ رکھے مگ کے گرم ہینڈل کو پکڑ رکھا تھا اور شیشے سے باہر گیلی سڑک کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ سن رہی ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ سامنے بیٹھے ایڈم نے میز پہ دستک دی تو تالیہ چونکی اور اس کی طرف چہرہ موڑا۔

اس نے مانگ نکال کے بالوں کی پونی باندھی ہوئی تھی۔ لباس سیاہ تھا۔ اتنا سیاہ جیسے کسی کے جنازے پہ آئی ہو۔ لیکن گردن میں گرہ لگا مفلر سرخ تھا۔ ایڈم دیکھ سکتا تھا کہ وہ ڈسٹرب تھی۔ وہ اتنی دیر سے اس کو سرمد کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”میں نے فاتح کو ییشا کی حقیقت بتانی چاہی۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ”لیکن انہوں نے یقین نہیں کیا۔ صبح انہوں نے مجھے ایک میسج بھی بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ان کی سیکیورٹی ٹیم نے ییشا کو پھر سے چیک کیا ہے۔ وہ بالکل کلیئر ہے۔“

”چے تالیہ.....“

”مگر ظاہر ہے یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ ییشا کون و دمن ہے۔ اور اس کو ذوالکفلی نے ہی بھیجا ہے۔“

”چے تالیہ.....“ وہ کھنکھارا۔ ”کیا معلوم آپ غلط ہوں؟“

”تم بھی مجھے unstable اور پیرانائڈ سمجھتے ہو؟“ اس نے بھنویں بھینچ کے اسے دیکھا۔ ”داتن بھی یہی سمجھتی ہے۔“

”نہیں۔ لیکن آپ کے لیے وہ چھ سال نہیں گزرے جو ہمارے لیے گزر چکے ہیں۔ میں.... فاتح صاحب... داتن.... ہم سب اپنی زندگی میں

اسٹیبل ہو گئے ہیں۔ لیکن چھ سال پہلے جب ہم تازہ تازہ اس سب سے نکلے تھے تو ہم آپ سے زیادہ ان اسٹیبل تھے' پیرانائیڈ تھے۔ اسی لیے تو وان فاتح نے سیاست چھوڑ دی تھی اور میں نے یادداشت کھونے کا بہانہ کیا تھا۔ ہمیں نارمل ہونے میں ایک لمبا عرصہ لگا تھا۔ آپ کو بھی لگے گا۔ اس لیے ضروری نہیں ہے کہ ییشا کوئی کون آرٹسٹ ہو۔"

"تو پھر وہ میری طرح کیوں لگتی ہے؟"

"کیونکہ یوں سمجھیں کہ.... ان کے کمفرٹ زون میں ایک ہی طرح کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں آپ کی جگہ ہے۔ اسی لیے اتفاق سے انہوں نے صرف ایسی عورت کو زندگی میں جگہ دی جو کسی طرح تالیہ سے ملتی جلتی تھی۔ ہر شخص کون آرٹسٹ نہیں ہوتا' چے تالیہ۔ آپ نے کہا تو میں بھی ایسے ہی سوچنے لگ گیا۔ لیکن اب میرا نہیں خیال کہ وہ ایسی ہوگی۔ اس کے سارے کاغذات اصلی ہیں۔"

"کیونکہ وہ بہت اچھی کون وومن ہے۔ اس نے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا ہے۔" تالیہ نے ہٹ دھرمی سے شانے اچکائے۔ ایڈم نے گہری سانس لی۔

"اگر آپ یہ بات بار بار کہتی رہیں تو وان فاتح کو لگے گا کہ آپ جیلیس ہو رہی ہیں۔"

"میں اور جیلیس؟ ہونہہ۔" وہ تلخی سے سر جھٹک کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایڈم کھنکھارا۔

"او کے.... جب آپ ملاکہ میں تھیں تو میں نے کہا تھا کہ مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

"تم مجھے ایک ڈاکیومنٹ بنا دو گے ایڈم؟" وہ تھکے تھکے انداز میں باہر دیکھتے ہوئے بولی تو وہ چونک گیا۔

"کیسا ڈاکیومنٹ؟"

"میں فاتح سے الگ ہو رہی ہوں۔ مجھے تحلیل نکاح کے کاغذات بنوانے ہیں۔"

وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا۔ "میں وکیل نہیں ہوں۔"

"ہماری شادی اس دنیا میں رجسٹرڈ نہیں تھی اس لیے نوٹرائزڈ ڈاکیومنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک کاغذ پہ چند سطور پرنٹ کر دو۔ میں فاتح سے دستخط کروا لوں گی۔"

"چند سطور تو آپ خود بھی لکھ سکتی ہیں۔"

تالیہ نے چہرہ اس کی طرف موڑا تو اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ "مجھ سے نہیں ہو گا.... ایڈم۔"

اور یہ وہ لمحہ تھا جب برسوں بعد ایڈم بن محمد کا دل ایک دفعہ پھر سے خالی ہو گیا۔ وہ چند لمحے بس اسے دیکھتا رہا۔ دکھ سے۔ یاسیت سے۔ ملال سے۔

"سوری میں نے تمہاری بات کاٹ دی۔ تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟" اس نے ابرو اٹھا کے پوچھا۔

ایڈم نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ سارے فیصلے ایک پل میں ہو گئے تھے۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

تالیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مگ کے گرم ہینڈل پہ تھا۔ وہ اتنا گرم تھا کہ نہ اس کے لمس سے ٹھنڈا ہو رہا تھا نہ باہر برستی بارش سے۔

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ میں آپ کو جانتا ہوں.... چے تالیہ۔ آپ کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آپ ناخوش ہیں۔"

"میں ناخوش نہیں ہوں۔ بس فیصلہ کر چکی ہوں۔ فاتح اور میں...." اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم ناممکن ہیں۔ ہم کبھی ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔"

"اس فیصلے کو کچھ وقت دیں۔ شاید چیزیں ٹھیک ہو جائیں۔" وہ دکھی دل سے کہہ رہا تھا۔

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا.... ایڈم.... میں بس ان کی دنیا سے دور جانا چاہتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔ "ڈونٹ ٹیل می کہ آپ قدیم ملاکہ جانے کا سوچ رہی

ہیں۔"

"نہیں... یا اللہ... کبھی نہیں..." تالیہ نے جھرجھری لی۔ "میں بس اس ملک سے دور جانا چاہتی ہوں۔ عدالت مجھے بری کردے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کسی اور ملک' کسی اور شہر میں اپنا گھر بناؤں گی۔ نئے دوست بناؤں گی۔ کوئی نیا کام شروع کروں گی۔ وہاں کوئی میرا ماضی نہیں جانتا ہوگا۔ کوئی مجھے نفسیاتی مریض یا مجرم نہیں کہے گا۔ میری ساری زندگی ہی نئی ہوجائے گی۔"

"مگر دل تو وہی پرانا ہوگا۔" وہ زخمی سا مسکرایا۔

"دل پہ تالیہ کا اختیار نہیں ہے' ایڈم۔ پلانز پہ ہے۔ اب یہی پلان اے' بی اور سی ہے۔"

"میں یہ کر چکا ہوں۔ ملکوں ملکوں پھر چکا ہوں۔ نئے دوست بنا چکا ہوں۔ ماضی سے پیچھا بھی چھڑا چکا ہوں۔ مگر میں آپ کو حقیقت بتاؤں' شہزادی؟" وہ میز پہ آگے کو جھکا اور مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ طریقہ کام نہیں کرتا۔ انسان جہاں بھی چلا جائے... اگر وہ اندر سے خوش نہیں ہے.... اگر اس کا دل محبت سے خالی ہے... تو باہر کا منظر بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ قدموں کے نیچے جیسی بھی زمین ہو' اس کا آسمان وہی رہتا ہے۔"

"تم مجھے پیپرز بنا دو گے؟" وہ آہستہ سے بولی۔ ایڈم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوکے۔" پھر بات بدل کر بولا۔ "دو دن بعد کورٹ میں پیشی ہے۔ آج رات آپ کو سرمد سے ملنے جانا ہے۔ کیا آپ اسے ہینڈل کرلیں گی؟"

"کرلوں گی۔" تالیہ نے مگ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگایا۔ اس کا ہینڈل اب تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

"بے تالیہ.... آپ کو یقین ہے کہ سرمد آپ کی مرضی کی گواہی دے گا؟"

"میرے پاس ایک ہی گواہ بچا ہے' ایڈم۔ اور میں اس سے اپنی مرضی کا بیان ضرور دلواؤں گی۔" وہ اب کافی پیتے ہوئے شیشے کی دیوار کے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرد سی آگ جل رہی تھی۔ اسے اب صرف خود کو بچانا تھا۔

☆☆☆

سرمد ایک درمیانے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ عمر چالیس سے اوپر تھی اور آنکھوں پہ نظر کا چشمہ لگاتا تھا۔ یہ چشمہ اس رات اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا اور وہ خود لحاف اوڑھے سو رہا تھا جب دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

سرمد ہڑبڑا کے اٹھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے وال کلاک کو دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے موبائل اٹھایا اور اسکرین روشن کی۔ کوئی کال نہیں تھی۔ یعنی آنے والا اس کا کوئی شناسا نہ تھا۔

دروازہ ہنوز دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

وہ عینک لگاتا' سلیپرز پیروں میں اڑستا باہر آیا۔ چھوٹے سے گھر کی راہداری عبور کی۔ دروازے تک آیا اور باہر جھانکا۔ وہاں گھنگھریالے بالوں والی ایک عورت کھڑی تھی۔ ماتھے پہ بل ڈالے وہ دروازہ کھٹکھٹائے جا رہی تھی۔

سرمد نے پٹ کھولا اور گردن نکال کے باہر جھانکا۔ "جی؟"

"کیا ہم اندر بیٹھ کے بات کرسکتے ہیں؟" وہ بنا کسی تمہید کے بولی۔

"میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کو کس سلسلے میں بات کرنی ہے؟"

"تم اس کی اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟ ہم اس سے بات کیے بغیر تھوڑی جائیں گے۔" دیوار کی اوٹ سے ایک لڑکی نکلی۔ اس نے سیاہ ٹراؤزر شرٹ پہ سیاہ ہڈی پہن رکھی تھی۔ ہڈ نے سر ڈھک رکھا تھا لیکن چہرہ واضح تھا۔ اسے دیکھ کے سرمد شل رہ گیا۔ لیکن وہ... وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے آئی' اور جوگر کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔

"ہٹو سامنے سے۔"

"آپ کون ہیں اور یوں میرے گھر میں کیوں

چلی آ رہی ہیں؟'' سرمد نے بظاہر جی کڑا کر کے کہا۔ مگر وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو چکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے اندر لپکا۔

وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑی گردن گھما گھما کے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

''آپ کون ہیں؟ دیکھیں... میں پولیس کو کال کر سکتا ہوں۔'' تالیہ نے چہرہ موڑ کے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

''تم میری توقع سے چھوٹے اور کمزور ہو۔''

''مجھے بات کرنے دو۔'' داتن دبی آواز میں بولی اور سامنے آئی۔

''دیکھیں سرمد صاحب... ہم دونوں جانتے ہیں کہ عصرہ محمود کے لیے آپ کیا کرتے تھے۔''

داتن نے ساتھ ہی ایک کرسی اس کے لیے رکھی۔ وہ تالیہ کو گھورتے ہوئے وہاں بیٹھ گیا جواب ٹی وی کیبنٹ سے ٹیک لگائے کھڑی' جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں عصرہ کے والد کا ملازم تھا مگر میں ان سے کئی سال نہیں ملا۔''

''سرمد...'' داتن نے ضبط کیا۔ ''میرے پاس گواہ ہیں جو گواہی دیں گے کہ آپ عصرہ کے ساتھ جیولری شاپ پہ ایک سیٹ کی قیمت لگوانے گئے تھے۔''

''کیا یہ جرم ہے؟'' وہ بگڑ کے بولا۔

''جس کام کے بدلے انہوں نے یہ سیٹ دیا' وہ جرم تھا۔''

''انہوں نے مجھے کوئی سیٹ نہیں دیا۔'' وہ ماتھے پہ بل ڈالے بولا۔

''دیکھیں سرمد...'' داتن نے پھر سے کوشش کی۔ ''انہوں نے آپ سے آرسینک منگوایا تھا۔ آپ صرف عدالت میں یہ بتا دیں تو تالیہ بری ہو جائے گی۔ کسی کو آرسینک لا کے دینا جرم نہیں ہے۔''

''لیکن میرا کریڈٹ کارڈ ہیک کر کے میرے نام سے کیک آرڈر کرنا جرم ہے۔'' تالیہ تڑخ کے بولی تو سرمد نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ داتن نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا مگر وہ سرمد کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ پولیس نہیں ہیں۔ نہ آپ مجھے گرفتار کروا سکتی ہیں۔ مجھے اپنے رائٹس معلوم ہیں۔ میں کوئی گواہی نہیں دوں گا۔ آپ کیا کر لیں گی میرا؟''

اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا جب وہ کسی چیل کی طرح اس پہ جھپٹی' اسے گدی سے پکڑ کے اس کا چہرہ زبردستی جھکا کے میز سے لگایا اور اس پہ جھکی۔ ہکا بکا سی داتن اسے روکتی رہ گئی لیکن تالیہ، سرمد کے کان کے پاس جھک کے غرا رہی تھی۔

''تم نے اپنی مالکن کے ساتھ مل کر میری زندگی تباہ کر دی۔ میری آزادی چھین لی۔ اور تم مجھ سے پوچھتے ہو میں تمہارا کیا کروں گی؟''

''تالیہ... پلیز مجھے بات کرنے دو۔''

''میں اس سے بات کرنے نہیں آئی۔'' وہ سرمد کا گال میز سے لگائے اس کی گردن دبوچے کہہ رہی تھی۔

سرمد کا سانس گھٹنے لگا۔ اس نے ہاتھوں سے مزاحمت کرنی چاہی لیکن تالیہ نے اس کی کلائی مروڑ کے کمر سے لگا دی۔ وہ بے بس ہو کے رہ گیا۔

''میں پولیس نہیں ہوں۔ پولیس تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔ میں پولیس سے زیادہ بری ہوں' سرمد۔ اب میری بات غور سے سنو۔ پرسوں صبح تم عدالت میں پیش ہو گے اور تم میرے حق میں گواہی دو گے۔'' وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ ''ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ اتنی مہارت سے کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم مجھے نہیں جانتے سرمد۔ میں اپنی برداشت کی انتہا پہ ہوں۔''

اس کی گردن مزید قوت سے نیچے جھکائی گویا ابھی اس کا چہرہ میز کے شیشے میں گاڑ دے گی۔

''اور یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی مہربان لڑکی

ہوں جو ایسا نہیں کروں گی۔ اونہوں۔ میں سفید نہیں ہوں۔ میں بہت سیاہ ہوں۔ اور میں یہ کر سکتی ہوں کیونکہ تم میری توقع سے بہت چھوٹے اور کمزور ہو۔'' جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی اور سیدھی ہوئی۔

وہ گدی پہ ہاتھ رکھے' کھانستا ہوا سیدھا ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پانی تھا۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور آنکھیں اٹھا کے تالیہ کو دیکھا تو ان آنکھوں میں خوف تھا۔

''میں بات کر رہی تھی نا' تالیہ۔'' داتن نے افسوس سے اسے تنبیہہ کی تو سیاہ ہڈ والی لڑکی نے کندھے اچکائے۔ (واٹ ایور) اور پھر سے سینے پہ بازو لپیٹ لیے۔ سرمد پھر سے کھانسا۔ داتن اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تم جانتے ہو تمہارے دیے گئے آرسینک سے عصرہ محمود کی موت واقع ہوئی ہے۔''

''وہ میری مالکن تھیں۔ میں ان کا وفادار تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے لیے زہر منگوا رہی ہیں۔'' وہ اب کے دھیمی آواز میں بولا اور گردن جھکا دی۔ ''مجھے معلوم ہوتا تو میں نہ دیتا۔ آئی ایم سو سوری۔ میں سمجھا وہ کسی اور کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا تھا انہیں ایک قیمتی جان لینی ہے۔ وہ ان کی اپنی جان تھی۔ آئی ایم سو سوری۔ میں خود کئی سال سے گلٹ میں ہوں۔''

''سرمد... میں تمہارے مالی حالات دیکھ سکتی ہوں۔ تم نے ان ناجائز کاموں سے کمائی گئی رقم جوئے میں اڑا دی ہے اور تم شدید کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہو۔'' داتن سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''ہم کریڈٹ کارڈ ہیک کرنے والی بات گول کر جائیں گے۔ تم نے صرف یہ کہنا ہے کہ عصرہ نے تمہیں آرسینک لانے کو کہا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ خودکشی کر لیں گی۔ اگر تم ہمارے حق میں گواہی دے دو تو پھر تالیہ تمہیں بہت بڑی رقم دیں گی۔ تم کئی برس کے لیے سیٹل ہو جاؤ گے۔''

وہ نرمی سے سمجھا رہی تھی اور سرمد سر اٹھا کے تالیہ کو دیکھ رہا تھا جو ابھی تک اسے گھور رہی تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''او کے۔ میں گواہی دے دوں گا۔''

''سنو میری بات....'' تالیہ پھر سے غرائی۔ ''میرے لوگ تم پہ نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تم عدالت میں پیش ہونے سے پہلے بھاگو گے نہیں ورنہ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ سمجھے تم؟'' کہنے کے ساتھ اس نے پیر سے چھوٹی میز کو ٹھوکر ماری۔ اس پہ رکھی ٹوکری اور ٹائم پیس نیچے جا گرے۔ فرش پہ گرنے سے گھڑی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ سرمد نے کرچیوں سے نظر اٹھا کے تالیہ کو دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔ ساتھ ہی تھوک نگلا۔

''میں گواہی دے دوں گا۔ لیکن مجھے پیسے پہلے چاہیے ہوں گے۔''

''پیسے کام کے بعد ہوں گے۔ سنا تم نے؟'' وہ سر جھٹک کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ''اب میں اس شخص کو پے کروں گی جس نے مجھے پھنسایا تھا؟ واہ! میں تمہاری کار میں انتظار کر رہی ہوں۔''

داتن نے افسوس سے سر ہلایا اور واپس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب وہ دھیرے دھیرے بولتے اس سے پیسوں کے معاملات طے کرنے لگی۔

☆☆☆

ٹرائل والا دن بہت روشن تھا۔ آج آسمان پہ بادل تھے نہ ہوا تیز تھی۔ بس سنہری سورج تھا جو تیز چمک رہا تھا۔ سرما کی دھوپ کی تپش بھی عجیب ہوتی ہے۔ جتنا جھلسائے' اتنا ہی سکون آتا ہے۔

ایسے میں وان فاتح اپنی ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پہ بیٹھا ناشتے میں مصروف تھا۔ سکندر سوٹ میں ملبوس تیار لگ رہا تھا۔ اشعر بھی تیار تھا۔ وہ جانتا تھا وہ دونوں عدالت جا رہے ہیں۔ اس نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ البتہ ناشتہ کرتی جولیانہ ایک دم کھنکھاری۔ سب نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھنے لگے۔

''کیا تالیہ مراد آج عدالت آئے گی؟''

''ہاں۔ ظاہر ہے۔ وہ نہ پیش ہوئی تو اس کی

ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔" اشعر نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اور اگر اس کے خلاف فیصلہ آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"فیصلے ایک دن میں نہیں آجاتے۔" فاتح نے ہموار آواز میں کہا تو جولیانہ فوراً بولی۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ تالیہ مراد آج کل ذرا ذرا سی بات پہ بہت اوور ری ایکٹ کر رہی ہیں۔" وہ طنز سے بولی۔ جیسے اسے تالیہ پہ بہت غصہ تھا۔ "جس طرح کا سلوک انہوں نے ہمارے سامنے دکھایا' ایسا ہی وہ میڈیا کے سامنے دکھا رہی ہیں۔ کل انہوں نے ایک صحافی کو تھپڑ کھینچ مارا۔"

"کیوں؟" فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔

"آپ سوشل میڈیا نہیں دیکھ رہے' آبنگ؟" اشعر نے مسکراتے ہوئے کرسی دھکیلی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایک اسٹور میں ایک صحافی نے تالیہ سے سوال کرتے ہوئے اسے عصرہ محمود کی قاتل کہہ دیا تو اس نے اسے تھپڑ مار دیا۔ راہ گیروں نے ویڈیو بھی بنالی۔ تالیہ بہت حد تک ان اسٹیبل ہو چکی ہے۔"

"مجھے بے گناہ ہوتے ہوئے کوئی قاتل کہے گا تو میں اس سے بھی زیادہ کروں گا' اشعر۔" وہ ناگواری سے بولا اور پلیٹ پرے دھکیلتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ تالیہ کا ذکر' اس کا آئے روز ایک نیا مسئلہ' ہر شے تکلیف دہ تھی۔

سرما کی یہ جھلساتی دھوپ عدالت کی عمارت پہ بھی پھیلی تھی۔

کیمروں کے جلتے بجھتے فلیش جو کمرہ عدالت پہنچنے تک تالیہ کی آنکھوں میں پڑتے رہے تھے' اس کو اندر تک جھلسانے کے لیے کافی تھے۔ لیکن وہ سیاہ ہیٹ سر پہ جمائے' سپاٹ چہرے کے ساتھ خاموشی سے رپورٹرز کے ہجوم سے نکل آئی تھی۔

آج عدالت میں پیش ہونے کا دن تھا۔ اور اس کے پاس گواہ تھا۔ تالیہ مراد کو یقین تھا کہ اس کا گواہ اس کو بری کروالے گا۔

جج اپنا ڈیسک سنبھال چکی تھی۔ وکلاء اپنی اپنی میز پہ بیٹھے تھے۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پراسیکیوٹر جج کی طرف رخ کیے اپنے افتتاحی دلائل دینے لگا۔ وہ یہاں سے پراسیکیوٹر کی پشت دیکھ سکتی تھی۔ وہ نوجوان تھا، پرجوش تھا اور اس کی آواز میں تالیہ مراد کے لیے تنفر تھا۔

"تالیہ مراد ایک خطرناک عورت ہے' یور آنر۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بتا رہا تھا۔ "یہ بہت پلاننگ سے وان فاتح اور مسز عصرہ محمود کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ اس ٹرائل کے دوران میں آپ کو بتاؤں گا کہ کس طرح انہوں نے عصرہ محمود کے قیمتی نوادرات حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر ان نوادرات کی وصیت لکھوا کے عصرہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔"

تالیہ اولین قطار کی ایک نشست پہ بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں گھمائیں۔ دونوں طرف کی کرسیوں کے درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ اس کے دوسری جانب پہلی قطار میں اشعر بیٹھا تھا۔ ساتھ سکندر موجود تھا۔ وہ بھی اشعر کی طرح سیاہ سوٹ پہنے اس مقدمے کے لیے تیار ہو کے آیا تھا۔

تالیہ نے چہرہ دوسری جانب موڑا۔ اس کے ساتھ والی کرسی پہ ایڈم بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ سادگی سے مسکرایا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ گردن سیدھی کی۔

"میرا پہلا گواہ ہے سرمد زہدی......" پراسیکیوٹر کہہ رہا تھا۔ "سرمد نے رضا کارانہ طور پہ گواہی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس کے پاس کیس سے متعلق اہم معلومات ہیں۔"

پراسیکیوٹر نے مسکرا کے پیچھے بیٹھے اشعر کو دیکھا۔ اشعر بھی مسکرایا۔ تالیہ نے گردن موڑ کے غور سے اس کی مسکراہٹ دیکھی۔ پھر سپاٹ چہرہ سامنے کو موڑ لیا۔ آج اس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

کچھ دیر بعد سرمد کٹہرے میں رکھی کرسی پہ بیٹھا حلف لے رہا تھا۔ وہ آج بالکل نارمل لگ رہا

تھا۔ پرسکون اور پراعتماد۔ سوٹ بھی پہن رکھا تھا اور قدرے معتبر دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ کا عصرہ محمود سے کیا تعلق تھا؟" چوکھٹے سے نیچے کھڑا پراسیکیوٹر سوالات کا آغاز کرنے لگا۔

سرمد نے اسی اعتماد سے جواب دیا۔ "میں ان کے والد کا ملازم تھا۔"

"آپ کی عصرہ سے آخری دفعہ ملاقات کب ہوئی؟"

"ان کی موت سے بھی شاید تین سال پہلے۔ میں ان سے ایک لمبا عرصہ نہیں ملا تھا۔"

تالیہ نے ایڈم کو دیکھا اور ایڈم نے تالیہ کو۔ پھر دونوں سامنے دیکھنے لگے۔

"آپ ان کی موت کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر آپ نے گواہی دینے کے لیے خود کو کیوں پیش کیا؟" پراسیکیوٹر کے سوالات رٹے رٹائے تھے۔ جیسے وہ دونوں ریہرسل کر کے آئے تھے۔

"کیونکہ پرسوں رات آپ کی یہ ملزمہ اپنی ایک ساتھی خاتون کے ساتھ میرے گھر آئی تھیں۔" وہ سامنے کرسی پہ بیٹھی تالیہ کی طرف انگلی اٹھا کے کہہ رہا تھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔

"یہ زبردستی میرے گھر میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے مجھے گردن سے پکڑا۔ مجھے زدوکوب کیا۔" اس نے کالر کا بٹن کھولا اور گردن کا نشان دکھایا۔ "انہوں نے میرے گھر میں توڑ پھوڑ کی۔ اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے عدالت میں پیش ہو کے ان کے حق میں بیان نہ دیا تو یہ..... مجھے..... قتل کر دیں گی۔" چبا چبا کے بولا۔ تالیہ نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ بہت سی متعجب نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ ان میں سے کچھ ملامتی بھی تھیں۔

"اور یہ آپ سے کیا بیان دلوانا چاہتی تھیں؟"

"پتا نہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میں یہ بیان دوں کہ عصرہ محمود کو آرسینک میں نے لا کر دیا۔ ساتھ مجھے بھاری رقم کی پیشکش بھی کی۔ میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ مجھے پولیس پروٹیکشن دی جائے۔ مجھے تالیہ مراد سے جان کا خطرہ ہے۔"

وہ اتنے اعتماد سے کہہ رہا تھا جتنے اعتماد سے سچ بولنے والا سچ بولتا ہے۔ کمرہ عدالت کی اونچی کھڑکیوں سے چھن کے اندر آتی دھوپ کٹہرے پہ سیدھی پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں وہ معتبر لگ رہا تھا۔

یہاں سارے کھیل سچ اور جھوٹ کے تھے۔ یا پھر وقت کے۔

پراسیکیوٹر نے ریموٹ اٹھا کے بٹن دبایا تو ملٹی میڈیا پروجیکٹر پہ تصاویر چلنے لگیں۔ سرمد کے گھر کے لاؤنج کا منظر۔ وہاں ہر شے ٹوٹی بکھری پڑی تھی۔ صرف گھڑی اور ٹوکری نہیں۔ بلکہ برتن بھی ٹوٹے پڑے تھے۔ اس نے یقیناً تالیہ کے جاتے ہی مزید توڑ پھوڑ کر کے تصاویر لے لی تھیں۔

"یور ونیس۔ (آپ کا گواہ)" پراسیکیوٹر واپس اپنے ڈیسک کی طرف آتے ہوئے احمد نظام سے بولا اور اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ ایک مسکراتی نظر اشعر پہ ڈالی۔ اس نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔

احمد نظام نے گہری سانس لی اور کھڑے ہوئے۔ پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کٹہرے کے سامنے آئے۔

"تو آپ عصرہ محمود کے ملازم ہیں؟"

"میں ان کے والد کا ملازم تھا۔"

"اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ پرسوں رات تالیہ مراد آپ کے گھر آئی تھیں؟" احمد نظام تعجب سے پوچھ رہے تھے۔

"بالکل۔"

"اور انہوں نے آپ کو دھمکایا' اور جان سے مارنے کی دھمکی دی؟"

"جی....." وہ مسکرا کے بولا۔

احمد نظام چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر کھنکھارے۔

"میرے پاس آپ کے لیے صرف ایک سوال ہے۔" انہوں نے وقفہ دیا۔
"تالیہ مراد کس وقت آپ کے گھر آئی تھیں؟"
"قریباً رات کے تین بجے۔"
"اور وہ کب تک وہاں رہیں؟"
"دس سے پندرہ منٹ۔"
"آپ کو وقت کیسے یاد ہے؟"
"کیونکہ انہوں نے میری گھڑی توڑی تھی۔ اس لیے وقت وہیں جم گیا تھا۔ تین بج کے پندرہ منٹ۔"
"یعنی تین بجے سے تین بج کے پندرہ منٹ تک تالیہ مراد آپ کے گھر تھیں؟"
"جی۔"
احمد نظام جج کی طرف مڑے۔ "یور آنر میں اس گواہ سے مزید سوال پوچھوں گا لیکن میں اس سے پہلے ایک ری بٹل گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"
پراسیکیوٹر کوفت سے اٹھا۔ "یور آنر مجھے اس بات پہ اعتراض ہے۔ احمد نظام عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ان کے گواہ کے پیش ہونے تک دیر ہو جائے گی اور....."
"میرا گواہ اسی کمرے میں موجود ہے۔ بلکہ گواہان۔" احمد نظام نے سامنے بیٹھے پولیس کمشنر کی طرف اشارہ کیا۔
"ٹھیک ہے۔ بلائیے ان کو۔" جج نے کاغذ پہ کچھ نوٹ کرتے ہوئے اجازت دی۔ پراسیکیوٹر اسی کوفت سے واپس بیٹھا۔
پولیس کمشنر اور کٹہرے تک آیا۔ حلف لیا اور ٹیک لگا کے کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"
"میں پولیس کمشنر ہوں۔"
"اور کیا آپ کے تھانے میں تالیہ مراد کا کیس ہے؟"
"جی۔"
"ابھی سرمد صاحب نے کہا کہ رات تین بجے سے تین پندرہ تک تالیہ مراد ان کے گھر پہ موجود تھیں۔ کیا یہ درست ہے؟"
"یہ ناممکن ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"
جہاں اشعر چونک کے سیدھا ہوا اور سرمد نے تعجب سے کمشنر کو دیکھا' وہیں سیاہ ہیٹ والی لڑکی دھیرے سے مسکرا دی۔
اس کا گواہ آن پہنچا تھا۔
وقت۔
آج وقت نے تالیہ مراد کے لیے گواہی دینی تھی۔
"عدالت کو بتایئے کہ یہ ناممکن کیسے ہے؟"
پولیس کمشنر نے چہرہ مائک کے قریب کیا اور سنجیدگی سے بولا۔
"کیونکہ پرسوں رات دو بجے سے صبح پانچ بجے تک تالیہ مراد ہمارے تھانے میں...... ہماری حراست میں تھیں۔ انہوں نے ایک رپورٹر کو تھپڑ دے مارا تھا اور رپورٹر نے پولیس بلالی تھی۔ میں پوری رات وہیں بیٹھا اسی معاملے کو سلجھاتا رہا تھا۔ میرا پورا تھانہ اس بات کا گواہ ہے۔ ہمارے پاس سی سی ٹی وی فوٹیجز ہیں۔ آپ احمد نظام بھی ان کے ساتھ تھے۔"
اشعر نے بے یقینی سے گردن موڑ کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے دیکھ رہی تھی۔ سرمد نے اچنبھے سے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کمشنر جھوٹ کیوں بول رہا تھا۔
"کیا تین بجے تالیہ مراد پندرہ منٹ کے لیے آپ کی نظروں سے دور ہوئی تھیں؟"
"ہرگز نہیں۔ وہ سارا وقت ہماری نظروں کے سامنے تھیں۔ وہ میرے آفس میں بیٹھی تھیں۔ بلائنڈز کھلے تھے۔ سارا تھانہ ان کو دیکھ سکتا تھا۔ آپ سی سی ٹی وی چیک کر لیں۔ آفیسرز کو بلا لیں۔ بلکہ اس صحافی کو تھپڑ مارنے کی ویڈیو بھی ہمارے پاس ہے۔ اس پہ ٹائم اسٹیمپ ہے۔"
"ایسا نہیں ہے۔ میں بتا رہا ہوں یہ پرسوں

میرے گھر اسی وقت پہ آئی تھیں۔" سرمد اپنی جگہ سے زور سے بولا۔ وہ متعجب تھا۔ الجھا ہوا تھا۔ جج نے برہمی سے اسے روکا۔ "اپنی باری پہ بولیے۔"

سرمد جب دوبارہ کٹہرے میں آیا تو اس کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ احمد نظام نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آپ کے گھر نہیں آئیں بلکہ آپ کو کسی نے ان پہ الزام لگانے کو کہا ہے۔"

"وہ آئی تھیں۔ ایک عورت بھی ساتھ تھی۔ انہوں نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی۔ اور پیسے دینے کی آفر بھی کی۔"

"جان سے مارنے کی دھمکی دی یا پیسے دیے؟ لوگ ایک وقت میں ایک چیز کرتے ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"آپ نے کہا کہ آپ کی ٹوٹی گھڑی پہ وقت تین بج کے پندرہ منٹ پہ فریز ہو چکا ہے، سرمد۔ آپ نے وہ گھڑی غالباً خود ہی توڑی تھی کیونکہ آپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ تالیہ مراد اس وقت تھانے میں ہیں۔ آپ نے سوچا کہ وہ اپنے گھر میں ہوں گی اور ان کے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہو گی۔"

"شاید مجھ سے وقت بتانے میں غلطی ہوئی ہو۔"

"اگر ابھی کرائم سرچ یونٹ آپ کے گھر جائے تو ان کو آپ کی ٹوٹی گھڑی پہ کیا وقت فریز ہوا ملے گا؟"

وہ اتنی تیزی سے بولے کہ سرمد گڑبڑا گیا۔ اب وہ اپنے بتائے وقت سے نہیں پھر سکتا تھا۔ اس نے خود دیکھا تھا گھڑی پہ وقت۔ تالیہ مراد ایک ہی وقت میں دو جگہوں پہ کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کے پاس وقت کی چابی تھوڑا ہی تھی؟

"اوبجیکشن۔" پراسیکیوٹر ضبط نہ کر سکا اور جگہ سے اٹھا۔ جج اور احمد نظام نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پہ اوبجیکشن کرے۔ وہ واپس بیٹھ گیا۔ اشعر جھک کے خفگی سے اسے کچھ کہنے لگا۔ وہ جواباً پریشانی سے وضاحت دینے لگا۔

احمد نظام واپس سرمد کی طرف مڑے۔ "تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ تالیہ مراد ایک ہی وقت میں دو جگہوں پہ کیسے ہو سکتی ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کے پاس کوئی ٹائم ٹرنر ہو۔ جس سے وہ وقت کو پیچھے کر سکیں۔" احمد نظام نے کمرہ عدالت کی طرف چہرہ موڑا اور با آواز بلند کہا۔ "اور ہم سب جانتے ہیں کہ وقت کی کوئی چابی نہیں ہے۔ گیا وقت ہاتھ نہیں آتا نہ آج تک وقت کسی کے لیے رکا ہے۔ ہے نا؟"

تالیہ مسکرا دی۔ ایڈم بھی مسکرا دیا۔

پھر وہ اس کی طرف جھکا اور آہستہ سے بولا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ یہ کام کر جائے گا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" کٹہرے میں کھڑے سرمد کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ بار بار بے یقینی سے پہلی رو میں بیٹھی سیاہ ہیٹ والی لڑکی کو دیکھتا تھا۔ وہ آج جارحانہ انداز والی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بس سادگی سے مسکرا رہی تھی۔

"آپ کی باتیں اتنی احمقانہ ہیں سرمد صاحب کہ میں ان پہ کوئی سوال ہی نہیں کرنا چاہتا۔ آگے چلتے ہیں۔" احمد نظام نے افسوس سے کہا تو سرمد نے دیکھا، جج نے سر جھٹک کے کاغذ پہ کچھ لکھا ہے۔

پراسیکیوٹر برہمی سے اشعر سے سرگوشی کر رہا ہے۔

اور حاضرین چبھتی نظروں سے سرمد کو دیکھ رہے تھے۔

وہ سچ کہہ رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ لیکن کوئی اس کا یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

"سرمد میرے پاس آپ کے فون ریکارڈز ہیں۔ اس رات تالیہ مراد تو آپ کے گھر نہیں گئی تھیں لیکن آپ نے اس رات یہ کالز ضرور کی تھیں۔" احمد نظام ایک کاغذ اسے دکھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "اور یہ کالز آپ نے اشعر محمود کو کی تھیں۔"

سرمد نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ پھر بے چارگی سے نیچے بیٹھے اشعر کو دیکھا جس نے ایک دم پہلو بدلا تھا۔ سکندر نے گردن موڑ کے اشعر کو دیکھا۔ پھر سرمد کو۔

"آپ نے اشعر کو کیوں کال کی؟"

"مجھے یاد نہیں۔"

"آپ کافی دیر تک ان سے بات کرتے رہے۔ آپ نے ان سے چار دفعہ کل سے آج تک بات کی۔ لیکن آپ کو یاد نہیں؟ کیا انہوں نے کہا تھا تالیہ مراد پہ تشدد کا الزام لگانے کے لیے؟"

"یہ کال ریکارڈز جھوٹے ہیں۔" وہ گردن کڑا کے بولا۔ ساتھ ہی پریشان نظروں سے سامنے کرسیوں پہ بیٹھے اشعر کو دیکھا۔ وہ لبوں پہ مٹھی رکھے اسے گھورے جا رہا تھا۔

"میں آپ کی یادداشت تازہ کیے دیتا ہوں۔ اس عورت کو پہچانتے ہیں آپ؟" احمد نظام نے فولڈر سے ایک فوٹو نکال کے اس کے سامنے کی۔

پراسیکیوٹر بے چینی سے اٹھا۔ "اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟"

احمد نظام تحمل سے اس کی طرف گھومے۔

"پراسیکیوٹر صاحب... گواہ کا نام آپ نے فہرست میں لکھا تھا۔ اس کے متعلق پوری ریسرچ کر کے میں لایا ہوں۔ میں آپ کے لیے آپ کی جاب آسان کر رہا ہوں۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ آپ تحمل سے گواہ کو جواب دینے کا موقع دیں۔"

ان کا انداز ایسا دوٹوک تھا کہ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ جج صاحبہ نے بھی ناگواری سے اعتراض رد کیا تو وہ ماتھے پہ بل لیے واپس بیٹھ گیا۔ احمد نظام فرصت سے واپس سرمد کی طرف مڑے۔

"میں اس کو نہیں پہچانتا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"یہ لڑکی ایک زمانے میں عصرہ محمود کے گھر بطور آیا کام کرتی تھی۔ اس کو ہائر کرنے کے کچھ عرصے بعد اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ آریانہ بنت فاتح کو اغوا کیا اور ایک حادثے میں دونوں کی موت واقع ہو گئی۔ یہی لڑکی آپ کی قالینوں کی دکان پہ بھی کام کرتی تھی۔ میں نے اس لڑکی کی فیملی کو بھی ٹریس کیا ہے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

"سرمد صاحب... میرا خیال ہے.... عصرہ کو علم نہیں تھا کہ اس لڑکی کو آپ نے بھیجا تھا۔ آپ اس کے ذریعے آریانہ کو اغوا کر کے تاوان لینا چاہتے تھے لیکن بچی کی حادثاتی موت کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔ کئی برس بعد کسی طرح عصرہ کو اس کا علم ہو گیا۔ انہوں نے آپ کو کال کی۔ اپنی موت سے چند ہفتے قبل۔ وہ آپ کی دکان میں آپ سے ملنے بھی گئیں۔ آپ کی دکان میں کام کرنے والوں کو ان کی آمد کا دن تک یاد ہے۔ عصرہ نے آپ کو قانون کے کٹہرے میں لانے کی دھمکی بھی دی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

مگر وہ کہے جا رہے تھے۔

"آپ نے اپنے ایک دوست سے کانٹیکٹ کیا۔ یہ آدمی اب جیل میں ہوتا ہے اور یہ اس کا بیان حلفی ہے۔" احمد نظام نے ایک کاغذ جج کے ڈیسک پہ رکھا۔ "یہ آدمی آپ کا جانا پہچانا دوست تھا۔ آپ نے اس سے آرسینک خریدا۔ اور پھر آپ نے وہ زہر آلود کیک عصرہ کو بھیجے۔ عصرہ کو قتل کرنے کی سب سے بڑی وجہ آپ کے پاس ہے کیونکہ وہ آپ کو گرفتار کروانا چاہتی تھیں۔"

"ایسا نہیں ہوا۔ میں نے ان کا قتل نہیں کیا۔ وہ میری مالکن تھیں۔"

"آپ نے کہا ان کے والد آپ کے مالک تھے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں ان کا وفادار ملازم تھا۔ ٹھیک ہے میں ان سے ملا۔ وہ میری شاپ پر آئیں لیکن انہوں نے مجھ سے صرف آرسینک منگوایا تھا۔ کسی کو آرسینک دینا کوئی جرم نہیں ہے۔" وہ جذباتی ہو کے نہیں تیزی سے کہہ رہا تھا۔

عدالتی کمرے میں دبی دبی سرگوشیاں بلند ہوئیں۔ سکندر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر اشعر کو۔ پھر اس نے اشعر سے کچھ پوچھا لیکن وہ جواب دیے بنا سرمد کو گھورتا رہا۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آرسینک آپ نے اپنے لیے خریدا یا ان کے لیے؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ جج اپنی عینک کے اوپر سے غور سے سرمد کو دیکھ رہی تھی۔ اشعر نے جھک کے پراسیکیوٹر کو مخاطب کیا لیکن پہلی دفعہ اس نے ہاتھ اٹھا کے اشعر کو روک دیا۔ وہ اس آدمی کی کہانی سننا چاہتا تھا۔

"انہوں نے بدلے میں مجھے ڈائمنڈ نیکلس دیا تھا۔ آپ اس جیولری اسٹور پہ چلے جائیں۔ ان کے پاس ریکارڈ ہوگا۔ میں نے وہ ڈائمنڈ بیچے بھی تھے۔ اگر وہ مجھ پہ خفا ہوتیں تو مجھے وہ سیٹ نہ دیتیں۔" اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔ "تالیہ مراد میرے اوپر قتل کا الزام ڈالنا چاہ رہی ہیں حالانکہ یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے صرف ان کو آرسینک دیا تھا۔"

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ عصرہ نے آرسینک خود منگوایا تھا؟"

"یور آنر....." پراسیکیوٹر پھر سے اٹھا۔ "اگر مسز عصرہ کو وہ آرسینک اس شخص نے دیا تھا تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا قتل اسی آرسینک سے ہوا ہے۔ تالیہ مراد کے پاس وسائل کی کیا کمی ہے؟ وہ کہیں اور سے بھی لے سکتی ہیں۔"

"میں اسی طرف آرہا ہوں۔" وہ تحمل سے بولے۔ "سرمد صاحب..... جس آئی پی ایڈریس سے تالیہ مراد کا کریڈٹ کارڈ ہیک کر کے کیک آرڈر کیے گئے تھے وہ ان کافی شاپس کے تھے جو آپ کی دکان کے دو سو میٹر ریڈیئس میں آتی تھیں۔ آپ کے فون کے جی پی ایس ڈیٹا کے مطابق آپ بھی انہی جگہوں پہ اسی وقت موجود تھے جب یہ ہیک ہوا۔ آپ اتنے دن اتفاق سے انہی جگہوں پہ کیوں تھے؟"

"میں نے کوئی کارڈ ہیک نہیں کیا۔ مجھے ان کیکس کا کچھ نہیں پتہ۔ میں نے صرف آرسینک دیا تھا۔ اور آرسینک دینا جرم نہیں ہوتا۔" وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اسے عدالت آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اگر اشعر نہ کہتا تو وہ کبھی یہاں نہ آتا۔ وہ روپوش ہو جاتا۔ یہ سارا کھیل تالیہ مراد کا تھا۔ وہ اور اس کی دوست..... وہ اس کے ساتھ گڈ کاپ بیڈ کاپ کھیل کے گئے تھے۔ وہ اسے کسی اور طرح عدالت نہیں لا سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا وہ اشعر سے رابطہ کرے گا اور اشعر اس کو عدالت میں جا کے تالیہ کا کیس خراب کرنے کو کہے گا۔ وہ خود چل کے ان کے پھندے میں آگیا تھا۔

"عصرہ نے آرسینیک منگوانے کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی؟"

"انہوں نے کہا تھا انہیں ایک جان لینی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ....." وہ چپ ہوگیا۔

"کہ وہ اپنی جان لینے جارہی تھیں؟ آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ عصرہ محمود نے خودکشی کی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں نے صرف آرسینک لا کر دیا تھا۔ یہ جرم نہیں ہے۔" وہ زچ ہو کے بولا۔ احمد نظام چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔

"میرا آخری سوال۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "آپ نے کس کس کو بتایا تھا کہ عصرہ محمود نے آپ سے آرسینک منگوایا ہے؟"

سرمد کی رنگت پھیکی پڑی۔ "کسی کو نہیں۔"

"سرمد صاحب..... یہ آپ کے اس زمانے کے فون ریکارڈز ہیں۔" انہوں نے کاغذات کا ایک پلندہ جج صاحبہ کی میز پہ رکھا۔ "آپ نے عصرہ سے ملنے کے بعد سے ان کی موت تک کئی دفعہ ایک نمبر پہ کال کی اور اس نمبر پہ بات بھی کی۔ یہ نمبر اس زمانے میں اشعر محمود کے زیر استعمال تھا۔ اور انہی کے آئی ڈی کارڈ پہ رجسٹرڈ ہے۔ کیا آپ نے اشعر صاحب کو بتایا تھا کہ ان کی بہن نے آرسینک منگوایا ہے؟"

کمرہ عدالت میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سکندر نے گردن موڑ کے اشعر کو دیکھا۔ بے یقینی سے۔ صدمے سے۔

''ایش؟'' اس نے اشعر کو کہنی سے جھنجوڑا۔
لیکن اشعر نے حرکت نہ کی۔ وہ سامنے دیکھتا رہا۔ اس کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔
''مجھے یاد نہیں۔'' وہ ہکلایا۔
''سرمد.... میں آپ کے لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈرائیو اور آپ کے ای میل اکاؤنٹ سے لے کر آپ کی ہر چیز کا ریکارڈ کورٹ میں منگوالوں گا۔ پولیس کی ٹیک ٹیم آپ کی ایک ایک کال' ایک ایک موومنٹ کو ماضی میں ٹریس کر لے گی۔ یہ وزیر اعظم کی بیوی کا قتل کیس ہے۔ صرف سچ آپ کو بچائے گا۔'' احمد نظام نے اونچی آواز میں دہرایا۔ ''کیا آپ نے کسی اور کو بتایا تھا کہ عصرہ محمود نے آپ سے زہر منگوایا ہے؟''
''میں نے.... صرف اشعر صاحب کو بتایا تھا۔''
وہ اب اشعر کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اشعر کی چبھتی نظریں اس پہ جمی تھیں۔ اس کی آنکھیں اتنی گلابی ہو رہی تھیں کہ لگتا تھا خون بہہ نکلے گا۔ لوگ مڑ مڑ کے اب اشعر کو دیکھ رہے تھے۔
''آپ جانتے تھے ماما نے اس سے زہر منگوایا تھا؟'' سکندر دبی آواز میں غرایا۔
''یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ سکندر نے چہرہ موڑ لیا۔ اس کے ماتھے پہ بل تھے اور آنکھوں میں نمی تھی۔
''اور عدالت کو بتائیں.... اشعر صاحب نے آگے سے کیا کہا؟''
''انہوں نے کہا کہ میں خاموشی سے عصرہ میم کو آرسینک مہیا کر دوں۔'' سرمد نے چہرہ جھکا دیا۔
''دیٹس آل.... یور آنر....'' احمد نظام جج کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ ''عصرہ محمود نے اس شخص سے آرسینک منگوایا تھا۔ جو کیک مبینہ طور پہ تالیہ مراد نے بھیجے ان پہ آرسینک نہیں لگا ہوتا تھا۔ اس بات کے لیے ہمارے پاس گواہ ہے۔''
''کون؟''
تالیہ نے چونک کے سر اٹھایا۔

''پردھان منتری خود۔ ان کا کہنا ہے کہ کیک پہ آئسنگ نہیں تھی۔ اگر عدالت ان کو طلب کرے تو وہ آ کر خود گواہی دیں گے۔ فی الحال یہ ان کی طرف سے حلفیہ بیان ہے۔''
انہوں نے ایک اور کاغذ جج صاحبہ کے سامنے رکھا۔ تالیہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا۔
لیکن اس شام سے واپسی ممکن نہ تھی۔
''کیک جس نے بھی بھیجے' یہ معمہ حل کرنا پولیس کا کام ہے۔'' احمد نظام اب کہہ رہے تھے۔ ''لیکن میں یہ بات ثابت کر چکا ہوں کہ آرسینک عصرہ محمود نے خود منگوائی تھی۔ جناب عالی' عصرہ محمود کی موت قتل نہیں' خودکشی تھی' اور اگر اس میں کسی کا قصور ہے تو دو لوگوں کا۔ ایک یہ شخص (سرمد کی طرف اشارہ کیا) جس نے ان کو زہر لا کے دیا۔ اور دوسرا اشعر محمود (پیچھے حاظرین میں بیٹھے اشعر کی جانب بازو بلند کیا) جس کو معلوم تھا کہ اس کی بہن زہر منگوا رہی ہے اور زہر کسی کو شفا نہیں دیا کرتا۔ اس کا کام جان لینا ہی ہوتا ہے۔ اپنی یا کسی اور کی۔ لیکن اشعر محمود نے یہ ہونے دیا۔ میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ تالیہ مراد کے اغوا کاروں کے کنٹینرز سے ملنے والے خون اور ڈی این اے کے سیمپل اشعر محمود کے سیمپلز کے ساتھ میچ کیے جائیں۔ مجھے شک ہے کہ عدالت کو وہاں سے حیرت انگیز نتائج ملیں گے۔''
اشعر سر جھٹکتے ہوئے اٹھا' کوٹ کا بٹن بند کیا' اور سیدھا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ درمیانی رستے کے وسط تک پہنچا تھا جب جج صاحبہ کی آواز سنائی دی۔
''آپ کہاں جا رہے ہیں' اشعر صاحب؟''
اس نے کوفت سے آنکھیں میچیں.... اور رک گیا۔
اب وہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچاتے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ | ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن | عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

نوشین فیاض

پہاڑوں پر جمی برف منتظر تھی۔ بند شیشوں والی کھڑکی پر سفید پردے گرائے، نرم تکیے پر بال بکھرائے بے سدھ سوئی ہوئی اس لڑکی۔ گزرے سالوں میں جس نے اسی کمرے میں، اسی بستر میں سوئی ہوئی منال کو جگاتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا تھا۔ "میں ان برف زاروں اور برفیلے نظاروں سے کبھی اکتا ہی نہیں سکتی۔ مجھے ان مقدس نظاروں سے عشق تھا...... عشق ہے اور مرتے دم تک عشق رہے گا۔"

اس کا یہ اعتراف عشق جنوری کی سرد ہوا نے چپکے سے اڑایا اور منجمد نظاروں کے حوالے کر دیا تھا۔ جنہوں نے اپنے ساتھ ہی اس اعتراف کو تصویر کر لیا تھا۔ یہ اونچے نیچے، دور نزدیک، چھوٹے بڑے...... سارے پہاڑ اسے ویسے ہی والہانہ یاد کرتے تھے جیسے وہ ان پہاڑوں کو ملتان کے ایک خوب صورت اور وسیع گھر میں یاد کیا کرتی تھی۔ ہر شخص کو...... ہر آنے والے شخص کو وہ اپنی وادی سے محبت کا بتانا کبھی نہیں بھولتی تھی۔

اس کے کمرے کی چار دیواری پر ان ہی پہاڑوں کی اتنی بڑی بڑی تصویریں تھیں جیسے وہ واقعی وہاں موجود ہوں۔

کسمسا کر ایک دو کروٹیں بدلتے اچانک جیسے اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے بستر پر نہیں۔ اس نے کمبل سے منہ نکالا۔

مکمل ناول

''اوہ میرے خدا۔'' اپنے ہاتھوں اور پیروں سے کمبل کو دھکیل کر ایک ہی جست میں وہ نیچے اتری۔ اسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ ملتان سے کل رات اپنے خواب نگر آ پہنچی ہے۔

نیچے اتر کر اس نے مخملی پاپوش میں پیر پھنسائے اور فوراً کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ شیشے کھلنے کی دیر تھی کہ برفیلی ہوا نے گلے لگ کر خوش آمدید کہا۔ وہ ٹھرا کر رہ گئی۔ سامنے دودھیا منظر نے اس کی نظر باندھ کر سحر زدہ کر دیا تھا۔ اسے لگا، وہ برف کی ہو گئی ہے۔

''مجھے تم سے عشق ہے...... مجھے تم سے عشق ہے...... مجھے تم سے مرتے دم تک عشق رہے گا۔'' دونوں بانہیں کھول کر اس نے تجدید عشق کیا۔ پہاڑوں نے مسکرا کر اعتراف اسی کی طرف لوٹایا۔

نیچے راستے سے برف ہٹاتے لڑکے نے سر پر پاکول کو درست کیا اور نظر اوپر کی۔ اسے لگا وہ ساری زندگی وہاں سے ہل نہیں سکے گا۔ اس نے یہاں بہت خوب صورتی دیکھی تھی۔ سیاحوں میں بہت دیوانگی دیکھی تھی۔ جس شے نے اسے مجسمہ کیا، وہ شے...... وہ لڑکی تھی۔ وہی لڑکی...... ہاں وہی لڑکی......

☆☆☆

تر و تازہ ہو کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لپاٹ کر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو بڑے ابا کی آواز کے ساتھ ایک ٹی وی کی آواز تھی جو اتنے بڑے گھر میں گونج رہی تھی۔ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ بڑی امی اپنے بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمبل ان کی ٹانگوں پر پھیلا ہوا تھا اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے ہونٹ ہلنے کے ساتھ ساتھ گر رہے تھے۔

بڑے ابا اپنی بید کی چھڑی کرسی کے ساتھ ٹکائے عین دیوار پر ٹنگی ایل ای ڈی کے سامنے بیٹھے تھے۔ کل وقتی ملازمہ ان کے سامنے مجرم بنی کھڑی تھی۔ یقیناً ہانیہ کے آنے سے پہلے اس کی کلاس ہو رہی تھی۔ وہ سلام لے کر بڑے ابا کی طرف پیار لینے بڑھی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بت بن کر کھڑی گل مینہ کو تقریباً دفع ہی کیا تھا۔ جس پر شکر کا کلمہ پڑھتی ممنون نظروں سے ہانیہ کو تکتی وہ پل بھر میں باہر غائب ہوئی تھی۔

''اتنی جلدی اٹھ گئیں تم؟ نازنین تو کہتی تھی تمہیں اٹھایا نہ جائے تو رات بھر سونے کے بعد تم دن بھر سوؤ گی اور پھر اگلی رات......'' مسکرا کر اسے پہلو میں جگہ دیتے بڑی امی نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''ممی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ ملتان کی گرمیاں ہوتی ہیں جو مجھے جاگنے نہیں دیتیں۔ یہاں برف کی پریاں میرا منہ چومتی ہیں تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔''

''ہاں، تمہاری سرخ ناک دیکھ کر پتا چل رہا ہے۔'' چینل بدلتے بڑے ابو نے اسے دیکھ کر کہا اور ایک بار پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوئے جہاں کل رات ہونے والی لینڈ سلائیڈنگ کی خبر چل رہی تھی۔

''پتا نہیں داؤد بھائی گھر پہنچے کہ نہیں۔'' اسے فکر ہوئی۔

''داؤد یہاں سے نکل گیا تھا۔ میری بات ہوئی ہے اس سے۔'' بڑے ابو نے اسے مطمئن کیا۔ اس نے شکر کیا کہ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ایسا کچھ نہیں ہو گیا۔

''ہائے بچے! بھوک لگی ہے تو اس گل مینہ سے کہو، تمہیں ناشتا بنا دے۔''

''کہاں بڑی اماں! اتنی جلدی ناشتا کرنے کا دل نہیں کرتا۔ میں تو ذرا دیر کے لیے باہر جانے لگی ہوں۔''

''باہر کہاں؟'' بڑے ابو جیسے ایک کان ان ہی کی طرف لگا کر بیٹھے تھے۔

''بس یہیں...... گھر کے باہر۔ سڑکوں پر برف پڑی ہے، وہی دیکھنے۔''

''اکیلی کہاں جاؤ گی۔ ذرا چائے پی لیں، تو میں خود تمہیں لے چلتا ہوں۔''

ان کی بات پر وہ خوش ہو گئی تھی ورنہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پہلے کی طرح منع نہ کر دیں۔ پچھلی بار وہ

یہاں تقریباً چار سال پہلے آئی تھی۔ اسی طرح صبح صبح اس نے منال کو اٹھایا اور زبردستی بستر سے نکال کر ساتھ لے جانے پر آمادہ کیا۔ ابھی گھر سے چند قدم دور ہی گئے تھے جب بڑے ابا نے اپنی مشہور زمانہ بید کی چھڑی گھما کر برف سے ڈھکی زمین پر ماری۔

"ایک منٹ سے پہلے واپس پہنچو اور آئندہ میری اجازت کے بغیر باہر نکلیں تو اسی چھڑی سے......"

ان کی ادھوری بات کو دونوں نے پورا پورا سمجھ لیا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کے باہر نکلنے کے خلاف تھے۔ بس ایک تو موسم بہت ہی خراب تھا۔ دوسرا علی الصباح وہ دونوں بنا پوچھے 'بنا بتائے نکل پڑی تھیں۔ کشمیری چائے کے بھاپ اڑاتے بڑے بڑے سگ پینے کے بعد وہ بڑے ابا کے ساتھ باہر نکل آئی۔

ہر طرف برف ہی برف نظر آرہی تھی۔ پہاڑوں کے پار کہیں سورج طلوع تو ضرور ہوا ہوگا۔ یہ الگ بات کہ صبح کے اجالے کے علاوہ اس کا ثبوت کچھ نہیں تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ہی بڑے ابا چھینکنے لگے تھے۔ ان کے قدموں کی رفتار بھی انتہائی سست ہو گئی تھی، جسے ہانیہ نے بڑی شدّت سے محسوس کیا تھا۔ وہ تو جلد از جلد دور بہت دور چلی جانا چاہتی تھی مگر اب اسے لگ رہا تھا، یہیں سے پلٹنا پڑے گا۔

"ہانی بچے! اب واپس چلیں؟"

وہ نہ بھی کہتے تو ان کی حالت زار چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی' جسے ہانیہ نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اب جب وہ منہ سے کہہ رہے تھے تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سو اثبات میں جواب دے کر ان کی تقلید میں قدم واپسی کی طرف موڑ دیے۔ سامنے کچھ دور سے آتے شخص کو اس نے اس خوب صورتی نورانی منظر میں گناہ کے کسی سیاہ دھبے کی طرح دیکھا اور بڑے دل سے نظر انداز کر دیا۔ ارسل کہتا تھا۔

"اگر نظر انداز کرنے کے فن کی کوئی ڈگری ہوتی تو اپنی ہانیہ کو پی ایچ ڈی کے ہم پلہ ڈگری ملتی۔"

بے وقت یاد پر وہ مدھم سا مسکرائی۔ ٹھنڈی پڑتی ناک کو دستانے پہنے ہاتھوں سے ڈھک کر وہ سستی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ سامنے دکھائی دیتا شخص ان کی قریب آکر رک گیا۔

"السلام علیکم انکل! خیریت، اتنی صبح آپ باہر ہیں۔" اس کے اردو لب و لہجے پر ہانیہ نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی زیادہ عمر کا آدمی نہیں تقریباً اسی کی عمر کا لڑکا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! بس ذرا ہانیہ کو لے کر باہر نکلا تھا۔ ہمت جواب دے گئی اور اب بس واپس گھر جا رہے ہیں۔"

"آپ جانتے ہیں، آپ کی طبیعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی پھر بھی۔" غیر محسوس طریقے سے وہ بڑے ابا کا ہم قدم ہوا تھا اور ہانیہ پیچھے رہ گئی تھی۔

"سب سے لڑ کر یہاں یہ سب دیکھنے آئی ہے۔ اب میں بھی نہ لے کر آتا تو کون لے کر آتا۔ زید، زین وغیرہ ہوتے تو......"

نمناک لہجے میں ادھوری بات کے بعد گھر پہنچنے تک خاموشی ان کے ساتھ سفر کرتی رہی۔

"اچھا انکل! چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو بس ایک فون کر دیجیے گا۔"

"کہاں چلے؟ اندر آؤ، گل مینہ ناشتا بنا رہی ہے، ساتھ ناشتا کرتے ہیں۔"

"اچھا، آپ چلیں، میں یہ چیزیں رکھ کر آتا ہوں۔" کسی تکلف میں پڑے بغیر اس نے فوراً ہامی بھری اور بیلچہ وغیرہ جو وہ درخت کے تنے کے ساتھ رکھ کر گیا تھا، اندر رکھنے کے لیے چلا گیا۔

"یہ سلمان ہے۔ یہیں پاس ہی میں رہتا ہے۔ جب سے سب گئے ہیں، بے چارہ روز آتے جاتے پوچھتا ہے۔ گھر بھی آجاتا ہے۔ باہر کے سارے کام بھی کرتا ہے۔" بڑے ابا کو تعارف اب یاد آیا تھا۔

وہ ان کے پیچھے ہی اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر میں بڑی امی کی ہدایات کے ساتھ گل مینہ نے کھانے کی

میز سجادی۔

اگرچہ کھانے کے دوران بھی سلمان بڑے ابا اور بڑی امی سے باتیں کر رہا تھا، پھر بھی ہانیہ کو سب کچھ بڑا ویران سنسان لگ رہا تھا۔ اسے واجد ماموں اور ساجد ماموں کے خاندان کے ساتھ آباد اس گھر کے صبح و شام یاد تھے۔ بڑی بے دلی اور خاموشی سے ناشتا کیا تھا اس نے۔

☆☆☆

اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ دونوں ماموؤں کے یکے بعد دیگرے بیرون ملک خاندان سمیت منتقل ہونے کے بعد بڑے ابا اور بڑی امی کی اس گھر میں زندگی کیسی ہوگی۔ وہ جوان تھی، اس کے پاس ہزار مشغلے تھے۔ دل میں کئی امنگیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ دو دن میں اکتا گئی تھی۔ باہر برف پوش مناظر تھے جو نظر کو بھلے لگتے اور دل کو خوشی دیتے تھے۔ مگر وہ باہر جا نہیں سکتی تھی، بڑے ابا نے دونوں کئی بار اسے باہر اکیلے نکلنے سے منع کیا تھا۔

''تمہیں نہ ڈھنگ سے راستوں کا پتا ہے، نہ تم برف کے تیور پڑھنا جانتی ہو۔ خدانا خواستہ ایک غلط قدم ساری زندگی کے لیے پچھتاوے دے جائے گا۔''

وہ مان لینے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ فون کے سگنل کبھی مل جاتے تھے اور کبھی سارا سارا دن غائب رہتے۔ اسے لگنے لگا تھا، وہ واقعی اپنی خواہش کے قلعے میں محصور ہوگئی ہے۔ ان برف زاروں نے خوشبو جیسی اڑتی لڑکی کو ایک کمرے میں قید کر چھوڑا تھا۔

ابھی بھی وہ کھڑکی کے سامنے کرسی ڈالے برف کے ننھے ننھے گالے گرتے دیکھ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ایک بار تو باہر نکل کر انہیں مٹھیوں میں لے۔

کچھ سوچ کر وہ اٹھی اور باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ دستانے، اونی ٹوپی، گرم شال وغیرہ اوڑھ کر وہ نیچے آئی تو بڑے ابا عصر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ بڑی امی غالباً باورچی خانے میں گل مینہ سے کچھ پکوا رہی تھیں۔ پہلے اس نے سوچا بنا بتائے نکل جائے۔ بڑے ابا نے پچھلے دو دنوں میں اتنی بار تاکید کی تھی کہ وہ خود تذبذب کا شکار ہوگئی تھی۔

نماز کے بعد دعا کر کے انہوں نے جائے نماز تہہ کی اور اس پر دعا پھونکی۔

''بڑے ابا! میں باہر جاؤں، پکا زیادہ دور نہیں جاؤں گی اور تھوڑی سی دیر میں واپس آجاؤں گی۔'' اس نے یقین دہانی کروائی اور بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''میں ساتھ چلتا ہوں۔''

''اوہ نو۔ بڑے ابا! آپ نہیں، ویسے بھی میں کون سا دور جا رہی ہوں۔ آپ رہنے دیں پلیز۔''

''تو سلمان کو فون کر دیں، اسے ساتھ لے جائے اور کچھ چیزیں وغیرہ بھی لانی ہیں۔ گل مینہ نے تو قسم کھائی ہے ختم ہونے سے پہلے بتانا نہیں۔ وہ تو شکر ہوا میں نے خود دیکھ لیا۔''

بڑی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ بڑی شدت سے انکار کرتے کرتے رکی۔ بڑے ابا کے چہرے پر رضامندی دیکھ کر وہ خاموش کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد جیکٹ کی جیب میں سامان کی فہرست اور پیسے لیے وہ سلمان کے ہمراہ گھر سے نکل رہی تھی۔

انہیں زیادہ دور تو نہیں جانا تھا۔ ہانیہ نے سوچ لیا تھا ایک بار وہ گھر سے نکلے تو وہ دور بھی جا سکتی تھی۔ یہ سلمان کون سا بڑے ابا تھا۔ اس کی توقع سے بھی زیادہ برف باری ہو چکی تھی اور ہو رہی تھی۔ اکا دکا لوگ ہی باہر نظر آرہے تھے جو شاید بحالت مجبوری باہر نکلے تھے۔ شاید ان کے گھروں میں بھی کوئی گل مینہ تھی جو سودا سلف مکمل طور پر ختم ہونے سے پہلے نہیں بتاتی تھی۔ اپنی بے تکی سوچ اس نے خود ہی ہنس کر انجوائے کی۔ دو قدم آگے چلتے سلمان نے مڑ کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر ''سمجھ گیا'' کا تاثر دیتے سر ہلا کر سامنے متوجہ ہوگیا۔

''آپ یہ سامان لے لیں، میں ابھی آتی ہوں۔'' جیب سے فہرست اور پیسے نکال کر اسے

تھماتے ہوئے وہ خاصے مدبرانہ انداز میں گویا ہوئی۔
"چلیں، کہاں چلنا ہے؟" اس سے فہرست اور پیسے پکڑ کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہوا تو ہانیہ گڑبڑا گئی۔
"نہیں...... کہیں بھی نہیں۔ میں بس یہیں...... کہیں نہیں جا رہی میں۔" اٹک اٹک کر بولتی اس کی زبان آخر میں خفگی سے رواں ہوئی تھی۔ سلمان نے منہ پھیر کر ہنسی چھپائی۔ انکل نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔
"یہ وہ برف باری نہیں جس سے لطف اندوز ہونے سیاح یہاں آتے ہیں۔ یہ وہ برف باری ہے جو یہاں بسنے والوں کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ کچھ انتظار کریں۔ لطف اندوز ہونے کے موسم بھی آئیں گے۔" اس نے جیسے تسلی دی۔
"کتنا انتظار؟ ایک ہفتے میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بے اختیار پوچھا۔
"ایک ہفتے میں تو یہ برف بھی نہیں پگھلے گی، اگر موسم کا یہی حال رہا، آثار بتاتے ہیں کہ موسم اس سے زیادہ خراب تو ہوسکتا ہے مگر ٹھیک...... ابھی نہیں۔"
"مگر میں تو اگلے ہفتے چلی جاؤں گی۔" وہ اس بات کو یکسر فراموش کر گئی تھی کہ جس سے وہ بات کر رہی ہے، وہ ایک اجنبی ہے لیکن اجنبی کچھ زیادہ مناسب نہیں لگتا۔ وہ اس کا ایسا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جس سے وہ اپنی باتیں کرتی۔ شاید گزرے دو دنوں میں اس نے خود کو اتنا اکیلا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ہانیہ شہزاد دیواروں سے باتیں کرنے لگتی۔
"اس پر تو میں آپ کو جھوٹا دلاسا بھی نہیں دے سکتا۔" کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے تو دل ہی دل میں سب سے ناراض ہوتی وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ حالانکہ داؤد بھائی نے کہا بھی تھا کہ ابھی موسم ایسا نہیں، ہوسکتا ہے ہم پہنچ ہی نہ سکیں۔ مگر اس نے ایک نہیں سنی تھی۔

جتنی اسے وادی سے محبت تھی، اتنا ہی اس کے اور وادی کے درمیان مجبوریوں کا جنگل تھا۔ کبھی اس کے پیپر، کبھی اس کی پڑھائی، کبھی اس کی طبیعت اور کبھی ارسل کی ضد۔ وہ ہر بار آتے آتے رہ جاتی تھی۔
وہ خاموشی اور لاتعلقی سے سلمان کو خریداری کرتے دیکھ رہی تھی۔ واپسی پر اس کے ساتھ ساتھ ہانیہ کے ہاتھوں میں بھی مختلف اشیاء سے بھرے تھیلے تھے۔
"اتنا سب کچھ منگوایا ہے بڑی امی نے؟" کوفت اور بے زاری سے تھیلے پکڑے وہ بولی۔
"نہیں، آنٹی نے تو اتنا سب نہیں منگوایا، میں نے لی ہیں کچھ چیزیں۔"
"تو بعد میں آ کر خود لے لیتے۔ اب مجھے بھی یہ سب اٹھانا پڑ رہا ہے۔" کسی لگی لپٹی کے بغیر اس نے منہ پر بات ماری۔
"اصل میں میرا ارادہ ابھی بنا ہے ورنہ گھر سے سواری لے کر نکلتا۔" اس نے برا مانے بغیر سہولت سے جواب دیا۔ جو الم غلم ہانیہ کی نظر میں اس نے اٹھا لیا تھا۔ وہ چاہتا بھی تو اپنے دونوں ہاتھوں میں سما نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

آتے ہوئے وہ ارسل کا لیپ ٹاپ اٹھا لائی تھی۔ مقصد تو صرف اسے ستانا تھا مگر اب برفیلے نظاروں کے علاوہ یہی اس کی ایک دلچسپی تھی۔ عجیب مار دھاڑ اور ایکشن سے بھرپور انگلش ہندی فلمیں تھیں جنہیں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دیکھنے پر مجبور تھی۔ گل مینہ اسے رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی تو لیپ ٹاپ بند کر کے وہ نیچے چلی گئی۔
بڑی امی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سلمان کھانے کی میز پر برتن لگا رہا تھا۔ غیر محسوس انداز میں ہانیہ نے خود پر نظر ڈالی۔ سارا لباس سلوٹ زدہ ہو رہا تھا، جیسے کسی مٹکے سے نکال کر پہنا ہو۔ ہاتھ سے سلوٹیں کھول کر اس نے بالوں سے پونی نکالی۔ شہد

رنگ تراشیدہ بال کندھوں پر آن گرے تھے۔ اسی لمحے کسی بات پر مسکراتے ہوئے سلمان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر نظر کا زاویہ بدل گیا۔

"بھئی آج کا کھانا تو بہت خاص ہے، بھلا پوچھو تو کیوں؟" وہ ہاتھ دھو کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو بڑے ابا نے پوچھا۔ اس نے ابرو اچکا کر "کیوں" کا اشارہ دیا۔

"کیونکہ......"

"اوں ہوں......" کہہ کر سلمان نے انہیں متوجہ کیا اور رکابیاں ان کی سمت بڑھا دیں۔ جسے بڑے ابو نے ایک ایک کر کے چاروں کرسیوں کے آگے رکھ دیا۔ ان کی ادھوری بات پوری ہونے کا انتظار کیے بغیر ہانیہ ان کے ساتھ ہی کھانا شروع کر چکی تھی۔

پہاڑی بکرے کی بھنی ہوئی ران، اشتہا انگیز سبزیوں کا سوپ اور گرم گرم چپاتی، خوش ذائقہ کھانے نے ہانیہ کے موڈ پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ کھانا ختم ہونے پر گل مینہ اور سلمان نے برتن اٹھائے تو وہ بڑے ابا سے موسم پر بات کرنے لگی۔

"کھانا پسند آیا؟" بڑے ابا ایسے شوق سے پوچھ رہے تھے جیسے یہ کھانا ان کی عظیم ترین ایجاد یا چلو ایجاد نہیں تو دریافت ہو۔

"بالکل پسند آیا بڑے ابا۔ سوپ تو لاجواب ہے۔ رات کو سونے سے پہلے دو ایک بار پھر پیوں گی۔ آپ کو پتا ہے ایک بار ارسل دوستوں کے ساتھ کہیں کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو اتنی تعریفیں کہ الامان۔ ممی کے ساتھ روز بحث کرتا کہ ہمارے باورچی حسین کو کچھ بنانا نہیں آتا۔ اسے فارغ کریں، ایک دن تنگ آ کر ممی نے کہا ہمیں بھی لا کر وہ کھانا کھلائے۔ وہ سوپ لے کر آیا، یقین کریں بڑے ابا! باقیوں کا مجھے پتا نہیں، مجھے تو بس الٹیاں ہی آنے لگی تھیں۔ اس کے بعد سوپ پینے سے ہی توبہ ہو گئی تھی، جو آج ٹوٹ گئی۔" وہ جانے کس ترنگ میں مسکراتے ہوئے پرجوش طریقے سے واقعہ سنانے بیٹھ گئی۔

"یہ سوپ سلمان نے بنایا ہے اور یہ بھی۔" ان کا اشارہ بچی ہوئی بھنی بکرے کی ران کی طرف تھا۔ ان کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ ہانیہ ایک لمحے کے لیے حیران ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے جھینپی اور پھر مسکرانے لگی۔ سلمان نے آتے جاتے رنگ بڑی دلچسپی سے دیکھے تھے۔

"ارے واہ۔ آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

"یہ سب میں نے نہیں کیا۔ انکل، آنٹی اور پھر گل مینہ نے بہت مدد کی ہے، ورنہ میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔"

گل مینہ نے شکر ادا کیا کہ کسی کو تو اس کی قدر ہے ورنہ چاہے گھر میں تین ہی بندے تھے، اس کے علاوہ۔ کام تو پھر بھی وہ سارا دن ہی کرتی تھی۔ بدلے میں بے وجہ ڈانٹ ڈپٹ اور پھٹکار ملتی۔

"اوہ یار! سبزیاں کاٹنا، دھونا وغیرہ یہ کام تو اور طرح کے کام ہیں۔ پکایا تو تم نے ہی ہے ناں۔" اب کی بار بڑے ابا کی بات پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

برتن اٹھائے جا چکے تو گل مینہ چائے بنانے چلی گئی۔ وہ چاروں وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

"تو آپ باورچی ہیں یا شوقیہ کھانا بناتے ہیں؟"

ہانیہ کے سوال پر اس کے لبوں پر سادہ سی مسکراہٹ ابھری۔ "دونوں" ہانیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور گل مینہ کی لائی چائے اپنے آگے سرکا لی۔

"اور آپ کیا کرتی ہیں؟" اگلا سوال سلمان کی طرف سے تھا۔

"میں...... میں نے بی اے کیا ہے اور اب بس موج مستی کرتی ہوں۔"

"یعنی آپ کچھ نہیں کرتیں۔" ہانیہ کی طرح اثبات میں سر ہلا کر اس نے گرم چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

"مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ برا

مان گئی تھی۔

"بات ضرورت کی نہیں، خواہش کی ہوتی ہے۔ میں اپنی بات کروں تو مجھے اچھے کھانوں کا نہ صرف شوق ہے بلکہ جنون ہے۔ کھانے کا بھی پکانے کا بھی۔ بس اسی لیے سوچا ہر انسان کی کوئی نہ کوئی خواہش، جنون یا شوق ہوتا ہوگا۔"

ہانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ بڑے ابا کی کسی بات کا جواب دینے لگا۔

چائے پیتے ہوئے ہانیہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس بندے کو اپنے کیا شوق بتائے؟ اچھے سے اچھا لباس اس کے کمرے کی الماری میں بنا کہے آ جاتا تھا۔ موویز وغیرہ اکثر موڈ بننے پر وہ سینما تک دوستوں کے ساتھ دیکھنے چلی جاتی تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر کھانا تینوں وقت کے علاوہ بھی جب دل کرتا حسین کو کہہ کر پکوالیا جاتا تھا یا آرڈر کر کے باہر سے منگوالیا جاتا۔ خوب صورت رہنے کے لیے ہر ماہ ایک دو فیشل، اسکن پالش کے لیے ممی پارلر میں اس کے لیے وقت لے لیتی تھیں۔ مہنگے سے مہنگے برانڈ کی چیزیں ایک فون کال کی دوری پر مل جاتی تھیں۔ ایسے میں وہ کون سی خواہش اور کون سا شوق پال سکتی تھی؟ ایک وادی تھی جو اسے تڑپاتی تھی۔ گرمیوں میں سب وادی آتے تھے مگر وہ ہر بار اسی ضد میں رک جاتی تھی کہ مجھے تو سرما میں برف باری دیکھنے جانا ہے۔ پھر ہر سرما میں جب تک داؤد بھائی کو وقت ملتا اس وقت تک راستے بند ہو چکے ہوتے یا کبھی وہ بیمار ہو جاتی۔ کبھی ارسل کہتا کہ مجھے بھی ساتھ جانا ہے اور اس کی اور ارسل کی لڑائی سے عاجز آ کر داؤد بھائی سرے سے انکار ہی کر دیتے۔

"ویسے اگر میں کہوں تو سلمان تمہیں بھی یہ سوپ بنانا سکھا دے گا۔" بڑے ابا کی بات پر وہ لحہ موجود میں واپس آئی۔

"بالکل بھی نہیں بڑے ابا! میں سیکھ کر کیا کروں گی۔ ویسے بھی چار دن تک واپس چلی جاؤں گی۔ کیا فائدہ یہ چار دن چولہے کے آگے ضائع کرنے کا۔"

چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر کرسی دھکیل کر کہتی وہ ان تینوں کے چہرے دھواں دھواں کر گئی تھی۔

ایک بار پھر تنہائی کی سزا ملنے والی تھی۔ وہ دونوں ہانیہ کو دیکھ کر اتنے خوش تھے کہ اس گھر کی ویرانی میں کسی کے ہونے کا احساس بولے گا۔ وہی اب جانے کی بات کر رہی تھی۔

اور سلمان...... وہ تو اس چہرے کو، اس آواز کو، اس لڑکی کو چار سالوں سے دل میں بسائے بیٹھا تھا۔ اتنے طویل انتظار کے بعد وہ آئی تھی تو ایسے کہ وہ اس کی موجودگی ٹھیک سے محسوس نہیں کر پایا تھا اور وہ جانے کی بات کر رہی تھی۔

اپنی اپنی چائے ختم کر کے وہ خاموشی سے اٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

رات کے تقریباً آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ ارسل کے لیپ ٹاپ پر ایک انتہائی فضول فلم دیکھتے ہوئے اسے انتہائی بوریت کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ موسم انتہائی خوب صورت ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے جلدی جلدی موٹا اپر پہنا، دستانے چڑھائے، مفلر لپیٹ کر اپنی اونی ٹوپی پہنی اور ٹارچ ہاتھ میں لے کر وہ بڑے ابا اور بڑی امی کے سونے کا یقین کر کے باہر نکل آئی۔ اس کا ارادہ ذرا سا پھر کر واپس آنے کا تھا۔

اپنی چھت پر کھڑے سلمان نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا تو جلدی سے اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر مفلر لپیٹتا اس کے پیچھے لپکا۔

ذرا سا چل کر ہانیہ کو ایک جگہ الاؤ جلتا نظر آیا، وہ وہیں رک گئی۔ دفعتاً اسے لگا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے یک دم پلٹ کر دیکھا وہاں سلمان کھڑا تھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہی سوال اگر میں آپ سے کروں کہ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، وہ بھی اکیلے؟" سلمان نے اس

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے ادھر نکل آئی۔'' اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''آپ یہاں بیٹھیں، میں ابھی آیا۔'' اس نے بیگ نیچے رکھا۔

اسے وہاں چھوڑ کر وہ رات کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ ہانیہ نے ٹارچ گھما کر ارد گرد دیکھا، ہر سو برف ہی برف تھی۔ دہکتی آگ کا الاؤ دور تھا۔ جانے وہاں کوئی تھا بھی یا نہیں، اس نے سوچا۔

آسمان پر بادل ہی بادل تھے ورنہ رات ایسی بھی تاریک نہ ہوتی۔ وہ کھڑی رہی۔ پانچ منٹ کا کہہ کر اسے گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہو چلے تھے۔ یخ بستہ سرد ہوا چہرے پر سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے عقب میں سرسراہٹیں سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر ٹارچ کی روشنی ڈالی، کوئی نہیں تھا۔ ایک بار پھر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اب کی بار اسے یقین تھا کہ قریب ہی کوئی ہے مگر روشنی میں پھر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ خوف سے اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔ اسنو لیپرڈ کے بارے میں اکثر بڑے ابا بتایا کرتے تھے اور پھر پچھلے سال جب بڑی امی کی طبیعت ناساز تھی تو داؤد بھائی ممی کو لے کر آئے تھے۔ ان کا بھی تو سامنا ہوا تھا برفانی چیتے سے۔

ہانیہ کو لگا اس کا سارا خون جم چکا ہے اور بدن پتھر ہوگیا ہے۔ اگر برفانی چیتا ہوا تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ چلا سکتی تھی اور چلا کر کسی مدد کی امید کے بغیر اس کا شکار ہو جاتی۔

اگر برفانی چیتا نہ بھی ہوتا کوئی انسان ہی ہوا۔ سلمان کے علاوہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ ایک کے بعد ایک ذہن میں آنے والا خیال اس کے خوف میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ اسے سارے درخت عفریت نظر آنے لگے تھے۔ پچھلے چالیس منٹ سے وہ ایک ہی حالت میں کھڑی تھی۔ پتا نہیں کب آنکھ سے آنسو بھی بہنے لگ گئے تھے۔ پتا نہیں اسے چھوڑ کر وہ کہاں چلا گیا تھا۔

''سوری...... میں......''

سلمان کی آواز پر وہ دائیں طرف مڑی۔ وہ نیچے جھک کر سیدھا ہو رہا تھا جب ہانیہ نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے ساتھ اس قدر گھٹیا مذاق کرنے کی؟ میں خوف سے مرسکتی تھی۔ یہاں کوئی درندہ آسکتا تھا۔'' بنا رکے وہ بولے جا رہی تھی اور ایسے ہی بنا رکے اس کے چہرے، اس کے سینے پر تھپڑ مارے جا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہا۔

مارتے مارتے وہ رونے لگی تھی۔ چمڑے کے دستانے ہاتھوں سے نکل چکے تھے مگر اسے احساس نہیں ہوا۔ پھر اچانک پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رو دی۔ ہاتھ ابھی بھی اس کی جیکٹ پر تھے۔

کیا گزرے چار سالوں کی دعائیں قبول ہوگئی تھیں کہ قبولیت کا اجر اس ایک لمحے میں ان کے درمیان آٹھہرا تھا۔ سلمان کا دل چاہا آگے بڑھ کر اس کے وجود کے گرد اپنی بانہوں کی زنجیر ڈال کر اسے ہمیشہ کے لیے قید کر لے۔ مگر ایک چھوٹا سا قدم بڑھانے کے بجائے وہ ایک قدم دور ہوا۔ جیکٹ تو وہ چھوڑ چکی تھی، اب تو بس ہاتھ ہی رکھے تھے۔

جھک کر اس نے بیگ کھولا اور لائی ہوئی لکڑیوں پر تیل ڈال کر ماچس کی جلتی ہوئی تیلی پھینک دی۔ ایک دم سے آگ بھڑک اٹھی۔

''غصہ اتر گیا؟'' اس نے نارمل لہجے میں کہتے ہوئے بیگ سے ایک ایک کر کے چیزیں نکالنی شروع کیں۔ دستانے پہنتی ہانیہ خاموش رہی۔

''میں جلانے کے لیے لکڑی لینے گیا تھا اور لکڑیاں لاتے ہوئے ایک جگہ غلط قدم رکھ بیٹھا۔ بے توازن ہو کر گرا تو سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ اور میں غالباً بے ہوش ہوگیا تھا۔ شکر خدا کا خود ہی ہوش آ گیا تو فوراً دوڑ لگائی۔ بخدا جان بوجھ کر دیر نہیں کی۔ نہ ہی آپ سے کوئی مذاق کیا ہے۔'' بتاتے بتاتے وہ اپنا بڑا

سا بیگ آدھا خالی کر چکا تھا۔

ہانیہ کو ندامت نے گھیر لیا۔ اسے کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے، ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ شاید اس کی شرمندگی بھانپ گیا تھا۔ اسی لیے اگلی بات شروع کی۔

''آپ یہاں آ کر بیٹھیں، سردی کا احساس کم ہوگا۔'' قدرے ہموار پتھر آگ کے قریب رکھ کر اس نے ہانیہ کو پکارا۔ وہ خاموشی سے وہاں جا بیٹھی۔

''اب یہ بتائیں کیا پئیں گی، سوپ یا چائے؟'' تر و تازہ لہجے میں وہ جیسے گزرے گھنٹے کا مداوا کر رہا تھا۔

''سوپ پیتے ہیں۔''

''سوپ کے ساتھ فرائز کھائیں گی۔ میں نے خود بنائے ہیں۔'' ایک چھوٹی سی پلیٹ میں فرائز نکال کر اس کے سامنے رکھ کر سلمان نے دو پیالیوں میں سوپ ڈالا۔ ایک اس کے ہاتھ میں دے کر دوسرا خود پکڑا اور اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

''کان پکڑ کر معذرت کروں تو معافی مل جائے گی؟'' ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑے وہ پوچھ رہا تھا۔ ہانیہ جھینپ کر مسکرائی۔

''آئم ساری...... میں بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔'' اس نے کھل کر اعتراف کیا۔

''آپ سوری کہتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ کیا کبھی کسی نے آپ کو بتایا؟''

''جب تم سوری کہتی ہو تب تم سب سے اچھی لگتی ہو۔'' ہانیہ کے کانوں میں ایک اور آواز گونجی، اس نے سر جھٹکا۔

''نہیں...... کسی نے نہیں بتایا۔'' وہ مسکرائی۔

''اب میں نے بتا دیا ہے، یاد رکھیے گا۔''

ہانیہ نے اچھے بچوں کی طرح سر ہلا دیا۔

''ویسے آپ کے گھر میں کسی کو پتا چل گیا تو؟''

''کیا؟''

''یہی کہ آپ اتنی رات کو گھر سے باہر ہیں۔ اگر کوئی جاگ گیا تو؟''

''تو میں شکر کرتا کہ میرے گھر میں میرے علاوہ کوئی ہے۔'' وہ ہنسا۔

''کیا مطلب...... آپ کے گھر میں کوئی نہیں ممی پاپا یا بہن بھائی وغیرہ؟''

''میں اکیلا ہوتا ہوں۔'' ہانیہ کو جواب دے کر وہ اٹھ کر بیگ کے پاس چلا گیا۔ ہانیہ کو اس قدر مختصر جواب کی توقع نہیں تھی۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔

''یہ میں خاص طور سے لے کر چلتا ہوں۔'' آن کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ہانیہ کو بتایا۔

''وہ بھلا کیوں؟'' ہانیہ نے پوچھا۔ اس نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

مقامی موسیقی کی آواز بلند ہوئی تو تنہائی کا احساس یک دم مٹ گیا تھا۔ ہانیہ کو لگا جیسے وہ لوگوں کے بھرے مجمعے میں بیٹھی ہو۔ مقامی بولی سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے وہ گیت کے بول تو نہیں سمجھ پائی، البتہ موسیقی سے خوب حظ اٹھا رہی تھی۔ گیت کے اختتام پر سلمان نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا۔

''یہ میرا پسندیدہ گیت ہے۔''

''مجھے بھی بہت اچھا لگا، اگرچہ سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''یہ میرے بابا کی آواز میں ہے۔ ہمارے ایک تہوار پر انہوں نے اموجان کے لیے گایا تھا۔''

ہانیہ کے کچھ کہنے سے پہلے وہاں تین چار مقامی لوگ آ گئے۔ سلمان نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا اور مقامی بولی میں ان سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے کرتے وہ ہانیہ کی طرف مڑا۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مقامی رقص دکھاؤں؟''

ہانیہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔ بات تو کچھ نہیں تھی لیکن سلمان کی آنکھیں بڑی شوخ ہو رہی تھیں۔

''دکھادیں۔''
وہ واپس آ کر بیٹھا اور دوبارہ وہی گیت لگا دیا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے چاروں مقامی آدمی آگے بڑھے اور آگ کے گرد دائرہ بناتے رقص کرنے لگے۔
دستانے اتارے سلمان نے تالیاں بجانا شروع کیں تو وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگی۔ آسمان کے کسی کنارے سے جھانک کر چاند نے یہ منظر دیکھا اور مطمئن ہو کر دوبارہ بادلوں کے لحاف میں منہ دے لیا۔
اس برف زار میں جما دینے والی سردی میں ہانیہ نے جوش، خوشی اور سرشاری سے اپنا خون ابلتا ہوا محسوس کیا۔ اس کی سیاہ گھور آنکھیں اماوس کی رات میں کسی جگنو کی مانند چمک رہی تھیں۔ سلمان نے چپکے سے ان دو آنکھوں کا، تمتماتے سرخ دو انار رخساروں کا، خوشی اور جوش سے کپکپاتے پھول جیسے نازک لبوں کا صدقہ اتارا تھا۔
گیت ختم ہوا۔ دونوں نے خوب تالیاں پیٹ کر رقص کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ جواباً وہ ان دونوں کے آگے جھک کر جانے کیا کہہ گئے تھے کہ سلمان کو لب دبا کر ہنسی روکنی پڑی۔
''کیا کہہ رہے ہیں؟''
''دعائیں دے رہے ہیں۔''
''آمین کہنا چاہیے آپ کو۔'' اس نے خفگی سے کہا۔
اب وہ کیا بتاتا کہ وہ ان دونوں کو بیٹے کی دعا دے رہے ہیں۔
''آمین۔'' اس نے صدق دل سے کہا۔ ہانیہ نے بھی سچے دل سے آمین کہا تھا۔ جس وقت وہ گھر پہنچے رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔
''اس خوب صورت رات کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' گیٹ پر پہنچ کر اس نے کہا۔
''شکریہ میں نہیں لیتا۔ کوئی دعا دیجیے۔'' وہ شوخ ہوا۔
''اللہ پاک تمہاری سب دلی خواہشیں پوری کرے۔'' ایک بار پھر وہ اسے تم کہہ چکی تھی۔
''آمین۔''
اب بھی نہ ہو قبول تو ایک الگ بات ہے
آمین کہہ رہے ہیں وہ میری دعا کے ساتھ
اس نے شعر گنگنایا۔
''تھک گئی ہوں۔ بہت نیند آ رہی ہے۔'' شعر کے مطلب میں الجھے بغیر وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

مندی مندی آنکھوں سے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ کافی دیر سو چکی تھی، اس کے باوجود بدن پر تھکن طاری تھی۔ وہ اور سو لیتی اگر دروازے پر ہوتی دستک نیند میں خلل نہ ڈالتی۔ جماہیاں لے کر وہ اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے گل مینہ کھڑی تھی۔
''صاحب کہہ رہے تھے، دیکھ کر آؤ بچی کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' گل مینہ نے آنے کا مقصد بتایا۔
''ہاں ٹھیک ہوں۔ آ رہی ہوں نیچے۔'' ہاتھ سے جماہی روکتے اس نے کہا اور واپس اندر آ گئی۔
تھوڑی دیر بعد زبردستی تازہ دم ہو کر وہ نیچے اتری۔ سلمان بڑا ہشاش بشاش بڑے ابا کے پاس بیٹھا تھا۔
''السلام علیکم!''
''وعلیکم السلام۔'' مشترکہ سلام کا مشترکہ جواب آیا تھا۔
''طبیعت ٹھیک ہے؟'' بڑے ابا کی گل مینہ کے جواب سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔
''جی بڑے ابا! ٹھیک ہوں۔ بس کل رات دیر سے سوئی تھی، تو اٹھنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔'' اس نے سچ بولا۔
''وہی میں کہوں صبح ہوتے ہی نیچے اتر آتی ہے ہماری ہانی اور آج اتنا وقت ہو گیا۔''
''آ گئی ہانیہ!'' بڑی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا اور واپس مڑ کر گل مینہ کو آواز

لگائی۔ ”گل...... او گل! ناشتا لگا جلدی سے۔“
ہانیہ کو لگا اس کے لیے ناشتا لگانے کا کہا جا رہا ہے مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بڑے ابا اور بڑی امی بھی اس کے ساتھ ناشتا کرنے لگے۔

”آپ نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟“

”پہلے بھی اکیلے کرتے ہیں، بعد میں بھی اکیلے کریں گے۔ جب تک یہاں ہو تب تک تو تمہارے ساتھ کر سکتے ہیں ناں۔“

بڑی امی کی بات سن کر وہ شرمندگی سے غرق ہونے کو تھی، اسے پتا ہوتا تو اتنی دیر نہ کرتی۔

”آؤ سلمان! تم بھی ناشتا کر لو۔“ بڑے ابا نے اسے دعوت دی۔

”میں تو کب کا کر چکا، میرا تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔“ ایک بھرپور نظر ہانیہ پر ڈال کر اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کی یہ نظر بڑے ابا کی نظر کی گرفت میں آ گئی تھی۔ اسی وقت ان کی توجہ موبائل پر آنے والی کال نے اپنی جانب مبذول کروالی۔

”لو بھئی، تمہاری ماں کی کال ہے۔ صبح سے دو بار فون کر چکی ہے۔“ موبائل انہوں نے ہانیہ کی سمت بڑھایا۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اس نے فون پکڑا اور کال وصول کر کے کرسی دھکیلتی اٹھ گئی۔

”میں ذرا چائے دیکھ آؤں۔“ بڑی امی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ میز پر وہ دونوں بیٹھے رہ گئے۔

”میری نواسی پیاری ہے ناں؟“ لقمہ توڑتے ہوئے انہوں نے سلمان سے تائید چاہی۔

”جی بہت۔“

”اچھی لگتی ہے؟“

”جی بہت۔“ کہہ کر وہ گڑبڑا گیا۔ ہاتھ روک کر وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”میرا دل چاہتا ہے، ہم مل کر اسے یہیں روک لیں۔ وادی تو اسے کھینچتی ہی ہے۔ ہم بھی کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا جواب دے۔

”ہم کب سے اکیلے ہیں، کسی کو ہمارا خیال نہیں آیا۔ چار چار بچے پیدا کیے، پرورش کی، گھر آباد کیے اور آج...... آج خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔ فون پر بھی بات ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ خود بتاؤ فون سے، بینک میں پیسوں سے فرض ادا ہوتا ہے؟ ارے میں جب مروں گا تو ان کے لیے توقع سے زیادہ چھوڑ کر مروں گا۔ آخر میری اولاد ہے۔ مگر اب خود غرض ہونے کا دل چاہتا ہے۔“

وہ سانس روکے سن رہا تھا۔ چائے لے کر نفیسہ خاتون بھی واپس آ کر بیٹھ چکی تھیں۔

”دل چاہتا ہے میرا کوئی ہو، جو یہ گھر آباد کرے۔ محبت اور دل کی رضامندی سے ورنہ مجبوری میں تو میرے بیٹے یہاں رہتے ہی رہے ہیں۔“

خاموشی کے کئی لمحے ان کے درمیان گزرے۔

دروازہ کھول کر باہر آتی ہانیہ نے خاموشی توڑی۔

”میری چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی؟“

”نہیں، ابھی تو لائی ہوں۔ کیا کہہ رہی تھی نازنین؟“

”کچھ نہیں۔ بس ڈانٹ رہی تھیں کہ میرا فون بند جا رہا ہے۔ اب سگنل نہیں آتے تو چارج کر کے کیا کرنا، ہو گیا ہو گا بند۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”مجھے دے دو میں چارج کر کے رکھ دیتی ہوں۔ اگر کوئی فون آیا تو بتا دوں گی۔“

”نہیں، اب کیا کرنا ہے۔ تین چار دن کی بات ہے۔ داؤد بھائی لینے آ جائیں گے، تب تک سکون سے رہوں گی۔“ لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے اردگرد پھیلی اداسی کو پوری طرح محسوس کیا تھا۔

وہ بھی محسوس کر ہی نہ پاتی اگر بڑے ابا کا سوال نہ سن لیتی۔

”ہم کب سے اکیلے ہیں؟“

چائے ختم کر کے کچھ سوچتے ہوئے وہ کمرے میں واپس آئی۔

☆☆☆

آسمان پر بادل ابھی بھی ویسے ہی چھائے ہوئے تھے، جیسے کل اور کل سے پہلے گزرے دنوں میں۔ اس کے باوجود آج کا دن بہت نکھرا نکھرا طلوع ہوا تھا۔ کل کا سارا دن کمرے میں مراقبہ کر کے گزارنے کے بعد ہانیہ نے آنے والے وقت کے لیے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تک ممی یا ماموں بڑے ابا اور بڑی امی کی تنہائی کا کوئی مستقل کار آمد حل نہیں نکال لیتے تب تک وہ یہیں رہے گی پھر چاہے ممی ناراض ہوں یا پاپا اسے ڈانٹیں۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ضد کا کچھ نہ کچھ مثبت جواب ملے گا۔ اب اگر اس نے یہاں رہنے کا سوچ لیا تھا تو ہر وقت کمرے میں کھڑکی کے آگے کرسی رکھے وہ موسم کے بدلنے کا، بہتر ہونے کا انتظار کرتی بور نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے آج علی الصباح اٹھ کر باورچی خانے میں گل مینہ سے کام کرواتی بڑی امی کے پاس آ دھمکی۔ بڑی امی تو اسے باہر بیٹھ کر ناشتے کا انتظار کروانے پر بضد تھیں مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

"نہیں کھڑی ہو کر دیکھوں گی۔"

گل مینہ نے میز سجا دی تو ناشتا کرنے کے بعد وہ بڑے ابا اور بڑی امی کے پاس ان کے کمرے میں جا بیٹھی ورنہ تو فوراً کمرے میں بھاگ جاتی تھی۔ کچھ دیر گزری تو روز کی طرح سلمان بھی آ گیا۔

"آج میں آپ کو چاول پکا کر کھلاتا ہوں۔"

وہ بڑی امی سے ممی کے بچپن کا کوئی قصہ سن رہی تھی، جب اس نے سلمان کو بڑے ابا سے بات کرتے سنا۔

"اور سوپ بھی۔" اس نے لقمہ دیا۔

"سوپ بھی بن جائے گا۔" اس کی فرمائش پر اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"ہانی بچے! ایسا کرو سلمان کے ساتھ تھوڑی مدد کروا دینا۔"

"لیکن بڑے ابا! مجھے کچھ نہیں کرنا آتا۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

"پھر ایسا کرتے ہیں، سب مل کر کام کرتے ہیں۔ تم دیکھنا اگر کچھ کیا گیا تو ٹھیک ورنہ دیکھ کر انجوائے کرنا۔"

یہاں وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ جب سب باورچی خانے میں تھے وہ جلے پیر کی بلی بنی کمرے میں گھومتی رہی اور پھر ساری فکریں کندھے سے اتار کر ان کے پاس چلی گئی۔ بڑے ابا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ خوش تو سلمان بھی بہت ہوا تھا مگر اس خوشی کا اظہار اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ بڑی امی منصوبے کے تحت گل مینہ کو لے کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔

"میرے پیروں میں درد شروع ہو گیا ہے۔ ذرا تیل کی مالش کروا لوں۔"

اگلے دس منٹ میں بڑے ابا بھی بہانے سے چلے گئے تھے۔ اب وہ دونوں وہاں تھے۔ ہانیہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ ایک چیز اٹھانے جاتا تو کبھی دوسری رکھنے۔ اس کا کام کرنے کا انداز بتا رہا تھا وہ یہاں پہلے بھی کام کرتا رہا ہے۔

"ہانیہ! ذرا چولہا تو آن کریں۔" شیلف کی طرف منہ کیے اس نے ہانیہ کو دانستہ نام سے پکارا۔

ہانیہ کی تو روح پرواز کرنے کو ہو گئی، اسے ایسے چولہے کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

"کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں؟" ابرو اچکا کر وہ ہانیہ سے بولا تو ناچار اسے بتانا پڑا۔

"مجھے یہ چولہا آن نہیں کرنا آتا بلکہ مجھے کچھ بھی نہیں کرنا آتا۔" وہ بے چارگی سے بولی تو وہ مسکرا اٹھا۔

"اوہو، اس میں کیا مشکل ہے۔ یہ دیکھیں۔" آگے بڑھ کر بٹن دبا کر اس نے انڈکشن اسٹوو جلایا۔

اس کے بعد وہ کام کرتا رہا اور ہانیہ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ دیکھتی رہی۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہا تھا ورنہ ہانیہ تو بوریت سے باہر بھاگنے کا سوچ رہی تھی۔

"آپ کو بلا رہے ہیں۔"

گل مینہ نے پیغام دیا تو وہ اندر چلی گئی۔ ممی کا

فون آیا تھا۔ اس نے دعا سلام کی اور پھر بڑے ابا کی نظر بچا کر کال کاٹ کر فون آف کر دیا۔ اس کے اندر کا خوف تھا کہ فون پکڑ کر وہ ان کے پاس بیٹھی رہی۔
دوپہر کا کھانا معمول سے لیٹ ہو گیا تھا۔ وجہ یہ کہ پکانے والا اکیلا بندہ تھا۔ کھانا ابھی تیاری کے مراحل میں تھا جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ یہاں دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس خوش کن تھا۔
بڑے ابا نے دروازہ کھولا اور واپسی پر ایک عمر رسیدہ مقامی شخص ان کے ساتھ تھا۔ ایک کپ چائے پی کر سلمان سے کچھ بات کر کے وہ واپس چلا گیا۔
کھانے میں مخصوص پہاڑی طرز کے چاول اور بکرے کے شوربے والا سالن تھا۔ ہانیہ کا فرمائشی سوپ بھی تھا مگر یہ سوپ اس سوپ سے مختلف تھا جو سلمان نے پہلے بنایا تھا۔ گڑ کا روایتی میٹھا بھی تھا۔ ہانیہ اس بندے کی کوکنگ سے شدید متاثر ہوئی تھی۔
''اب ہوٹل جاؤ گے تو آؤ گے کب؟'' کھانا کھاتے ہوئے بڑے ابا نے سوال کیا۔
''رات تک آجاؤں گا ان شاء اللہ۔''
''اور جانا کب ہے؟''
''بس کھانا کھا کر نکل رہا ہوں۔''
''تو ہانیہ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ بھی تمہارا ہوٹل دیکھ لے گی۔ سارا راستہ خوب صورت مناظر سے اٹا پڑا ہے۔''
(دراصل بڑے ابا چاہتے تھے کہ ہانیہ اس کو اچھی طرح جان لے تاکہ پھر وہ ہانیہ کی رضا مندی سے اسے ہمیشہ کے لیے یہیں روک لیں)
بڑے ابا کی بات پر ہانیہ منہ میں چمچہ لے جانا بھول گئی تھی۔ کتنی فراخ دلی سے وہ اسے جانے کی اجازت دے رہے تھے۔
''ٹھیک...... ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

☆☆☆

گو کہ راستہ طویل نہیں تھا پھر بھی یہ پہلی بار تھا جب ہانیہ اتنی شدید برف باری کے بعد اتنی دور تک آئی تھی۔ اتنا ڈھکا ہوا ہونے کے باوجود اسے سردی لگ رہی تھی۔ ایک سے ڈیڑھ میل کے راستے میں وہ دو مرتبہ چائے پینے کے لیے رکی تھی۔ سلمان جانتا تھا سردی اور تھکن اپنی جگہ، یہ سب ہانیہ کے لیے ایک انجوائے منٹ تھی۔ وہ اس مختصر سفر کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے کچھ سوچا ہوا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اوپر والے نے کچھ اور طے کر رکھا تھا۔ دھیمی رفتار میں چلتے رکتے وہ ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک تو برف پڑنا شروع ہو گئی تھی، دوسرا ہانیہ کے اپنے ہی شوق تھے۔
''میں یہاں اس ٹیلے کے پاس کھڑی ہوتی ہوں، ایک اچھی سی تصویر بنا دیں پلیز۔''
''یہ ٹھیک نہیں آئی۔ ایک اور بنا دیں۔''
''میرا منہ اتنا بڑا آیا ہے اور بیک گراؤنڈ تو نظر ہی نہیں آ رہا۔''
''اب اس تصویر میں صرف میں نہیں ہوں اور سب کچھ ہے۔ کسی کو کیا پتا یہ میں ہوں یا کوئی اور ہے۔''
وہ ہر تصویر میں نقص نکال رہی تھی۔ ''اب روز روز تھوڑی ایسے موقع ملتا ہے۔''
''ابھی ہم نے واپس بھی جانا ہے۔ اندھیرا بڑھ جائے گا اور اگر برف باری اسی طرح ہوتی رہی تو ہم آج واپس نہیں جا سکیں گے۔'' اس نے دیانت داری سے اسے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ اسے محض ایک ڈراوا سمجھ رہی تھی۔
ہوٹل پہنچ کر تو ہانیہ حیران رہ گئی۔ اس سفید رنگ کی چھوٹی سی خوب صورت عمارت میں موجود چار پانچ لوگ بڑے تپاک سے آ کر سلمان سے ملے تھے۔
''آپ یہاں آرام کریں، تھوڑا کام ہے۔ میں نمٹا کر جلدی آجاؤں گا پھر واپسی کے لیے نکلیں گے۔''
اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ کمرے میں ایک چھوٹا سا خوب صورت آتش دان تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑیوں کے جلنے کی

آواز اور لکڑی کی مخصوص خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ کمرے میں مجموعی طور پر فرنیچر کے نام پر ایک بیڈ، دو کرسیاں اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی الماری اور ایک میز موجود تھی۔

اوپر تلے پہنے ہوئے کپڑے ایک ایک کر کے اتارتے اس نے کرسی پر ڈھیر کیے اور سکون کی سانس لی۔ کمرے کی دو دیواروں پر کھڑکیاں تھیں۔ اس نے اٹھ کر ایک کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا۔ تا حد نگاہ برف پوش نظارے جیسے کسی مقدس حکم کی تعمیل میں کھڑے تھے۔ آسمان سے برف کے پھول برس رہے تھے۔ اس منظر کا حصہ کچھ دیر پہلے وہ خود بھی تھی مگر اس پُر حدت کمرے میں کھڑے ہو کر یہ منظر اور طرح سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ بستر پر جا بیٹھی کہ پیروں میں درد ہو رہا تھا۔ جوتا اتار کر اس نے پیر اوپر کیے اور جرابیں اتار کر پیر دبانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جائیں۔" اس نے آواز لگائی۔

ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جو اس نے ہانیہ کے اشارے پر لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"شکریہ۔" اس نے کہا تو وہ شرما کر واپس بھاگ گیا۔

اخروٹ کا ذائقہ دار حلوہ اور کشمیری چائے دیکھ کر اسے بھوک کا احساس بہت شدت سے ہوا۔ بنا جھجکے اس نے سیر ہو کر حلوہ کھایا اور چائے پی کر سلمان کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ کافی دیر تک نہیں آیا تو وہ باہر نکل آئی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ کہیں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ باہر آ گئی۔ استقبالی کاؤنٹر بھی ویران تھا۔ وہ حیران تھی کہ سب چلے کہاں گئے۔ گرتی ہوئی برف پر نظر پڑتے ہی سر جھٹک کر لکڑی کے زینے پر پیر رکھے وہ نیچے اترنے لگی۔ ایک بار پھر گردن گھما کر اس نے ارد گرد دیکھا۔ بے دھیانی میں اس کا پاؤں برف پر پڑا اور وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پھسل کر دور جا گری۔ برف پر پڑے شل ہوتے وجود کے ساتھ اس نے راہداری کے سرے پر اسی لڑکے کو دیکھا جو اسے حلوہ اور چائے دینے آیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی کمرے میں تھی، جہاں سلمان اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ جانے کس نے اسے اٹھا کر یہاں لا کر لٹایا تھا۔ لحاف سرکا کر اس نے دیکھا تو ایک رجسٹر گود میں رکھ کر کچھ لکھتے ہوئے وہ قریب ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہانیہ کو لگا وہ اسے ڈانٹے گا، اس لیے خود کو ڈانٹ کے لیے تیار کرتی وہ کچھ نہیں بولی۔

"شکر ہے آپ اٹھیں تو...... مجھے پریشان کر دیا تھا آپ نے۔" رجسٹر اور پین میز پر رکھ کر اس نے کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے قریب کی۔

"سوری...... میں بس آپ کو دیکھنے گئی تھی۔"

"آر یو شیور؟" شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بولا تو ہانیہ نظر چرا گئی۔

"اتنی دیر سے تو کمرے میں اکیلی بور ہو رہی تھی۔"

"او کے' اگین مائی فالٹ۔ اب آپ جلدی سے بستر چھوڑیں، واپسی کے لیے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔" کہہ کر اس نے دوبارہ رجسٹر اٹھا لیا اور ہانیہ لحاف اتار کر بیڈ سے اترنے لگی۔

"آؤچ۔"

"اب کیا ہوا؟"

"میرے پاؤں میں درد ہے۔ مجھ سے نیچے نہیں اترا جا رہا۔"

اس کی بات پر وہ فکر مندی سے اٹھ کر پیروں کی طرف جا کھڑا ہوا۔

"کون سا پاؤں؟"

"دایاں۔"

"اچھا، میں دیکھتا ہوں۔"

سلمان کی انگلیاں اس کا پیر ٹٹول رہی تھیں۔

"آپ ہمت کر کے اٹھ کر بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد وہ بمشکل خود کو گھسیٹ کر

بیٹھنے کے قابل ہوئی تھی۔ وہ واپس آیا تو ہاتھ میں جست کی رکابی اور ایک پٹی تھی۔

"ہلکا سا درد ہوگا اور پھر تھوڑی دیر میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس کے پاؤں کو پکڑ کر وہ کرسی قریب رکھ کر بیٹھا اور نرمی سے پاؤں سہلاتے ایک دم اسے موڑ دیا۔ ہانیہ کی چیخ بے ساختہ تھی اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھا۔ بالکل مطمئن انداز میں اس نے جست کی رکابی سے نیم گرم مادہ اٹھا کر اس کے پاؤں پر لیپ کیا اور پٹی باندھ دی۔ ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جن سے صرف نظر کرنے کے لیے اس نے غلطی سے بھی سر نہیں اٹھایا تھا۔

"صبح تک آپ بالکل ٹھیک چلنے پھرنے لگیں گی۔" رکابی اٹھا کر وہ دروازے کی سمت بڑھا۔

"اور ہم اب گھر کیسے جائیں گے؟"

"میں نے بادشاہ خان سے کہا ہے، یہاں کسی سے خچر منگوا دے۔ وہ لے آئے تو آسانی سے چلے جائیں گے۔"

کس قدر پتھر دل اور کٹھور شخص تھا وہ۔ بظاہر نرم خو اور مہذب۔ ہانیہ کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ فوراً واپس آ گیا۔

"اگر ارادہ ہے تو اسنو مین بنائیں؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو ہانیہ اس پیش کش پر اچھل پڑتی مگر یہاں تو ہلنا دشوار تھا۔

"یہاں کمرے میں تو اسنو مین بننے سے رہا۔"

"آپ حکم کریں، یہاں بن جائے گا۔"

"نہیں...... کوئی ضرورت نہیں۔ بس جب آپ کا بادشاہ خان خچر لے آئے تو بتائیے گا۔ مجھے واپس جانا ہے۔" خود ساختہ ناراضی تھی پھر بھی وہ قابو نہیں رکھ پا رہی تھی اپنے موڈ پر۔

اب سلمان اسے کیا بتاتا کہ انہیں رات یہیں گزارنی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ برف پڑ رہی تھی۔ صبح سے پہلے کوئی خچر نہیں آنے والا تھا۔ اسی لیے وہ باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔

"آپ یہ پہنیں، میں آتا ہوں۔" کرسی پر پڑی اس کی جرسیاں، دستانے اور شال مفلر وغیرہ اس کے پاس رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔

بے حد خراب موڈ کے ساتھ اس نے ایک ایک شے پہننا شروع کی۔ سلمان کے رویے نے اسے بری طرح ہرٹ کیا تھا اگر وہ گھر میں ہوتی تو ممی پاپا اس وقت ایمر جنسی نافذ کر چکے ہوتے۔ بڑے ابا اور بڑی امی بھی اس کا اتنا خیال رکھتے تھے اور یہاں اسے اتنی زیادہ تکلیف تھی مگر اگلے بندے کو ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ آنسوؤں کا گولہ پھر سے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

"چلیں۔" کمرے میں داخل ہوتے اس نے آواز دی تو ہانیہ نے امڈ آنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے واپس دھکیلا۔

"میں چل نہیں سکوں گی۔" آنکھوں سے آنسو حلق میں گر کر آواز نم کر گئے تھے۔

"میں...... سہارا دوں؟"

آنسو پیتے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

آگے بڑھ کر سلمان نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور باہر لے آیا۔ اسے حیرت ہوئی جب باہر اسے کوئی بادشاہ خان یا خچر دکھائی نہیں دیا۔ اس کے بجائے آگ کا دہکتا الاؤ تھا جس کے سامنے چوبی کرسی پڑی تھی۔ اسے لے جا کر سلمان نے اسی کرسی پر احتیاط سے بٹھا دیا۔

"اب آپ بالکل نہیں روئیں گی۔" اس کے چہرے پر جھک کر نرمی سے کہتے وہ پیچھے ہو گیا۔ ہانیہ کی رکی سانس بحال ہوئی۔

"آج ہمیں یہیں رکنا پڑے گا۔ رات کے کھانے کے لیے مارخور کا گوشت دستیاب ہے اور وہ سوپ جو ہم لے کر آئے ہیں۔"

"بڑے ابا سے بات کروائیں میری۔" کھانے کی بات نظر انداز کرتی وہ بے صبری سے گویا ہوئی۔

"نیٹ ورک جا چکا ہے۔ رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ اعتبار رکھیں آپ کو بالکل صحیح سلامت لے کر جاؤں گا،

اگر خود سے عقل نہیں لڑائیں گی۔" اس کا مزاح بھی ہانیہ کو طنز لگتا، اگر وہ دھیان دیتی۔ اس وقت تو اس کا دھیان بڑے ابا اور بڑی امی کی طرف تھا۔

"وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"میری آپ کی عمر سے کہیں زیادہ ان کا تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں موسم کیسے آنکھیں بدل لیتا ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔" وہ کہہ نہیں سکا کہ اسے سلمان کے ساتھ بھیجنے کا مقصد یہی تو تھا کہ وہ ان برف زاروں میں بسنے والے اس لڑکے کے دل سے حرارت مستعار لے کر اپنے دل میں چاہ کی آتش بھڑکا لے۔

"کھانا لے کر آؤں؟"

"نہیں، میں نے حلوہ کافی زیادہ کھا لیا تھا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"ویسے آپ یہاں کرنے کیا آئے تھے؟" رات طویل تھی۔ گزارنی تو تھی۔ اسی لیے ہانیہ نے بات شروع کی کہ شاید ایسے رات مختصر ہو جائے۔

"کچھ حساب کتاب دیکھنے تھے۔" مبہم جواب پر وہ چڑ گئی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ایسے انٹرویو لینے کا، بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا مگر آپ تو جیسے لڑکیوں کی طرح پردوں میں چھپے جا رہے ہیں۔"

وہ مسکرایا۔

"میرے بابا کا ہوٹل تھا یہ۔ میرا بھائی شہ روز اور چھوٹی بہن فاطمہ، امو جان...... ہم خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ سب کچھ نہیں مگر پھر بھی بہت کچھ تھا ہمارے پاس۔ میں ایک دن کچھ سازو سامان لینے وادی گیا ہوا تھا بادشاہ خان کے ساتھ۔ برف کا تودا گرا اور ہمارے واپس آنے تک کچھ نہیں بچا۔ تب سے ہوٹل بادشاہ خان دیکھتا ہے۔ وہ سادہ آدمی ہر چھوٹے بڑے حساب کے لیے میرے پاس بھاگا چلا آتا ہے۔ میں بھی اس کی تسلی کے لیے سرسری نظر مار لیتا ہوں۔ ویسے ہوتا میں یہیں پر ہوں مگر آج کل سیاح نہیں آتے تو کام سب بند پڑا ہوتا ہے۔ پھر میں بھی نہیں آتا، آج بھی بس بلاوے پر آ گیا تھا۔"

اس کے تفصیلی جواب پر ہانیہ کی تشفی ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ الٹا اداسی اور شرمندگی میں گھر گئی۔

"آئم سو سوری۔"

"کیا میں نے آپ کو بتایا، آپ سوری کہتے بالکل اچھی نہیں لگتیں؟" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر ہانیہ پورے دل سے ہنسی تھی۔

اس رات وہ دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ باہر بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی مگر اس نے سلمان سے کہا نہیں کیونکہ اندر جانے کا وہی طریقہ ہو سکتا تھا جیسے وہ باہر آئی تھی۔ اس کے کہے بغیر محض اس کے چہرے سے تکان بھانپ کر وہ ویسے ہی اسے اٹھا کر اندر لے گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور پھر ہانیہ کو سونے کی تاکید کر کے وہ کرسی آتش دان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

"آپ نہیں سوئیں گے؟"

"نیند بشری ضرورت ہے۔ اس سے انکار کیسے ہے؟ آپ سو جائیں تاکہ صبح وقت پر نکل سکیں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو میں یہیں موجود ہوں۔" بھاری ہوتے پپوٹوں نے سارے منظر تاریک کر دیے اور وہ نیند کی پرسکون آغوش سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

صبح جب ہانیہ نے پٹی اُتروائی تو درد جیسے غائب ہو چکا تھا۔ ایک ہلکا سا احساس تھا باقی سب ٹھیک تھا۔ اس کے باوجود سلمان اسے پیدل واپس لے جانے پر راضی نہیں ہوا۔ بادشاہ خان نے خچر منگوا دیا تھا جس پر ایک طرح سے زبردستی اسے بٹھایا گیا تھا۔ ناشتا اس نے غصے میں نہیں کیا تھا۔

گھر پہنچے تو وہ بے تابی سے مگر قدرے احتیاط سے پاؤں رکھتے اندر پہنچی۔

"بڑے ابا!" وہ بھاگ کر ان کے گلے لگی، یہ دیکھے بغیر کہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔

"بہت پریشان ہو گئی تھی میں، سب خیر تھی؟"

بڑی امی نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"خیر ہی خیر تھی۔ پوچھیں ذرا کتنا مزا کیا ہے۔ اب وادی یا برف باری سے کوئی گلہ نہیں رہا ہوگا۔" اندر داخل ہوتے سلمان نے سلام کے بعد بڑی امی کی بات کا جواب دیا تھا۔

"بیٹا! سعد آیا ہوا ہے رات سے۔" بڑی امی کی بات پر وہ بے یقینی سے پیچھے ہوئی۔

"سچ بڑی امی! کہاں ہے؟"

اس کے استفسار پر انہوں نے سعد کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے، تم سچ میں آئے ہو۔ ورنہ میرے خیال میں تم وہ آخری شخص ہوتے جس کی میں یہاں توقع کر سکتی تھی۔" اٹھ کر بے تکلفی سے کہتے اس نے سعد سے مصافحہ کیا۔ سلمان دروازے کی عین درمیان میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

"جانتا ہوں، مگر دیکھ لو میں نے تمہاری توقعات کو پورا نہیں ہونے دیا ناں۔" اس کا بظاہر مسکراتا چہرہ سلمان کو جانے کیوں سُلگا سُلگا لگ رہا تھا۔

"سلمان! یہ میرے منگیتر سعد ہیں اور سعد! یہ بڑے ابا کے پڑوسی ہیں۔"

جانے اس طرف نظر اٹھتے ہی سعد کو کیوں کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے بیچ میں کھڑی ہانیہ کو پہلی بار کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم لوگوں نے تو رات واپس آنا تھا پھر آئے کیوں نہیں؟" سعد کے سامنے اس سوال کا جواب کم از کم سلمان کے لیے بڑا بھاری تھا۔ مختصراً اس نے ہانیہ کے گرنے کا بتایا اور رخصت لے کر باہر نکلنے لگا۔

"ناشتا تو کر لیں۔" ہانیہ جانتی تھی، ناشتا اس نے بھی نہیں کیا۔ جبکہ سعد کو ہانیہ کا سلمان کے لیے ایسے فکر مند ہونا ایک آنکھ نہیں بھایا۔

"مجھے کچھ کام ہے، ان شاء اللہ پھر سہی۔" وہ چلا گیا تو ہانیہ بڑی امی کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"میں ناشتے کو دیکھوں ورنہ گل منہ دوپہر کو ہی ناشتا سجائے گی۔" بڑی امی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

"میں ذرا باہر سے برف ہٹواؤں۔" بڑے ابا بھی پیچھے نکل گئے۔

"اور تم اتنی اچانک، بنا بتائے۔"

"مما رمشہ کی منگنی کرنے والی ہیں اس جمعے۔ وہ چاہ رہی تھیں ان کی ہونے والی بہو بھی شرکت کرے تو میں نے سوچا میں تمہیں لینے آ کر سرپرائز کر دیتا ہوں مگر تم نے مجھے ہی سرپرائز کر دیا۔"

اس کی منگیتر کسی اور شخص کے ساتھ ایک رات باہر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جتا گیا۔

ہانیہ نے اس کا جتانا محسوس ہی نہیں کیا۔ الٹا وہ تو یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ سعد اسے واپس لینے آیا ہے۔ گو کہ اسے یقین تھا سعد بڑے ابا اور بڑی امی کو آنے کی وجہ بتا چکا ہوگا پھر بھی اس نے ان کے سامنے سعد سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اسے اوپر کمرہ دکھانے کے بہانے لے گئی۔

"سعد! میں ابھی واپس نہیں جانا چاہتی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے بڑے ابا اور بڑی امی یہاں کتنے اکیلے ہیں۔ میں یہاں رکوں گی تو ممی ماموؤں پر دباؤ ڈالیں گی، کوئی نہ کوئی تو ان کے پاس آ ہی جائے گا۔"

اس کے برابر بیٹھی وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ سمجھ بھی رہا تھا مگر وہ جو سمجھ رہا تھا ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ اسے لیے بغیر واپس چلا گیا تو بڑے ابا پھول کی طرح کھل گئے۔ جبکہ سلمان ان سے اس بات پر ناراض تھا کہ انہوں نے سلمان سے ہانیہ کی منگنی کا چھپایا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس منگنی کے بارے میں نہ جانتے ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے ہانیہ کے ساتھ کا خواب دکھایا تھا۔ اسی ناراضی میں وہ دن بھر ان کی طرف نہیں آیا۔ اگلے دن بھی وہ بنا ملے ہوٹل چلا گیا۔ شام کو بڑے ابا نے ہانیہ کو اسے بلانے بھیجا۔

آج موسم خوش گوار تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور سورج چودھویں کے چاند کی طرح ٹھنڈی دھوپ

پھیلا رہا تھا۔ ہانیہ نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ سلمان اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکا اور پھر فوراً اندر مڑ گیا۔ ہانیہ اس کے پیچھے اندر آ گئی۔

''بڑے ابا بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''میں مصروف ہوں، جلد لگاؤں گا چکر۔''

گو کہ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ ہانیہ آئی ہے پھر بھی اسے غصہ تھا یہی غصہ اس کا لہجہ روکھا کر گیا۔ جسے ہانیہ نے بہت محسوس کیا۔

''آپ ناراض کس بات پر ہیں؟'' سینے پر بازو لپیٹے وہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ سے نہیں، آپ کے بڑے ابا سے ناراض ہوں اور وجہ وہ جانتے ہیں۔'' بلاتردد وہ مان گیا تھا کہ وہ ناراض ہے۔

''تو پھر غصہ انہیں دکھائیے گا، ویسے آپ کے ہاں رواج نہیں گھر آئی کسی لڑکی کو بٹھانے کا۔''

اس کے لطیف طنز پر وہ مسکرایا۔

''سوری...... بیٹھیں آپ۔''

''آپ ہنستے ہوئے بہت کیوٹ لگتے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے آپ کو بتایا؟'' صوفے پر بیٹھنے سے قبل وہ اس کی طرف مڑی اور ذرا ردوبدل کے ساتھ اس کے الفاظ لوٹائے تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھا۔

''اپنے منگیتر کو بھی لے آتیں۔'' کسی خیال کے تحت اس نے کہا۔

''ضرور لے کر آتی، اگر وہ یہاں ہوتا۔ وہ کل ہی واپس چلا گیا تھا۔''

''آپ سے ملنے آیا ہوگا۔''

''نہیں، وہ مجھے لینے آیا تھا مگر میں ابھی یہاں رکنا چاہتی ہوں۔''

سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مختصر مدت کی قربت کے لیے خوش ہو یا افسردہ۔

''آ جائیں پھر...... میں چلوں۔''

''ایک کپ چائے پی لیں ورنہ میں کیسے یقین دلاؤں گا کہ ہم بہت مہمان نواز ہیں۔''

''جتنی جانفشانی سے آپ کھانا بناتے ہیں، مجھے دل و جان سے یقین ہے۔ چلیں ادھر چل کر پیتے ہیں چائے۔''

اس نے باہر کا رخ کیا تو سلمان اس کے پیچھے آئے بنا نہیں رہ سکا۔ باہر کھڑی گاڑی دیکھ کر ہانیہ کا خون خشک ہو گیا۔ داؤد بھائی یقیناً اسے لینے ہی آئے تھے۔ مرے مرے قدموں سے چلتی وہ اندر گئی۔

''چلو ہانی! بیگ پکڑو، نکلنے کی کرو بس۔'' اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد داؤد بھائی نے پہلی بات ہی یہ کی تھی۔

''مگر بھائی......''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ گھڑی دیکھو، پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس۔''

پندرہ منٹ میں کیا ہو سکتا تھا۔ بے دلی سے دو چار چیزیں بیگ میں ٹھونس کر منہ پھلائے وہ ان کے ساتھ واپسی کے لیے چل دی۔

بڑے ابا، بڑی امی اور سلمان چپ چاپ اسے جاتے ہوئے دیکھنے کے علاوہ کیا کر سکتے تھے۔

☆☆☆

''یہ کیا بچپنا ہے ہانیہ! سعد اتنے دل سے تمہیں لینے گیا تھا اور تم نے اس کے ساتھ آنا گوارا نہیں کیا۔ پتا ہے واپسی پر وہ کتنا بجھا ہوا تھا۔'' توقع کے عین مطابق ممی ان کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

''داؤد بھائی نے کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔''

''میں نے کہا تھا راستے میں کھانے کا۔ انکار تم نے خود ہی کیا تھا۔'' باہر سے آتے داؤد نے اپنی پوزیشن کلیئر کی۔

''اچھا، میں دیکھتی ہوں کچن میں۔ اب اس وقت کیا منگوا کر دوں۔''

ممی کے جانے کے بعد وہ تھکن اور بے زاری سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ فی الحال تو ممی کی کلاس سے بچ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی ممی بھولیں گی نہیں اور پھر کسی وقت یہ پروگرام یہیں سے شروع ہوگا۔ اسے سعد پر بھی غصہ تھا جو اس کی اتنی سی بات نہیں مان سکا

تھا اور فوراً امی کو شکایت لگادی تھی۔ موڈ خراب ہونے کے باوجود بھوک بہت شدید لگی تھی سو اس نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بار بار نظروں کے سامنے بڑے ابا اور بڑی امی کی التجا کرتی آنکھیں آرہی تھیں۔

"میں پوری کوشش کروں گی، آپ کے گھر کی رونقیں لوٹا سکوں۔" دل ہی دل میں ان سے عہد کرتی وہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ فون بج اٹھا۔

"سعد کالنگ" دیکھ کر اس نے فون سائلنٹ پر کر کے رکھا اور آرام سے سوگئی۔

☆☆☆

"اور پھر خوب مزے کیے وادی میں۔" وہ دیر سے سوکر اٹھی تھی اور اب ناشتے کے لیے آئی تھی کہ ارسل آگیا۔

"ہاں تو اور کیا۔ بہت مزا آیا مجھے۔"

"بس کرو، جھوٹ بس کرو۔ جیسے میں تو بڑے ابا کو جانتا نہیں۔ گھر سے نکلنے بھی نہیں دیا ہوگا۔"

"تو کس نے کہا گھر میں مزے نہیں ہو سکتے؟ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتاتی چلوں، میں گھر سے باہر بھی گئی تھی اور دور تک گئی تھی۔ وہ بھی بڑے ابا کے بغیر۔" اس کی نہایت سکون سے دی گئی اطلاع سعد نے لفظ بہ لفظ سنی تھی۔

"اس بات کا گواہ تو میں بھی ہوں۔"

سعد کی طنزیہ آواز پر اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ بڑے ناقابل فہم قسم کے تاثرات تھے۔ ہانیہ کے ابرو تن گئے۔ ارسل چپ چاپ منظر سے ہٹ گیا۔

"تم رات فون نہیں اٹھا رہی تھیں جبکہ آنٹی کہہ رہی تھیں، تم جاگ رہی ہو۔" کرسی سنبھال کر وہ عین اس کے سامنے آبیٹھا۔ انداز کسی تفتیشی افسر کا تھا۔ ہانیہ اس سے ویسے ہی ناراض تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ویسے اگر تمہیں بات کرتا سن نہ لیتا تو یہی سمجھتا کہ اپنی زبان تم وہیں چھوڑ آئی ہو۔"

"میں اپنی زبان چھوڑ کر آؤں یا کچھ اور، تمہیں اس سے کیا۔"

"مجھے ہی تو اس سے ہے اور سب کچھ ہے۔ آفٹر آل میری ہونے والی مسز ہو۔"

"ہونے والی ہوں، ہوئی تو نہیں ناں۔" اسے نظر انداز کرتے پیر جھلاتے وہ پہلی بار اپنی ٹیوڈ دکھا رہی تھی۔ اسے بہت غصہ تھا۔ اس نے پہلی بار سعد سے کوئی فیور مانگی تھی اور وہ بھی اس نے جانے کس لہجے میں ممی کو بتایا تھا کہ وہ آتے ہی بگڑ گئیں۔

"ہو جاؤں گی...... یا اس ہونے میں شک ہے؟" اس کی سنجیدگی نے پہلی بار ہانیہ کو صحیح معنوں میں متوجہ کیا تھا۔

"تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ لڑنے کے موڈ سے آئے ہو۔" پوری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے وہ پوچھ رہی تھی۔ جس ہانیہ کو سعد جانتا تھا ہانیہ اس سے بے حد مختلف لگ رہی تھی وہ کچھ کہے بنا اسے گہری نظر سے دیکھتے وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سیاہ ڈیزائنر ملبوس میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ سرخی مائل بال اس نے کل ہی رنگوائے تھے۔ لہروں کی صورت تراشیدہ بال دونوں اطراف کندھوں پر پڑے تھے۔ پارلر سے کروایا میک اپ اس کا روپ نکھار گیا تھا۔ وہ آج آنا نہیں چاہتی تھی لیکن ممی کو ناراض بھی نہیں کرسکتی تھی۔ آج وہ ممی کی مانتی تو کل اپنی منوا سکتی تھی۔ یہی سوچ کر وہ مکمل تیاری سے اس تقریب میں شریک ہوئی تھی۔

منگنی کی یہ تقریب کسی ولیمے سے کم نہیں لگ رہی تھی گو کہ ابھی وبا کے پیش نظر ان ڈور گیدرنگ ممنوع تھی، پھر بھی گھر کے لان میں منعقد یہ تقریب اچھی خاصی بڑی تھی۔ سعد کی ماما کے ساتھ کھڑی وہ کوئی چابی والی گڑیا لگ رہی تھی۔ ہر مہمان کو مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہنا۔ اس کے جبڑوں کے ساتھ ساتھ ٹانگوں میں بھی درد شروع ہوگیا تھا۔

اللہ اللہ کر کے اس کی جان بخشی ہوئی تھی۔ کزنز اور دوستوں کے شور میں وقار نے رمشہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور رمشہ نے وقار کو۔

آتش بازی کا خوب صورت مظاہرہ بھی، ہانیہ کی کوفت کو دور نہیں کر سکا۔ تحائف کے لین دین کے بعد کھانا شروع ہوا تو اسے سعد کی کال آ گئی۔

"کہاں ہو ہانیہ؟"

"میں یہیں لان میں......"

"کہاں؟ مجھے دکھائی نہیں دے رہیں۔"

"میں...... یہاں......"

"اچھا چھوڑو، تم اندر آؤ' میں تمہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔"

ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میز پر واپس رکھتے۔ اس نے ممی کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ کچھ دور میز پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ انہیں بتانے کا ارادہ منسوخ کر کے وہ اندر چلی گئی۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہیں تھا جو وہ اس گھر میں آئی تھی۔ اسی لیے بے جھجک وہ اندر چلی گئی۔

"دیٹس لائک آ گڈ گرل، میں نے سوچا، کیا پتا تمہارا موڈ ابھی تک ٹھیک ہوا کہ نہیں۔"

"نہیں موڈ ٹھیک ہے بس تھک گئی ہوں۔"

"چلو آؤ، تمہیں ریلیکس کرتے ہیں۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس مختصر راہداری میں بنے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ہانیہ کو اس کی چال کچھ لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی جسے فی الوقت اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ، کس بات پر ناراض ہو پریٹی گرل۔" اسے صوفے پر بٹھا کر اس کے قریب بیٹھتے اس نے لو دیتی نظروں سے ہانیہ کو دیکھ کر کہا۔

"ناراض نہیں ہوں۔ بتایا تو ہے تھک گئی ہوں۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔ سعد نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اس کا سارا دھیان اپنے ہاتھوں میں موجود ہانیہ کے ہاتھوں کی طرف تھا۔

خاموشی محسوس کر کے ہانیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ مخمور نگاہوں سے اسے تکتے وہ بڑے جذب سے اس کا ہاتھ تھامے ہوا تھا۔ ہانیہ کو بے چینی محسوس ہونے لگی تو اس نے ہاتھ چھڑوا لیے۔

"باہر چلتے ہیں۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سعد نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ بڑھاتے ہوئے اسے دوبارہ بٹھا لیا۔

"جانتی ہو ہانیہ! تم بہت خوب صورت ہو۔ سب کہتے ہیں میری ہو، اس لیے مجھے اور بھی پیاری ہو۔ مگر جب سے تمہیں اس لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے، مجھے نفرت ہونے لگی ہے تمہاری خوب صورتی سے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں بلا ارادہ ہی......"

اس کی ادھوری بات پر ہانیہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"جس رات تم اس لڑکے کے ساتھ تھیں، میں انگاروں پر لوٹتا رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ہر منظر واضح اور شفاف تھا جب وہ تمہیں......"

"اسٹاپ دس نان سینس پلیز۔ تم اپنے حواس میں نہیں لگ رہے مجھے۔" غصے کی شدت سے کانپتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں ہوں میں اپنے حواس میں۔ اس رات سے میرا چین سکون سب برباد ہو گیا ہے۔ ایک تم ہو جو مجھے سکون دے سکتی ہو۔ پلیز رک جاؤ۔" ہانیہ کا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا رکے یا چلی جائے۔

"مجھے خود پر اختیار دو ہانیہ! مجھے اجازت دو، تمہیں چاہنے کی۔ میں تمہیں سب کچھ بھلا دوں گا۔"

ہانیہ کے دماغ نے الارم بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پہلے اس کے کمرے میں آئی تھی، سعد ہاتھ پکڑ لیتا تھا، مگر ایسے بے اختیار کبھی نہیں ہوا تھا۔

"ممی پریشان ہو رہی ہوں گی، بعد میں بات کرتے ہیں اس بارے میں۔" جتنی تیزی سے وہ باہر کی طرف لپکی اس سے دہری رفتار سے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں ہانیہ! آج نہیں۔ میری محبت میں کوئی دوسرا حق دار بن کر آ جائے' میں یہ برداشت نہیں

کر سکتا۔“

”بہت سن لی تمہاری الزام تراشی۔ اب راستہ دو، مجھے باہر جانا ہے۔“ اس خون کھول اٹھا تھا اس کھلے الزام پر۔

”چلی جانا، اتنی جلدی کیوں ہے۔“

اس کے سامنے کھڑا سرخ آنکھوں سے تکتا سعد واقعی اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ ہانیہ کو کندھوں سے پکڑ کر اس نے پیچھے کی طرف دھکیلا مگر ہانیہ پوری شدت سے اس کے ہاتھ جھٹکتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ طیش میں آ کر اس نے ہانیہ کو کمر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مگر اس کے ہاتھ میں ہانیہ کی قمیص کا دامن آ گیا۔ جتنے زور سے اس نے کھینچا تھا مہین کپڑا ایک لمحے میں دو لخت ہو گیا۔ ہانیہ نے بے یقینی سے اس کے ہاتھ میں اپنے ملبوس کا پھٹا ہوا ٹکڑا دیکھا۔ اسے وقت دیے بغیر سعد نے اسے اپنی سمت کھینچا۔ ہانیہ کا ہاتھ اٹھا اور سعد کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔

”یو بچ......“ اپنے پیچھے اس نے سعد کو چلاتے سنا مگر اسے پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

”ہانیہ! ویسے حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔ رات ایک تو تم بنا بتائے گاڑی لے آئیں اور دوسرا کسی سے مل کر بھی نہیں آئیں۔ مومنہ کیا سوچتی ہو گی تمہارے بارے میں۔“ وہ ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی، جب ممی فون پر بات کرتی ہوئی ادھر آ نکلیں۔ فون بند ہوا تو اس کی شامت شروع ہو گئی۔

”ممی! تھک گئی تھی سچ میں۔ بہت طبیعت خراب ہو رہی تھی۔“ اس کا دل نہیں چاہا انہیں کچھ بتانے اور گزری رات کے بارے میں سوچنے کا۔

ممی نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ سوجی ہوئی آنکھیں۔ ستا ہوا چہرہ وہ واقعی بیمار لگ رہی تھی۔

”اب ٹھیک ہو؟ رات بتا دیا ہوتا تو کوئی میڈیسن دے دیتی۔“ وہ پاس بیٹھیں۔

”آئم فائن ناؤ یو ڈونٹ وری پلیز۔“ اس نے مسکرا کر ان کی فکر کم کرنی چاہیے۔

”آر یو شور؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اوہ ہاں سعد کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا ہانیہ فون نہیں اٹھا رہی۔ شام کو تیار رہنا رمشہ اور وقار کو پارٹی دے رہا ہے تمہیں لینے آئے گا۔“

”منع کر دیں ممی ابھی خود کو فٹ محسوس نہیں کر رہی“ اس نے فوراً بیانیہ بدلا۔

”تھوڑی دیر ہو آتیں دل بہل جائے گا۔“

”نو ممی...... پلیز۔“ اس نے بے چارگی سے کہا تو وہ فوراً مان گئیں۔

”اچھا میں کہہ دوں گی اسے۔ تم کوئی میڈیسن لو جا کر۔“

”لے لوں گی۔“ ان کی گود میں سر رکھ کر وہ پرسکون ہو کر لیٹ گئی۔

”ممی!“

”ہوں۔“ اپنے فون کی اسکرین پر انگلیاں پھیرتے انہوں نے مختصر رد عمل دیا۔

”اب کی بار میں نے زیادہ دن رہنا تھا مگر داؤد بھائی لے آئے۔“ ممی سمجھ گئی تھیں، وہ کہاں کی بات کر رہی ہے۔

”تمہیں تو ہر بار زیادہ دن رہنا ہوتا ہے۔“

”ممی! بڑی امی اور بڑے ابا بہت اکیلے ہیں وہاں۔“ آنکھیں موندے وہ انہیں اکیلا دیکھ رہی تھی۔

”تو یہ ان کی اپنی چوائس ہے۔ وہ وادی چھوڑنا نہیں چاہتے ورنہ تمہارے ماموؤں نے کتنا زور دیا تھا کہ ان کے ساتھ چلے جائیں۔“ وہ ابھی ابھی فون پر مصروف تھیں۔

”ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیا؟“

”اگر وہ یہاں آ جائیں تو تمہارے پاپا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”ممی! میں وہاں ان کے پاس رہ جاؤں؟“ بڑے غلط وقت پر ان کے فون کی بیل بجی تھی۔

اس کے بعد کئی بار اس نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ٹھیک طرح سے اپنی بات سمجھا نہیں پارہی تھی۔ اصل میں جو شے اس نے خود محسوس کی تھی وہ کسی دوسرے کو محسوس نہیں کروا پارہی تھی۔

اسے واپس آئے دو ماہ ہو چلے تھے اور اب تک وہ کسی کو اپنا نقطہ نظر نہیں سمجھا سکی تھی۔

ممی کو شروع میں لگا کہ ابھی وہ وہاں سے ہو کر آئی ہے شاید اسی لیے سر پر اتنا سوار کیا ہوا ہے مگر اب انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ خلل وقتی نہیں جب سے وہ آئی تھی جیسے بدل گئی تھی۔ سعد کے ساتھ گھومنا پھرنا بالکل ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے غور تو کیا تھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ جب اپنے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں تو کسی کی ذاتیات میں بھی دخل اندازی نہیں کرتی تھیں پھر چاہے وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ مگر صرف ایک حد تک۔ اس روز ہانیہ اپنے کمرے میں تھی۔ دروازے پر دستک دیے بغیر ممی اس کے کمرے میں آگئیں۔

"سعد کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" ہانیہ کو اتنی سیدھی بات کی توقع نہیں تھی پھر وہ بھی بات گھمانا نہیں چاہتی تھی۔

"جی...... بس چھوٹی سی بات ہے۔"

"آج رات تم اس کے ساتھ ڈنر پر جارہی ہو۔ اپنے معاملات سیدھے کرو۔ داؤد کی منگنی پر میں تم دونوں کی شادی اناؤنس کرنے والی ہوں۔"

"مگر ممی! میری غلطی نہیں ہے اسے چاہیے تھا مجھ سے......"

"ہانیہ! میں نے تم سے ڈیٹیل نہیں مانگی، غلطی جس کی بھی ہے، رشتہ تم دونوں کا ہے۔ تم دونوں کی برابر کی ذمہ داری ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا شروعات کس نے کی مگر دونوں کو اس پر ورک آؤٹ کرنے کی ضرورت ہے۔" اس کی بات کاٹ کر انہوں نے اپنی زندگی کا فلسفہ اس پر نافذ کیا۔

"اس بار نہیں ممی! اگر اسے رشتہ چاہیے تو اسے خود مجھ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ اپنی غلطی مانے پھر ہم مزید بات کریں گے۔"

"کیا مطلب...... اگر اسے یہ رشتہ چاہیے؟ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہ رہی ممی! بس میں کہیں نہیں جارہی اور آپ مجھ پر کوئی فیصلہ نہیں تھوپیں گی۔ پھر چاہے وہ سعد کے ساتھ کہیں باہر جانے کا ہو یا اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا۔"

اپنی کہہ کر ان کی سنے بغیر وہ تیزی سے کمرے سے نکلی تھی۔

کچھ وقت تنہائی درکار تھی اس لیے نظر بچا کر وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ ایک وہ سعد دل میں گند بھرا بیٹھا تھا اور یہاں ممی اسے تمام حالات کی ذمہ دار سمجھ رہی تھیں۔ اس کا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے معاملات اتنے خراب ہو سکتے ہیں۔ اس نے کیا برا کیا تھا یا سوچا تھا۔ وہ تو بس بڑے ابا کی بات سن کر جذباتی ہو گئی تھی۔

بڑے ابا کا خیال آتے ہی بڑی شدت سے ان سے بات کرنے کی خواہش جاگی۔ اس نے لینڈ لائن سے ہی ان کا نمبر ملالیا کہ اس کا فون تو کمرے میں تھا۔ دوسری تیسری بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

☆☆☆

ہانیہ کیا گئی تھی لگتا تھا ساری رونقیں چلی گئی ہیں۔ پہلے اس کے جاگنے کا انتظار ہوتا تھا کہ کب وہ اٹھے اور ناشتے کی میز سجے مگر اب زندگی پھر پہلے جیسی بے رنگ ہو گئی تھی۔ شاید پہلے سے بھی زیادہ۔

انہوں نے تو کوشش کی تھی کہ یہ خوش رنگ تتلی ان کی مٹھی میں آجائے اور ان کا بڑھاپا خوب صورت اختتام تک پہنچا دے مگر قسمت کو منظور ہی نہیں تھا۔ ہانیہ کے جانے کے تین چار دن بعد سلمان نے بھی ان سے شکوہ کیا تھا۔

"آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"تو منگنی نکاح کا تھوڑی ہے۔"

"جو بھی ہے رشتہ تو رشتہ ہوتا ہے۔ ایک رشتہ توڑ کر دوسرا جوڑنا مشکل ہوتا ہے اور اگر مجھے پتا ہوتا۔"

"اگر تمہیں پتا ہوتا تب بھی تم دل کو اس چاہنے سے روک نہیں سکتے تھے۔" یہاں وہ چپ کر گیا۔ وہ جانتا تھا سچ یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کب کا اسے بھلا چکا ہوتا۔ مگر وہ جانتا تھا اس کا اختیار ہی نہیں تھا۔ خود پر۔ وہ آج بھی اتنا ہی بے بس تھا جتنا کہ پچھلے سالوں میں۔

بات تھی چار سال پہلے کی وہ ہوٹل جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ کچھ سامان بادشاہ خان نے لانے کا کہا تھا جو گزری رات وہ خرید لایا تھا۔ وہی پہنچانا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ حسب روایت موسم کی پہلی برف باری کے بعد وادی اور اس کے نواح میں برف کی پتلی سی تہہ بچھ چکی تھی۔ اس نے کچھ دور کھڑی دو لڑکیوں کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے دوسری سمت تھے اس لیے وہ دیکھ نہیں پایا۔ ان میں سے ایک لڑکی نے دونوں ہاتھوں کا دائرہ بنا کر ہونٹوں کے گرد رکھا اور پہاڑوں کی طرف منہ کر کے چلائی۔

"مجھے تم سے عشق تھا۔" آواز پلٹ کر آئی تو وہ پہلے سے زیادہ پرجوش ہو کر چلائی۔ "مجھے تم سے عشق ہے۔"

تب اسے شرارت سوجھی اور پیڑ کے تنے کے پیچھے چھپ کر اس نے بھی اس لڑکی کی طرح صدا دی۔ "مجھے تم سے عشق ہے۔"

دونوں لڑکیوں نے چونک کر ارد گرد دیکھا۔

"مجھے تم سے مرتے دم تک عشق رہے گا۔" اس کے کہے الفاظ سلمان نے بھی دہرائے۔ وہ یقیناً آواز کے اس طرح پلٹنے پر حیران تھیں۔ وہ سنجیدگی چہرے پر طاری کر کے پیڑ کی اوٹ سے نکلا اور اپنے راستے ہو لیا۔ وہ راستہ جس پر وہ دونوں موجود تھیں۔ سلمان نے دیکھا۔ ایک تو ساتھ والوں کی منال تھی اور دوسری کو وہ نہیں جانتا تھا۔

"اتنی صبح صبح یہاں کیا کر رہی ہو؟" پاس سے گزرتے وہ چند ثانیے ان کے قریب ٹھہر گیا۔

"تم بھی تو اتنی صبح نکلے ہو۔ میں نے تو نہیں پوچھا۔" منال صبح صبح اٹھائے جانے سے چڑی ہوئی تھی۔

"میں تو ہوٹل جا رہا ہوں کچھ سامان پہنچانا ہے۔"

"تو جاؤ پھر، یہاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔" وہ سچ مچ بہت خفا ہو رہی تھی۔ دوسری لڑکی نے نہ ان کی طرف دیکھا تھا نہ ہی ان سے کچھ کہا۔ بڑی بے نیازی تھی اس کے انداز میں، وہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اسی رات ابوذر اس کے پاس آیا۔

"نازنین پھوپھو آئی ہوئی ہیں۔ ہم باربی کیو کا پلان بنا رہے ہیں تم بھی آ جانا۔"

وہ جانتا تھا یہ دعوت نامہ محض دوستی کی خاطر نہیں تھا۔ بابا کے ہوٹل کی مچھلی بہت خاص تھی۔ جب بھی پاس پڑوس میں یار دوستوں کا موڈ ہوتا وہ اسے ضرور بلاتے تھے۔ بلاچوں چراں کیے وہ کھانا بنانے کی ذمہ داری سنبھال لیتا تھا۔ اب بھی اس نے ہامی بھر لی تھی۔ اس رات منال، کنزہ، ابوذر اور زین اس کے مددگار بنے ہوئے تھے جبکہ باقی کی عوام صرف کھانے میں مدد کر رہی تھی۔ اس وسیع چھت پر ایک طرف وہ انگیٹھیاں سلگائے بیٹھے تھے اور دوسری طرف خاصے فاصلے پر باقی سب بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بار بار سلمان کی نظر اس لڑکی پر جا ٹھہرتی تھی۔ دو بار اس کا ہاتھ جلا تھا۔ پھر بھی ذہن اسی کے دھیان کی شمع جلائے پروانہ وار نثار ہو رہا تھا۔ وہ اڑتی تتلی کی طرح خوش رنگ اور ناقابل حصول تھی۔ بھلا پردیسیوں سے بھی پریت لگائی جاتی ہے؟ ہاں مگر لگ جائے تو کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ بھی بے وجہ اس حسین بت کا اسیر ہوا تھا۔

اس کے دو دن بعد وہ لڑکی پھر اسے مرکزی پھاٹک کے قریب دکھائی دی۔ آج بادشاہ خان بھی آیا ہوا تھا۔ اسے ایک شرارت سوجھی جس میں اس نے منت سماجت کر کے بادشاہ خان کو بھی ملا لیا۔

دو دن پہلے کا بنا اسنو مین ابھی تک ایستادہ تھا۔

اس کے پہلو میں ایک پتھر پر بادشاہ خان ذرا مختلف حلیے میں جا بیٹھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکی کو پاس بلایا۔

"بڑا اونچا نصیب ہے بٹی کا، بہت محبت پاؤ گی۔ خوشیاں ہی خوشیاں مقدر میں لکھی ہیں۔ اس کا نام "س" سے ہوگا جس کے ساتھ تمہارا نصیب ہوگا۔" منصوبے کے مطابق بادشاہ خان نے ٹھیک ٹھاک اداکاری کی تھی۔ وہ لڑکی پہلے حیران ہوئی اور پھر خوش۔

"کیا واقعی؟ بابا میرا ہاتھ پڑھ کر بتائیں ذرا اور کچھ۔"

"نہ نہ نہ...... ہاتھ نہیں نصیب تو یہاں ماتھے پر لکھا ہے۔ جا، جا کر ایک پیالہ دودھ کا لا۔ یہ اس علم کی زکوٰۃ ہے۔"

وہ قلانچیں بھرتی اندر گئی تو وہاں سے اٹھ کر بھاگا سلمان بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

گزرے چار برسوں میں وہ اور بادشاہ خان اس بات کو یاد کر کے لاتعداد مرتبہ ہنس چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ کہانی آگے بڑھتی، وہ واپس چلی گئی۔ سلمان تو جانے اسے یاد تھا بھی کہ نہیں مگر سلمان کو وہ کسی لمحے نہیں بھولی تھی۔

شاید اس سے بے نام تعلق ہی وجہ تھا کہ جب اس گھر کے مکین ہجرت کر گئے تو وہ ان بوڑھے پنچھیوں کے پاس جا کر کچھ وقت گزارا آتا۔ اس گھر میں وہ محبوب چہرہ ہنستا رہا تھا۔ اس کو وہ درودیوار بھی عزیز تھے۔ پھر ایک یہ آس بھی تھی کہ شاید کبھی بھولے سے کوئی اس کا تذکرہ کر دے۔

وہ اس سے براہ راست بات کیے بغیر دیوانہ ہو چکا تھا تو اب تو پھر اس کے ساتھ بہت سی خوب صورت یادیں منسوب ہو چکی تھیں۔

اس کے بغیر وادی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ زندگی جیسے ایک ہی پٹڑی پر بھاگتی ریل گاڑی تھی جس کی کوئی منزل تھی ہی نہیں۔

اسے لگا تھا شاید وہ اس کے دل میں ذرہ برابر بھی اُتر گیا ہو مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اس نے واپس جا کر سب کچھ اسی طرح بھلا دیا تھا جیسے وہ پہلے بھول جاتی تھی۔

اس دن وہ انکل آنٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب اس کا فون آیا۔ ان سے بات کرنے کے بعد اس نے سلمان سے بھی بات کی تھی۔

"میں بہت جلد وادی کا چکر لگاؤں گی، میرے لیے بہت سی دعائیں کر دیں۔ مقبول دعائیں۔ بہت ضروری ہے۔"

جانے وہ کیوں اتنی پریشان لگ رہی تھی۔

"میں آپ کو فون کر لیا کروں؟" سلمان کی بات کے جواب میں ایک لمبی خاموشی کے بعد گہرا سانس ابھرا۔

"کیا کریں گے فون کر کے؟"

"مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کبھی آپ کو بھی کندھے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہیلیوں، بجھارتوں میں بات کرنے کے بجائے صاف سیدھا دل کا حال بتا کر رونے کا دل چاہتا ہے تو خود پر جبر کیوں؟ اپنا دل اپنا آپ کھولیے۔ کسی ایک دوست کے لیے جسے بازو بننا آئے یا نہیں کندھا بننا ضرور آتا ہو۔"

اس کی بات کے جواب میں ہانیہ نے اپنا فون نمبر لکھوا دیا تھا۔

☆☆☆

سچ کہتے ہیں موسموں کا تعلق دل کے موسم سے ہوتا ہے۔ دل کے اندر کہرا چھایا ہو تو پھول بھی پھول نہیں لگتے۔ ہانیہ کے اندر کہیں سرد رُتوں نے بسیرا کر لیا تھا۔ سعد کے رویے سے اسے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ شروع کے ایک دو دن اس نے فون کیا تھا مگر ہانیہ نے غصے سے بات نہیں کی۔ اس کے بعد سے مسلسل ایک خاموشی تھی جو ان کے درمیان مستقل ٹھہر گئی۔

ممی اس انتظار میں تھیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندگی کی ساکت وصامت جھیل میں پتھر

پھینکے۔ مگر وہ دونوں ضد کے پکے تھے۔ اب انہیں خود آگے بڑھنا تھا۔

رات کے کھانے پر انہوں نے سعد کو گھر بلایا تھا۔ ہانیہ اس بات سے لاعلم تھی۔ شومئی قسمت آج گھر میں دادو اور پاپا نہیں تھے۔ کھانے کے بعد ہانیہ نے کمرے میں بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر ممی کی ایک گھوری نے اسے ایلفی کی طرح صوفے سے چپکا دیا۔

''تم لوگ باتیں کرو، میں ابھی آتی ہوں۔'' ممی کے ڈرامے پر وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

''تم بات کیوں نہیں کرتیں فون پر؟''

''تم نے فون کیا ہی کب؟''

''جب تم نے بات نہیں کرنی تو میں فون کیوں کروں؟''

''مجھے غصہ تھا۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''وہ مجھے بھی تھا اور ابھی بھی ہے۔''

''تمہارا غصہ بے بنیاد تھا اور بے بنیاد ہے۔'' وہ اسی کے لہجے میں جواب دے رہی تھی۔

''وہ تو تمہارا غصہ بھی بے بنیاد تھا۔''

''یعنی تم نے جو کیا، وہ ٹھیک تھا؟'' ہانیہ کا پارہ چڑھنے لگا۔

''کیا کیا میں نے؟ آئی واز ڈرنک۔ ہو گیا...... جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ اور کیا بھی ہو تو کیا برائی ہے؟ میری تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے۔'' ہانیہ کو اس کی دلیل زہر لگی تھی۔

''مجھے اس بارے میں بات نہیں کرنی۔'' وہ چاہتی تھی، پہلی تلخیاں پھر زندہ ہوں۔

''مگر مجھے بات کرنی ہے۔ اس رات تم مجھے کیسے دھتکار کر آئی تھیں جبکہ میں کہہ رہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔'' وہ ترشی سے گویا ہوا۔

''میں شادی سے پہلے نہ کوئی حد پار کروں گی نہ کرنے دوں گی۔''

''یہ حد بندی میرے لیے کیوں؟ اس دو ٹکے کے عاشق کے لیے تمہاری حد کہاں گئی تھی؟''

''تمہارے دماغ میں کتنا گند بھرا ہوا ہے سعد! مجھے اندازہ نہیں تھا۔''

''میرا تو صرف دماغ گندہ ہے، تمہارا تو پورا وجود گندگی کی پوٹ ہے۔ تم نے سوچا ہوگا، یہاں کون سا کوئی دیکھنے آئے گا۔ حیرت تو مجھے اس بڈھے، بڑھیا پر ہے، جنہوں نے......''

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ۔ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔ یہ پکڑو اپنی انگوٹھی اور آئندہ کبھی شکل مت دکھانا۔'' چلاتے ہوئے انگوٹھی اتار کر اس نے سعد کی طرف اچھال دی اور اٹھ کر کمرے کی طرف چل دی۔

''مجھ میں کیا کمی تھی ہانیہ؟'' وہ بھاگ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''تم ایک بے حیا شخص ہو، تمہاری سوچ گندی نالی کے پانی سے بھی زیادہ بدبودار ہے۔''

''یعنی میری منگیتر غیر مردوں کے ساتھ رات باہر گزارے، میں بے غیرت بن کر دیکھتا رہوں؟''

''اب ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نکالا تو دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔''

اسے سامنے سے پرے دھکیل کر وہ جانے لگی تو سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔''

''میری باتوں کا جواب دے کر جاؤ۔''

''میں پابند نہیں ہوں۔''

''سر سے پیر تک صرف میرا حق ہے۔'' اس نے ہانیہ کا ہاتھ پکڑا تو ہانیہ نے اس پر ہاتھ اٹھا لیا۔ جسے بروقت روک کر اس نے ہانیہ کا ہاتھ چھوڑا اور ایک زور تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ ہانیہ کی چیخ نکل گئی۔

''آئندہ ایسا سوچنا بھی مت۔'' انگلی اٹھا کر اس نے تنبیہ کی۔

ہانیہ کی چیخ سن کر ممی بھاگی آئی تھیں۔

''کیا ہوا؟''

''اس گھٹیا شخص کو نکالیں گھر سے۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے میں مر جاؤں گی مگر اب اس پر تھوکوں

گی بھی نہیں۔" سرخ گال کے ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

"تم نے ہانیہ کو تھپڑ مارا ہے؟" ممی بے یقین کھڑی تھیں۔

"یہ تھپڑ اصولاً آپ کو مارنا چاہیے تھا یا شاید مجھے اسی دن مارنا چاہیے تھا جب آپ کی بیٹی کسی دوسرے کے ساتھ رات گزار کر آئی تھی۔" بات تھی کہ کٹاری تھی جوان کا اندر چیر گئی۔

"حیران مت ہوں، اس سے تسلی سے پوچھیے گا۔ آخر وہ بندہ اسے اتنا عزیز کیسے ہو گیا جس کی خاطر اس نے میری انگوٹھی انگلی سے نکال پھینکی ہے۔" بم پھوڑ کر وہ چلا گیا۔ ہانیہ کمرے میں جا چکی تھی۔ حواس بحال کر کے وہ ہانیہ کے کمرے میں چلی گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا سعد؟"

جواباً ہانیہ نے من و عن سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

"اب اگر اس رشتے کو قائم رکھنے کا سوچا تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہ اس کی کہانی سن رہی تھیں۔ ہانیہ نے رمشہ کی منگنی کی تقریب میں جو ہوا وہ بھی بتا دیا تھا۔ اور انہوں نے مان لیا تھا کہ اس رشتے کو جاری نہیں رکھا جا سکتا۔

☆☆☆

سعد کا ساتھ ختم ہونے کے بعد ممی فوراً ہی اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع ہو گئی تھیں۔ منگنی نہ ٹوٹتی تو ان کا ارادہ تھا اس سال اکتوبر نومبر میں وہ اس کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں۔

ہانیہ کو شدید قسم کی چپ لگ گئی تھی۔ وہ ابھی تک شاک میں تھی، اسے تکلیف منگنی ٹوٹنے کی نہیں، سعد کے بدلے ہوئے رویے سے ہوئی تھی۔ یہ منگنی گھر والوں کی رضامندی سے ہوئی تھی۔ رشتہ پاپا کے کسی دوست کے توسط سے آیا تھا مگر ہانیہ نے دل و جان سے اس رشتے کو قبول کیا تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی سعد سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں جھگڑا کرتی تھی۔ وہ ایک دو دن پہلے اسے اپنی سالگرہ کی یاد دہانی کرواتی اور وہ بھول جاتا۔ اس نے کبھی اس بات پر لڑائی نہیں کی کہ سعد اس سے گھنٹوں فون پر بات نہیں کرتا۔ یا اس کے لیے پھول اور تحفے وغیرہ نہیں لاتا۔

اندر کہیں وہ سمجھتی تھی کہ یہ چونچلے فلموں ڈراموں میں تو ہو سکتے ہیں مگر عملی زندگی میں نہیں، وہ تو بہت پریکٹیکل ہو کر یہ رشتہ نبھا رہی تھی اور بدلے میں کیا ملا۔ بے اعتباری، شک اور ذلت۔ وہ بری طرح بکھری ہوئی تھی۔

اس کی حالت کے پیش نظر ممی چاہتی تھیں کوئی ہو جو اس مشکل فیز سے نکلنے میں مدد کرے۔ پھر ایک جاننے والے کے ذریعے خیام کا رشتہ آیا۔ مناسب خاندان کے ساتھ خیام پڑھا لکھا اور باشعور لڑکا تھا۔ انہیں لڑکا پسند آیا تھا مگر ہانیہ نے انکار کر دیا۔

ان سارے الجھن بھرے حبس زدہ دنوں میں ایک خیر خوشی کی بھی تھی۔ ساجد ماموں کا خاندان واپس پاکستان آ گیا تھا۔ اب کم از کم بڑے ابا اور بڑی امی اکیلے نہیں رہیں گے۔ اس بات سے ہانیہ کے اندر سکون اترا تھا۔

برسات کے پرحبس بھرے دن گزرنے کے بعد سیف کے رشتے کا پیغام جیسے بہار کا سندیسہ تھا۔ ہانیہ نے اب کی بار کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ سیف کی خواہش پر گھر میں عشائیہ رکھا گیا تھا جس میں اس نے نہ صرف ہانیہ کو پسند کر لیا تھا بلکہ اس کی ماں نے شگون کے طور پر کچھ کڑکتے بڑے نوٹ ہانیہ کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ ممی پاپا بہت خوش تھے اور وہ مطمئن۔

جو بھی تھا وہ پرسکون تھی۔ بعض اوقات انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں مرضی اور خوشی ثانوی چیزوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اسے یقین تھا وہ خوش ہونا سیکھ لے گی مگر اسے علم نہیں تھا آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی۔

دونوں گھرانوں میں اتفاق سے منگنی کی رسم خارج کر کے براہ راست شادی ہونا قرار پایا تھا۔ ممی چاہتی تھیں وہ شادی پر بالکل تروتازہ ہو۔ اسی لیے

شادی کی خریداری کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے شروع کر دی تھی تا کہ آخری دنوں میں اسے بازاروں کے چکر نہ کاٹنے پڑیں۔

اس روز وہ اور سیف زیورات دیکھنے گئے تھے۔ پیڑ پودوں پر خزاں اتر آئی تھی۔ موسم کو ابٹن لگ چکا تھا۔ زیورات پسند کر کے آرڈر دے کر وہ نکلے تو سیف اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہ آرڈر سرو ہونے کا انتظار کر رہے تھے جب اس نے سعد کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کا خون خشک ہونے لگا۔

''کیسی ہو؟'' بلا اجازت کرسی گھسیٹ کر وہ اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ سیف سوالیہ نظروں سے تک رہا تھا اور ہانیہ کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کی تعریف؟''

''ہانیہ کا سابقہ منگیتر اور آپ؟''

''ہانیہ کا ہونے والا شوہر۔'' بڑا سنجیدہ جواب آیا تھا مگر سعد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بہت خوب...... نیا منگیتر۔ مجھے تو لگا تھا اسی سے شادی کرو گی جس کی خاطر میری انگوٹھی ہاتھ سے اتاری تھی۔''

ہانیہ بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی رہی۔

''ویسے یہ غلط ہے، کم از کم اس سے ہی وفادار رہ لیتیں جس کے ساتھ......'' کمینگی سے ہنس کر کہتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ میرا کارڈ ہے ہانیہ کے ہونے والے شوہر صاحب! اگر ضرورت پڑے تو یاد کیجیے گا، مجھے مدد کر کے خوشی ہوگی۔''

وہ سانپ کی طرح ڈس کر نوزائیدہ رشتے کا بدن نیلا کر گیا تھا۔ بنا کچھ کھائے وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ سیف نے پورے راستے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور اسے گھر چھوڑ گیا۔

اگلی شام ان کی طرف سے معذرت کا فون آ گیا۔ ممی حق دق رہ گئی تھیں۔ پاپا بھی بے حد پریشان تھے اور وہ مٹی کا مجسمہ بن گئی تھی۔ ہنسی پہلے ہی روٹھ گئی تھی اب الفاظ بھی چھن گئے تھے۔

☆☆☆

یہ سردیوں کی پہلی بارش تھی۔ ارسل پلیٹ میں گرم چپس لیے اس کے کمرے میں آ گیا۔

''آئس کریم کھانے چلیں؟''

ایسے موسم میں وہ باہر نکلنے کے لیے بے چین ہوتی تھی مگر آج اس نے کمرے سے قدم نکالنا تو دور کھڑکی سے بھی باہر نہیں جھانکا تھا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''مگر میرا چاہ رہا ہے۔ حلیہ سدھارو، میں گاڑی نکالتا ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ وہ ہنوز بستر میں لیٹی تھی۔ اس کا انتظار کر کر کے وہ دوبارہ آ گیا۔ ''یہ کیا نحوست پھیلائی ہے یار، چلو باہر انجوائے کرتے ہیں۔'' اس نے کمبل کھینچا۔

''میں منحوس ہوں۔ نحوست ہی پھیلا سکتی ہوں۔ دور رہو مجھ سے اور میرے سائے سے بھی بچو۔''

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ ارسل کمبل کا کونا تھام کر کھڑا افسوس سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر بنا کچھ کہے کمبل چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ممی کا سر کھا رہا تھا۔

''گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ اسے نکالیں کمرے سے۔ حالت دیکھیں صدیوں کی بیمار لگ رہی ہے۔ منگنی ہی ٹوٹی ہے پھر کیا ہو گیا ہے۔''

''میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کوئی بات مانتی ہی نہیں۔ ہزار بار پارلر جانے کا، کچھ خریداری وغیرہ کرنے کا کہہ چکی ہوں۔ وہ نہیں مانتی تو کیا زبردستی گود میں اٹھا کر لے جاؤں؟'' وہ خود اس کی حالت سے نالاں تھیں۔

''اسے بڑے ابا کے پاس بھیج دیں، کچھ دنوں کے لیے۔'' ارسل کی بات پر وہ سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

جگہ کی تبدیلی نے اس پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ کم از کم اب وہ سانس کھل کر لے رہی تھی۔ جو گھٹن اس کے اندر بھر گئی تھی۔ اب کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ بڑی امی تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پیلا زرد

رنگ اور بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ انہوں نے فرصت دیکھ کر اس سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کا وہم ہے“ کہہ کر بات ختم کردی تھی۔ وادی پر خزاں کا موسم اترا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلتی تو مزید اداس ہو کر واپس آتی۔

ہلدی لگ گئی موسم کو
اب دیکھنا بادل روئیں گے

جانے کیوں بات بے بات اس کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اس کی دل جوئی کے لیے رات کو باربی کیو کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ حسب سابق سلمان کو بلایا گیا۔ رسمی سی سلام دعا اور حال احوال کا انداز بتا رہا تھا، کچھ بدل گیا تھا ہانیہ میں۔ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھی انہیں خوش گپیاں کرتے دیکھ رہی تھی۔ ابوذر نے ساؤنڈ سسٹم سیٹ کروایا تھا اور اب ایک مشہور انگلش گانا بج رہا تھا۔ اسے بے تحاشا رونا آ رہا تھا اس لیے خاموشی سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد بڑے ابا اس کے کمرے میں آ گئے۔

”کیا ہوا ہے ہانیہ؟ میرا بچہ بہت ڈسٹرب لگ رہا ہے۔“

بڑے ابا نے اتنے پیار سے پوچھا تھا کہ وہ خود پر بند نہیں باندھ سکی اور سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتے اسے آنسو بہاتے دیکھ رہے تھے۔

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سعد نے ٹھیک کیا ہے لیکن اس کی جگہ آ کر دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا۔ بات چھوٹی نہیں تھی، زندگی ایسی ہی ہے۔ لوگ آپ کا اندر نہیں دیکھتے، صرف وہ دیکھتے ہیں جو ہم کرتے ہیں بس یہ جان لو، رب دو عالم نے تمہارا اس کا ساتھ ایسے اور یہیں تک لکھا تھا۔ ہاں مگر سیف کو سب بتا کر اس نے غلط کیا۔ اس سارے میں قصور تمہارا ابھی نہیں۔ اپنے معاملات سچے دل سے اوپر والے کے سپرد کردو، وہ خود سب دیکھ لے گا۔ اب میں تمہیں اداس یا پریشان نہ دیکھوں۔“

بڑے ابا کی باتوں سے اس کے اندر سکون اُترا تھا۔ ہانیہ کی تکلیف اپنی جگہ مگر وہ خوش تھے کہ دو بچے جنہوں نے ان سے بے غرض محبت کی تھی۔ ان کے ایک ہونے کا موقع بن گیا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا نکھرا نکھرا اور تروتازہ تھا۔ بڑے ابا اپنے کسی وکیل دوست سے ملنے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہانیہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ موسم کی پہلی برف باری تھی۔ سیاحوں سے شاہراہیں بھری پڑی تھیں۔ زندگی جیسے فاسٹ ٹریک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ہانیہ کو دوبارہ زندگی کا احساس ہو رہا تھا، ونڈ اسکرین سے ٹکراتے برف کے ننھے گالے اس کے دل میں خوشی کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ شام کو جب واپسی ہوئی تو بہت ساری منفی سوچوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اگلے کافی سارے دن وہ کبھی زین اور کبھی ابوذر کے ساتھ گھومتی پھری تھی۔ وہ حیران تھی، اب تک ممی نے اس سے واپسی کا نہیں پوچھا تھا۔ سکون کے یہ دن بہت تھوڑے تھے۔ ایک شام وہ منال اور کنزیٰ کے ساتھ اسنو مین بنانے کے بعد اندر آئی تو ماموں ساجد کو بڑے ابا پر چلاتے سنا۔

پورے گھر میں ان دونوں کی آواز گونج رہی تھی۔ ان کی پرائیویسی کے خیال سے وہ اوپر اپنے اور منال کے مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔ اگلی صبح سب کا موڈ بے حد خراب تھا۔ ہر بندہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ماموں ممانی نے اس کے سلام کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، اس سے غلطی کیا ہوئی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اسی شام ممی بھی آ گئی تھیں۔ تب اس پر راز کھلا۔

ماموں پاکستان تو بھائی کے ساتھ چھوڑ کر گئے تھے مگر غیر ملک میں سیٹ نہیں ہو سکے۔ بڑے ابا سے سارے بچے اپنے اپنے حصے لے چکے تھے۔ اب بس یہ گھر بچا تھا جو بڑے ابا کے نام تھا۔ اب ساجد ماموں کہہ رہے تھے، اس گھر کو بیچ کر بڑے ابا ان کے ساتھ چلیں تاکہ وہ دوبارہ کوشش کر سکیں۔ پاکستان واپس آنا ان کی مرضی نہیں مجبوری تھی۔

اب جب گھر کی بات ہوئی تو بڑے ابا نے

انکشاف کیا کہ گھر تو وہ ہانیہ اور سلمان کے نام کر چکے تھے، اسی غصے میں ان دونوں کے درمیان تو تو میں ہوگئی تھی پھر ماموں نے فون کر کے ممی کو بلوالیا کہ وہ بڑے ابا کو سمجھائیں اور ہانیہ کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالیں۔

ہانیہ کا دماغ پھٹنے والا ہو چکا تھا سوچ سوچ کر۔ ممی کے کہنے سے پہلے اس نے بڑے ابا سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"بڑے ابا! آئس کریم کھانے چلیں؟" اس نے جتنے لاڈ سے پوچھا تھا، انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر سے باہر جا رہے تھے۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا بڑے ابا؟"

"کیونکہ جب ساجد واپس آیا تو مجھے یہی شک گزرا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس گھر کو بچانے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے اس گھر کو بہت محبت سے بنوایا تھا اور اب اس گھر کی ایک ایک اینٹ سے میں اس مطلب پرست اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔" ہانیہ کو لگا سارے سوال جواب ختم ہو چکے ہیں۔

"تو آپ میرے نام نہ کرتے۔"

"تمہیں وادی سے جو محبت ہے، میں جانتا ہوں۔ یہی محبت اس گھر کو آباد کرے گی۔ صرف اسی لیے۔ سلمان نے میرا ان سب سے بڑھ کر خیال رکھا ہے۔ اس کی بے غرض محبت مجھ پر قرض ہے جو میں ادا تو نہیں کر سکتا مگر محبت کا جواب محبت سے ضرور دے سکتا ہوں۔"

"بڑے ابا! آپ سارا گھر اسی کے نام کر دیتے۔"

اس کی بات پر وہ مسکرائے۔

"میں نے گھر اس کے نہیں تمہارے نام کیا ہے۔ اگر تمہارے نام کر دیتا تو مجھے پتا ہے ذرا سا دباؤ پڑنے پر تم ان کے ہاتھ میں تھما دیتیں۔ کم از کم سلمان ایسا نہیں کرے گا۔"

"اگر آپ کی خواہش ہے تو میں بھی ایسا نہیں کروں گی۔" جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

نازنین تو بھائی کے بلاوے پر آئی تھیں کہ بیٹی اور باپ پر دباؤ ڈال کر ان معاملات سے کنارہ کش ہو سکیں مگر یہاں آکر انہیں احساس ہو رہا تھا کہ یہ سفر اس وقت ان کی اپنی سب سے بڑی ضرورت تھا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ نازنین ماں کے پاس بیٹھی تھیں۔ ملنے ملانے اور باتیں کرنے میں عشاء کی نماز کو کافی دیر ہو چکی تھی سو ابا جان اس وقت نماز ادا کر رہے تھے۔ نازنین منتظر تھیں کہ کب وہ نماز پوری کر کے آئیں تو وہ ان سے بات کر سکیں۔

نماز پڑھ کر دعا مانگنے کے بعد انہوں نے نازنین پر پھونک ماری اور ان کے ساتھ ہی ہیٹر کے قریب بیٹھ گئے۔

"ہانیہ کا دھیان کیوں نہیں رکھتیں تم؟"

"رکھتی تو ہوں۔"

"لگتا تو نہیں۔"

"بس ایک تو حالات ایسے ہو گئے تھے اور پھر وہ حساس بہت ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سر پر سوار کر لیتی ہے۔" نظر چرا کر انہوں نے سارا ملبہ اس کی حساسیت پر ڈال دیا ورنہ وہ خود اس قدر پریشان رہی تھیں۔ اگر سعد کے ساتھ منگنی برقرار رہتی تو وہ اب تک ہانیہ کے فرض سے سبک دوش ہو چکی ہوتیں۔

"ہاں مجھے بتایا اس نے۔ اب پھر کیا سوچا ہے اس کے لیے؟"

"اللہ کے حکم کا انتظار ہے۔ جب حکم ہوا لمحہ بھر کی دیر نہیں کروں گی۔"

"ویسے تو تم لوگوں نے سارے معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے تھے پھر بھی اگر کسی قابل جانو تو ایک رشتہ ہے میرے پاس۔"

نازنین کو لگا، شاید وہ ابوذر کے لیے ہانیہ کا رشتہ

مانگنے والے ہیں۔ ایک وقت تک ان کے دل میں بھی یہ خواہش رہی تھی مگر جب بھائی بھاوج نے کوئی بات نہیں کی تو وہ خود کیا کہتیں۔ بھلا بیٹی کی ماں ہو کر خود کیسے سوال کر سکتی تھیں۔

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔''

''لڑکے کے ماں باپ نہیں ہیں بلکہ قریبی کوئی رشتہ موجود نہیں۔ اپنا ہوٹل ہے۔ شوقیہ کھانے وغیرہ پکاتا ہے وہاں۔ شریف، پڑھا لکھا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی ہانیہ کو پسند بھی کرتا ہے۔'' ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے بات مکمل کی اور نازنین کا چہرہ دیکھا۔

''میں کل بلوا لیتا ہوں۔ ایک بار دیکھ لینا۔ سچ کہوں تو مجھے میری سگی اولاد سے زیادہ عزیز ہے۔''

''کیا یہ وہی ہے جس کے نام آپ نے یہ گھر کیا ہے؟'' ان کی والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے نازنین نے اندازہ لگایا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اگر آپ کو پسند ہے تو میرے دیکھ کر قبول کرنے یا ناپسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بس اس کے پاپا سے بات کرلوں اور پھر ہانیہ سے پوچھ لیں گے۔''

''ہانیہ سے تم مت پوچھنا، میں خود بات کروں گا۔''

اپنے آنے کا مقصد فراموش کر کے نازنین بڑے --- ودماغ کے ساتھ وہاں سے اٹھی تھیں گو کہ اگلے دن انہوں نے ابا جان سے بات بھی کی تھی مگر انہوں نے قطعیت سے انہیں اس معاملے سے الگ رہنے کا کہا تھا۔ اگلی شام وہ ہانیہ کو لیے بغیر واپس چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

گھر کا ماحول ویسے ہی گھٹن زدہ تھا۔ بڑے ابا اور بڑی امی کے علاوہ سب کے لیے وہ ''غیر موجود'' تھی۔ حیرت تو یہ کہ اب اسے برا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ روز صبح ناشتے سے پہلے گھر سے نکل جاتی اور گھوم پھر کر اس وقت واپس آتی جب سب ناشتہ کر چکے ہوتے۔ البتہ بڑے ابا اور بڑی امی اب بھی اس کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ اب اس کے ایسے جانے پر بڑے ابا کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ انہیں تو بس نازنین کے فون کا انتظار تھا۔ پھر ایک شام نازنین نے فون پر انہیں رضامندی دے دی۔ باپ کا ان کی زندگی کے لیے لیا گیا فیصلہ ایسا شاندار تھا کہ اب بھی دونوں میاں بیوی انہیں دعائیں دیتے تھے۔ ایسے میں اپنی لاڈلی نواسی کے لیے وہ کیسے کسی غلط شخص کا انتخاب کر سکتے تھے۔ یوں بھی دونوں نے ایک ایک بار اپنی مرضی کر دیکھی تھی۔

بڑے ابا بہت خوش تھے۔ ہانیہ سے بات کرنے کے لیے اگلی صبح وہ اس کے ساتھ نکلے تھے۔ ہانیہ نے ان کی خواہش اور ماں باپ کی رضامندی بالکل خاموشی سے سنی تھی اور پھر اطمینان سے انکار کر دیا۔

''نہ میں نے ایسا پہلے بھی سوچا تھا اور نہ اب سوچوں گی۔ نہ ہی میں یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر الزام تراشی کرنے والے خود کو حق پر سمجھیں۔ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔''

بڑے ابا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی خواہش سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسے منا سکتے تھے، وہ کوشش کر سکتے تھے اگر وہ وہاں رکتی۔ یہ پہلی بار تھا جب اس نے خود سے گھر واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''کچھ دن اور رک جاتیں۔'' بڑے ابا کا ناراض لہجہ گویا شکوہ تھا۔

''میں نہیں چاہتی، میرا اس سے سامنا ہو پھر یہاں سب کے رویے سہنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔ داؤد بھائی سے کہہ دیں، وقت نکال کر مجھے یہاں سے لے جائیں۔'' وہ واپسی کے راستے پر قدم رکھ چکی تھی اور وہ بے چارگی سے اسے دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ہانیہ فون کر کے داؤد کو لینے آنے کا کہہ چکی تھی۔ داؤد نے ایک دو دن میں آنے کا کہا تھا۔ اس سے پہلے داؤد اسے لینے آتا، ساجد ماموں اپنی بیوی اور

بچوں کے ساتھ گھر چھوڑ گئے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے یہ بتانا گوارا نہیں کیا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

ایک بار پھر پورا گھر خاموشی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ہانیہ کو یقین تھا بڑے ابا اور بڑی امی اس طرح ماموں کے چلے جانے سے بہت زیادہ افسردہ ہوئے ہوں گے مگر انہوں نے کسی بھی طرح اس افسردگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اب ہانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ داؤدا اسے لینے آئے۔ اپنی جلد بازی پر اسے افسوس بھی ہوا تھا۔ سلمان ہی تھا بھلا وہ کون سا اسے کھا سکتا تھا آج وہ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگی تھی۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔

آج پہلی بار وہ ناشتہ بنانے کی نیت سے باورچی خانے میں داخل ہوئی تھی۔ گل مینہ نے پراٹھے ڈالے اور وہ انڈے فرائی کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ ایک انڈہ پین سے چپک گیا، ابھی تیل ٹھنڈا تھا۔ دوسرا انڈہ پہلے والے چپکے ہوئے انڈے سے لگ کر جل گیا۔

''یہ کام میرے بس کا نہیں۔'' گل مینہ سے کہہ کر وہ باورچی خانے سے نکل آئی۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ اپنا کمرہ سمیٹنے کے لیے اوپر چلی گئی۔ کام تو کچھ تھا ہی نہیں، آج داؤدا اسے لینے آنے والا تھا۔ اس لیے اپنے کپڑے وغیرہ بیگ میں ڈالتے وہ بے حد اداس ہو رہی تھی۔ یونہی کھڑکی پر نظر پڑی تو وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جانے کتنی دیر وہاں کھڑی باہر دیکھتی رہی۔ دروازے پر دستک اس کے حواس واپس لے آئی۔

''آ جائیں۔'' کہہ کر وہ بے دلی سے بیڈ پر جا بیٹھی جہاں اس کا کھلا ہوا سفری بیگ پڑا تھا۔

''السلام علیکم۔''

غیر متوقع آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

''وعلیکم السلام...... کیسے ہیں؟''

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔'' وہ بے تکلفی سے کہہ کر دروازہ مکمل طور پر کھول کے کھڑکی کے پاس کرسی پر جا بیٹھا۔

''میری طبیعت خراب رہی پچھلے دنوں، شاید اسی لیے۔'' کپڑے تہہ کر کے بیگ میں ڈالتے وہ مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جا رہی ہیں؟''

''ہوں۔''

''مجھے انکل نے بتایا ہے آپ کی منگنی ختم ہونے کا، شاید یہی آپ کی طبیعت خرابی کی وجہ رہی ہے۔'' سلمان کا تجزیہ صد فی صد درست تھا مگر اس نے اقرار نہیں کیا۔

''بہت چاہتی ہیں اسے؟'' سلمان جانتا تھا کس قدر تکلیف سے یہ الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

''میں نہیں جانتی۔ بس یہ جانتی ہوں کہ میں نے پورے خلوص سے عملی بنیادوں پر اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی تھی۔'' اس کا لہجہ سچائی کا امین تھا۔ ''چند سال پہلے میں یہاں آئی تھی تو ایک صبح مجھے یہاں ایک بوڑھا شخص ملا۔ اس نے میرا ہاتھ پڑھا اس نے مجھے بتایا ''ایک شخص میری زندگی میں آئے گا اور......

''اس نے کہا اس کا نام ''س'' سے ہوگا جس کے ساتھ......'' اس کی بات کاٹ کر سلمان نے اپنی بات بھی ادھوری چھوڑ دی۔ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''وہ بادشاہ خان تھا اور میں نے اس سے کہا تھا۔ میرا نام بھی تو ''س'' سے شروع ہوتا ہے۔''

وہ جیسے کسی گہرے شاک میں تھی۔

''میں نے اسے سچ مان لیا تھا۔ اسی لیے جب سعد کا رشتہ آیا تو میں نے سوچنے سمجھنے کے لیے بھی وقت نہیں لیا پھر سیف......''

''اگر آپ کچھ دن رک جاتیں تو شاید آپ کو پتا چل جاتا، یہ اشارہ کس 'س' کی طرف تھا۔''

اپنی اپنی جگہ دونوں خاموش تھے چند ساعتیں ایسے ہی چپ کی نذر ہوئیں۔

''کیا آپ مجھے ایک موقع نہیں دے سکتیں؟''
''میں نہیں چاہتی، زندگی کے کسی موڑ پر مجھے یہ طعنہ سننے کو ملے کہ میرے دل میں کھوٹ تھا جو سعد کے ساتھ خیانت کی۔''
سلمان کو علم ہو چکا تھا کہ ہانیہ کی منگنی کن حالات میں ٹوٹی ہے۔
''میں آپ کی محبت میں ویسے ہی مبتلا ہوں، جیسے آپ وادی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ جیسے آپ برف زاروں کے نظارے دیکھ دیکھ کر نہیں اکتاتیں، ویسے میں بھی آپ کی باتوں، آپ کے روپ سے نہیں اکتاؤں گا۔ میں نے اتنے سال یک طرفہ محبت میں گزارے ہیں۔ آنے والی زندگی بھی گزار لوں گا۔ مگر یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں، میری طرح آپ کو کوئی نہیں چاہے گا۔ ہمارے درمیان کچھ بھی شرم ناک نہیں، یہ ہم دونوں کے علاوہ صرف ہمارا خدا جانتا ہے۔ کل کو اگر یہ بات کسی اور پر کھلی تو کس کس کو صفائیاں دیتی پھریں گی۔ ایک منگنی ٹوٹنے پر آپ اتنا بے حال ہیں تو کل کو خدانا خواستہ اس سے مضبوط رشتہ ڈگمگایا تو کیا کریں گی؟ اور آخری بات خزاؤں کے خوف سے آنگن میں بیلیں لگانا نہیں چھوڑنا چاہیے۔''
اپنی بات مکمل کر کے اسے سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اپنی پیکنگ مکمل کرنے کے بعد وہ نیچے چلی گئی۔ دوپہر کا کھانا سلمان اور گل مینہ نے بنایا تھا۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد وہ بے وجہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی لیکن ماحول پر چھایا جمود بدستور قائم تھا۔ داؤد بھی سہ پہر میں آ گیا تھا۔ بڑے ابا اسے نظر انداز کیے خبروں میں گھسے بیٹھے تھے۔ بڑی امی داؤد کے لیے کھانا لگوا رہی تھیں اور سلمان اپنے گھر جا چکا تھا۔
وہ مطمئن تھی۔ پرسکون چہرہ کافی حد تک تروتازہ لگ رہا تھا۔
''کاش میں تمہیں بتا سکتا، سمجھا سکتا۔ کوئی بات نہیں، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ ہم پہلے بھی دعائیں دیتے تھے اب بھی دعائیں دیں گے۔''

واپسی کے لیے نکلتے بڑے ابا نے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تو ہانیہ نے انہیں بہت تھکا ہوا محسوس کیا۔
داؤد نے اس کا بیگ گاڑی کی ڈگی میں رکھا تو وہ ''ایک منٹ'' کہہ کر ساتھ والے گھر کی طرف چلی گئی۔ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سلمان اسے دیکھ کر حیران ہوا۔
''جا رہی ہوں، سوچا ملتی جاؤں۔''
''واقعی جا رہی ہیں آپ؟'' اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی کٹھور ہو گی۔ اس کا اظہارِ محبت بھی بے مول کر دیا تھا اس نے۔
''جاؤں گی نہیں تو آپ لینے کیسے آئیں گے؟'' سر جھکا کر اس نے آہستگی سے کہا۔
سلمان کو ایک لمحہ لگا تھا سمجھنے میں، خوشی سے دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔
''بڑے ابا اور بڑی امی اکیلی ہیں۔ میرے آنے تک ان کا دہرا خیال رکھیے گا اور اپنا بھی۔'' کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔
''میں اکیلا زیادہ دیر تک ذمہ داری نہیں نبھا سکتا۔ اس لیے جلد آؤں گا۔ ان شاء اللہ۔''
اپنے پیچھے اس نے آواز سنی اور جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔
برف زاروں نے اس شوخ رنگ تتلی کو ہمیشہ کے لیے روک لیا تھا۔ بھلا ایسی محبت کرنے والے کہاں ملتے ہیں؟
اور وہ بھی سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے سوچ رہی تھی۔
''بھلا ایسی محبت کرنے والے کہاں ملتے ہیں۔''

"انور مجھے اپنے گاؤں جانا ہے۔"
خدیجہ نے اپنے شوہر کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔
"پورے دس سال ہو گئے ہیں مجھے ابا اور بھائیوں کی بہت یاد آتی ہے۔"
اس کی آنکھوں میں نمی تھی، اپنوں کا دیا دکھ جل رہا تھا۔
"بھائی سارے شادی کر چکے ہیں ابا اکیلے ہوں گے۔"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں جب کہو گی لے جاؤں گا۔"
آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ وہ کچن میں آ کر آنسو صاف کرنے لگی۔
"کون کہتا ہے کہ میں سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ انور بھی کیا سوچتا ہوگا۔ کیسے بھائی ہیں شادی کر کے بہن کو بھول ہی گئے۔ شادی کر کے جان چھڑا لی ایک بار ہاں فقط ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا کہ بہن زندہ ہے یا مر گئی کس حال میں ہے؟ کتنے بچے ہیں؟
یہ شکوے تو بس میرے دل میں ہی رہ جائیں گے۔ شوہر اور بچوں کے آگے کرنا نہیں چاہتی اور بھائی انہوں نے یہ مان ہی نہیں دیا۔

اقرا بنت سرور

انہوں نے بہن کو یاد نہیں رکھا تو کیا ہوا۔ میں تو ان کو ہر دن یاد کرتی ہوں، میں جاؤں گی اپنے گاؤں اپنے گھر، جہاں میرا بچپن گزرا میں پلی بڑھی، جوان ہوئی اور پھر رخصت کر دی گئی ہمیشہ کے لیے۔
یہاں پر خدیجہ سسکیوں کو دبا نہ سکی۔
"ابا......" اس نے باپ کو پکارا۔ انہوں نے کب مجھے بیٹی کہا تھا یاد کرنے پر بھی اسے یاد نہ آیا۔
ابا کس حال میں ہوگا؟
اس کا دل چاہا وہ اڑ کر اپنے آبائی گاؤں چلی جائے۔
"خدیجہ!" انور کچن میں آ گیا۔ چھوٹا سنی رو رہا تھا۔
"حمزہ اور عاشی کو بھی جگا دیا اس سنی کے بچے نے۔"
"اف......" وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔
"تھک گئے ہوں گے سفر کی وجہ سے دوبارہ سلا دو۔"
"انور!" وہ سنی کا فیڈر بنانے لگی۔

"جی۔" وہ جاتے جاتے رکے۔

"میں کل گاؤں جانا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر آج تیاری کر لینا۔ میں لے جاؤں گا۔" وہ خوش ہوگئی بہت زیادہ۔ اسے اپنے میکے کے ایک ایک چپے سے پیار تھا۔ میکہ جو پرایا گھر تھا۔

☆☆☆

شادی کے شروع میں ہی ابا نے بتادیا تھا۔ "اسے بیٹیاں پسند نہیں۔ اور نہ ہی بیٹیاں پیدا کرنے والی عورتیں۔"

اماں تو دہل گئیں ابا کے خیالات جان کر ابا کہتے تھے۔ "بیٹیاں منحوس ہوتی ہیں ساری خوشیاں کھا جاتی ہیں۔ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں، بوجھ، پہاڑ جتنا بوجھ بوجھ سر کاتے کمر ٹوٹ جاتی ہے۔" ان کو اپنی کمر بہت پیاری تھی۔ وہ بیٹیوں کے باپ بن کر بوڑھے نہیں ہونا چاہتے تھے۔

ابا بیٹی کو سزا کہتے تھے وہ دعا کرتے تھے کہ اللہ مجھے بیٹی سے بچائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ گنہگاروں کو بیٹیاں دیتا ہے سزا کے طور پر، وہ ہمیشہ اس "سزا" سے پناہ مانگتے تھے۔

اماں بہت ڈر گئیں جب پہلی بار خوش خبری ملی تو وہ نو ماہ تک ہر دن، ہر رات اللہ سے دعا کرتیں کہ بیٹی نہ ہو۔

ابا سناتے کہ بیٹی ہوئی تو تیری چھٹی۔

اماں ڈری، سہمی رہتیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا سامان سنبھالنے لگی تھی کیا پتا بیٹی ہو جائے...... اور وہ بے دخل کر دی جائے۔

وہ بہت پریشان رہتیں دل میں ڈر سا بیٹھ گیا تھا۔ ہر وقت بولائی بولائی پھرتیں۔ اماں کو لگتا تھا اگر کبھی انہوں نے بیٹی کو جنم دیا تو وہ مر جائے گی۔ ان کا دل بند ہو جائے گا۔

اماں کی دعائیں شدت پکڑتی گئیں دعا کے علاوہ اماں کو سکون نہ ملا تو پیروں فقیروں کے در پر گئیں۔ بیٹا ہونے کے تعویذ پیٹ پر باندھ لیے۔

ہمسائی سے سنا کہ ایک عورت بڑی پہنچی ہوئی وہ اگر حاملہ عورت کے پیٹ پر ہاتھ پھیرے تو اس کو بیٹا ہوتا ہے۔ اماں اس سے بھی مل آئیں۔

پھر بھی خوف تھا کہ جاتا نہیں تھا۔

بالآخر اس نے ایک بچے کو جنم دیا، دائی نے جب بتایا کہ اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا ہے تو وہ خوشی سے بے ہوش ہوگئی۔

ابا نے پورے پنڈ میں مٹھائی بانٹی وہ گردن اکڑا اکڑ کر کہتے ہیں میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں۔ ان کا انداز ایسا ہوتا جیسے انہوں نے پورے جہاں کو فتح کر لیا ہو۔ ان کو اپنی مردانگی کا غرور تھا وہ بیٹے کا باپ بن جانے کو اپنا کمال سمجھتے تھے۔

ان کو لگتا تھا وہ بہت نیک انسان ہیں وہ کبھی بیٹی کے باپ بن ہی نہیں سکتے بیٹے ان کی شان تھے پھر اماں ہر بار دعا کے ساتھ تعویذ بھی باندھتی اور اس عورت کا ہاتھ بھی پھیروا کر آتی۔

پھر ابا یکے بعد دیگرے سات بیٹوں کے باپ بن گئے۔ پورا پنڈ ان پر واہ واہ کرتا تھا وہ عظیم الشان بن گئے تھے ان کی گردن کے سریے اور سخت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

انور نے خدیجہ کو گاؤں جاتی کچی سڑک کے کنارے اتارا۔

"آگے میں خود چلی جاؤں گی۔" "آپ بچوں کا خیال رکھنا۔ خوشی سے خدیجہ کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم خیال سے جانا۔ جب آنا ہو مجھے فون کر دینا۔" "اللہ حافظ کہتا وہ واپس شہر چلا گیا۔

وہ دھول اڑاتی سڑک پر چلتی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھوڑا سا آگے جا کر کھیت اور درخت نظر آرہے تھے۔ خدیجہ کے گاؤں میں آبادی زیادہ نہیں تھی دو، تین برادریاں رہتی تھی۔ اکثر کے مکان پکے تھے۔ ان ہی پکے مکانوں میں سے ایک مکان اس کا میکہ تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ اسی راستے پر چلنے سے اس کا میکہ آجاتا۔

اس کے ابا کا بڑا سا گھر تھا کھلی حویلی تھی۔ سات آٹھ کمرے تھے ایک ہی لائن میں، ساتھ میں برآمدے۔ حویلی بہت کھلی تھی حویلی کے اندر آم کے

کئی درخت تھے۔

اسے یاد آیا۔ جب آم درخت پر پک جاتے تو اس کے بھائی ابا سے چھپ کر اس کے لیے آم توڑ کر لاتے تھے۔ اس نے اپنے برقع کا نقاب اتار دیا اس کے بھائیوں کا ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھو لیے وہ اپنے میکے کے گھر کے بالکل قریب آ چکی تھی اسی ٹیوب ویل پر تو اس نے اپنا بچپن گزارا تھا وہ اور اس کی سہیلیاں اسے پٹر میٹر کہتی تھی یہ ٹیوب ویل اس کے ابا کی حویلی کے بڑے سے دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ دروازہ......!!

اس نے دیکھا دروازہ کہاں تھا۔ یہیں تو تھا اب نہیں تھا۔ وہ حیران و پریشان رہ گئی۔

گھر کے اندر بچوں اور عورتوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ ابھی تک کوئی باہر نہیں آیا تھا۔

وہ یہ سوچ کر ہی پرجوش ہو گئی کہ اس کے بھائی اس سے مل کر کتنے خوش ہوں گے۔ بھائیوں کے بچے ہوں گے۔ نجانے کس کس کے کتنے کتنے بچے ہوں۔

"اف...... میرے بھتیجے بھتیجیاں...... وہ مجھے بوا کہیں گے۔ آپا کتنا مزہ آئے گا۔ میری بھابیاں چار تو تھیں باقی تین کیسی ہوں گی؟"

☆☆☆

سات بیٹوں کے بعد اماں جب آٹھویں بار امید سے ہوئی تو ان کے دل میں ایک خدشہ پیدا ہو گیا کہ اس بار بیٹی نہ ہو جائے۔

جس طرح پہلی بار پریشان ہوئی تھیں اب بھی ویسے ہی پریشان رہتیں ان کو کچھ کھٹکتا تھا، اماں کو لگتا اس بار کچھ برا ہو گا ان کو شدید وہم ہو گیا تھا کہ اس بار بیٹی ہو گی۔

حالانکہ اندر ہی اندر ان کو بیٹی کی شدت سے چاہ تھی لیکن شوہر کی باتیں ان کی خواہش کو کھا گئی تھیں۔

پھر اماں کو فکر ستانے لگی کہ اگر بیٹی ہو گئی تو کیا ہو گا کا تصور کر کے وہ تھر تھر کانپنے لگتیں۔

اس بار انہوں نے بہت مشکل سے وقت گزارا۔ تعویذ باندھا بیٹا ہونے کا۔

"اماں تب تو اور زیادہ خوفزدہ ہو گئیں جب ان کو پتا چلا کہ ہاتھ پھیرنے والی عورت مر گئی۔ اماں تھر تھر کانپ گئیں ان کو لگتا کہ اب ضرور بیٹی ہو گی کاش وہ عورت ابھی نہ مرتی۔

ان کی دعائیں زور پکڑ گئیں۔ کچھ وظیفے بھی کرنے شروع کر دیے۔ اتنے عرصے میں زمانہ ذرا جدید بھی ہو گیا تھا۔ گاؤں کی ایک عورت لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاتی تھی اس نے اماں کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر مشین لگا کر بتاتی ہے کہ بیٹا ہو گا یا بیٹی۔

اماں کا دل کانپ گیا۔ ان کو لگا وہ مشین اس کے شوہر کو بتا دے گی کہ اس کی بیوی اپنی کوکھ میں بیٹی کو پال رہی ہے۔

انہوں نے ایک ترکیب سوچی اور ایک دن چھپ کر اسی عورت کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی آئیں ڈاکٹر نے آلہ لگا کر بتایا کہ بیٹا ہے۔"

اماں رونے لگیں خوشی سے آخر وہ بچ گئیں۔

ابھی پیدائش میں دو ماہ رہتے تھے اور وہ دو ماہ اماں نے بڑے خوش ہو کر گزارے وہ بڑی خوش اور نہال رہتیں۔ آخر کار ان کا خاوند آٹھ بیٹوں کا باپ بننے والا تھا۔ وہ سزا سے بچالی گئی تھیں۔ پھر دو ماہ بعد کریم بخش کی بیوی نے ایک خوب صورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا۔

☆☆☆

کریم بخش اپنی حویلی کے برآمدے میں بڑے تکبر سے ٹہل رہے تھے ان کی چال میں بے چینی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ 'جندن دائی' کو لے کر آئے تھے۔ اس نے بڑے بیٹوں کو مٹھائی کے ٹوکرے لانے کو بھیجا تھا۔ دو بیٹے گھر پر نہیں تھے باقی چھوٹے تین جن کی عمر چار سال، دو سال اور سب سے چھوٹے کی ایک سال عمر تھی۔

"ابا۔" چار سالہ سلیم باپ کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔

"جی میرا پتر شیر!"

ابا نیچے بیٹھ گئے۔

"ابا مجھے گڈی چاہیے۔ گاؤں میں سب لڑکوں کی گڈیاں (بہنیں) ہیں صرف ہماری نہیں سارے

گڈے ہی گڈے ہیں۔"
ابا نے اسے زوردار چماٹ ماری تھی۔ وہ بچہ چیخ پڑا۔
"بری چیز مت مانگ پتر۔"
"ابا گڈی تو بہت پیالی (پیاری) ہوتی ہے بلی (بری) تو نہیں۔" تین سالہ ندیم نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔ ابا دھاڑے۔ بچے سہم گئے اور رونے لگے۔ اس گھر میں اماں کے علاوہ کوئی عورت نہ تھی۔ ہمسائی نے بچوں کو چپ کرایا اور استغفراللہ کہا۔
تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ جندن دائی باہر نکلی۔ سنتراں جندن مائی" کریم بخش نے سوالیہ نظریں اس پر جمائیں۔
"بھا کریم تیری ووہٹی ای طبیعت ٹھیک نئی۔"
عورت بہت پریشان تھی اور کانپ رہی تھی۔
"او مائی تو بچے کا بتا پتر ہے نا!"
اب تو دائی اور زیادہ دہل گئی۔
"کریم۔"
"او مائی بس ٹھیک ہوجائے گی سنبھل جائے گی۔ بڑی تگڑی عورت ہے نئی مرتی۔ اٹھ اٹھ پتراں دی ماں ہے کچھ نئی ہوندا"
دائی چپ کی چپ کھڑی رہی۔
پھر کریم بخش اندر آگیا اور جب بچے پر نظر ڈالی تو چیخ پڑا۔ کریم بخش کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی ووہٹی نے بیٹی کو جنم دیا تھا۔

☆☆☆

"ابا مٹھائی" بڑے بیٹے شفیق نے ٹوکرے ابا کے سامنے رکھے۔
"اگ وچ جائے مٹھائی شٹھائی"
ابا نے مٹھائی اٹھا کر پھینک دی تھی میٹھی خوشی کریم بخش کی کچی حویلی کی خاک میں مل گئی تھی۔
"ابا کیا ہوا؟" رفیق نے دہل کر پوچھا۔
پھر ابا کھلی حویلی میں آکر آسمان تلے دھاڑے مار مار کر رو دیا۔
"ہائے میں برباد ہوگیا میں رل گیا۔ میں تباہ ہوگیا۔ میری کمر جھک گئی۔ میں بوڑھا ہوگیا۔ میرے کندھوں پر پہاڑ رکھ دیے رب نے۔
"رب تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے یہ کیا کیا؟"
"آگیا عذاب میرے سر پر کس گناہ کی سزا ملی۔ ہائے...... ہائے...... ہائے"
"کریم بخش تو رل گیا کریم بخش تو رل گیا۔"
پھر کریم بخش حویلی کی چوکھٹ پار کر گیا۔
اندر اماں کو جب پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے تو چند لمحے بنا کسی کے خوف کے کہ اس نے بیٹی کو چوم ڈالا۔ بس چند لمحے پھر شوہر کی آہ و بکاری سنی تو خوف سے اماں کا دل بند ہوگیا۔ سانسیں ساکت ہوگئیں۔
اماں مرگئی۔ اماں کی خدیجہ زور، زور سے روئی تھی۔

☆☆☆

"ہم تو بہت خوش ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہن دی ہے ہم سب بھائیوں کی کتنی چاہ تھی کہ ہماری بھی گڈی ہوں۔"
ساتوں بھائی خوش تھے بے پناہ اتنا خوش کہ اماں کا غم بھی کم لگا۔
ابا نے شکل دیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔
"اس منحوس کو میرے سامنے کبھی مت لانا۔" بھائیوں نے بہت لاڈ اٹھائے بہت مان سے پالا بہت پیار سے۔ اس کا نام خدیجہ رکھا۔
خدیجہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی زمانے کی نظر میں شہزادی تھی۔ بھائیوں کے لیے گڈی تھی اور ابا کے لیے وہ منحوس تھی۔ عذاب تھی، سزا تھی، بوجھ تھی پہاڑ تھی۔ وہ سارا دن لاوارث پڑی رہتی تھی جب رونے لگتی فیڈر منہ میں ٹھونس دیا جاتا جب کپڑے خراب کرتی بھائی بدل دیتے پھر بڑے بھائی کی شادی ہوگئی۔ اس کی بیوی بہت خیال رکھتی تھی لیکن جب اس کے اپنے بچے آگئے خدیجہ پر توجہ کم ہوگئی۔
اللہ کی بندی تھی اللہ نے بھیجا تھا اللہ اللہ کرتے وہ پل گئی۔ ابھی بمشکل سولہ کی ہوئی تھی کہ ابا نے بڑے بھائی سے اس کی شادی کردینے کا کہا۔ بھائیوں نے باپ سے اختلاف کیا۔

ابا نے زور دیا بالآخر سال بعد شفیق بھائی نے اپنے ایک دوست کا بتایا۔

انور دوسرے گاؤں میں ایک نشئی کا بیٹا تھا جس نے غربت میں زندگی گزاری تھی پھر خدیجہ کی شادی انور سے کردی گئی۔ شفیق بھائی نے اسے دبئی کا ویزا لگوادیا۔ بنیادی ضرورتوں پر مشتمل جہیز بھی دیا گیا۔ شادی کے وقت ابا نے برملا کہہ دیا۔

''اب جبکہ میں اس بوجھ سے آزاد ہو رہا ہوں۔ یہ لڑکی دوبارہ ہم سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔''

لڑکی نے سن لیا۔ دل سے باندھ لی بات شاید بھائیوں نے بھی۔ پورے دس سال تک بھائیوں نے اس کو پوچھا تک نہیں تھا۔ خدیجہ نے ہر دن انتظار کیا تھا انتظار کرکر کے تھک گئی تھی۔

اس لیے اب جب وہ دبئی سے لوٹی تو وہ خود کو یہاں آنے سے روک نہ سکی تھی۔ اسے لگا تھا کوئی اسے بلا رہا ہے شدت سے تڑپ سے۔

☆☆☆

ٹیوب ویل کی کالی کوٹھڑی اس کے سامنے تھی۔ درمیان میں ٹیوب ویل تھا اور سامنے حویلی کی دیوار نہ جانے حویلی کا دروازہ کس طرح لگا دیا گیا تھا۔ اس نے تصور میں ابا کا رویہ سوچا۔

کیا ابا مجھے گھر میں گھسنے دیں گے۔

ابا کے بارے میں سوچ کر وہ دہل گئی نہیں اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس کے آنے سے اس کے ابا کو تکلیف ہوگی، ابا کی تکلیف اسے درد دیتی تھی۔

کریم بخش کی حویلی میں گزرے سولہ سال اس نے اس خوف میں گزارے تھے کہ کہیں اس کے وجود سے ابا کو کوئی تکلیف کوئی درد نہ پہنچے۔

ابا کہتے تھے۔ ''اوئے رفیق سمجھا دے اس لڑکی کو میرے سامنے مت آیا کرے۔ کلیجہ جلتا ہے میرا۔''

خدیجہ کو ابا سے بہت پیار تھا اس نے ابا کے حکم کو پلو سے باندھ لیا۔ اس نے ابا کا کلیجہ جلنے سے بچانے کے لیے کبھی ابا کے سامنے آنے کی ہمت نہ کی تھی۔

ابا نے کہا تھا۔ ''مجھے اس منحوس کے ہاتھ کی پکی روٹی نہیں کھانی۔'' اس نے چاہتے ہوئے بھی ابا کے کام کرنے چھوڑ دیے۔ وہ چھپ کر ابا کو بڑے پیار سے دیکھتی تھی۔ اسے اپنے ابا سے بے پناہ محبت تھی لیکن اس کا ابا اسے یہ محبت نچھاور نہیں کرنے دیتا تھا۔ نہ وہ اظہار کرتی تھی، اسے لگتا اظہار سے ابا کو تکلیف ہوگی۔ وہ اس پیار کو اپنے اندر دفن کرلیتی۔

کالی کوٹھڑی کی کچی مٹی پر ہاتھ پھیرتے اسے یاد آیا اس نے ایک بار کریم بخش کو ابا کہا تھا۔

وہ روٹی پکا رہی تھی اس کا ہاتھ جل گیا تھا اس نے بے پناہ تکلیف میں ابا کو پکارا تھا۔ بدقسمتی سے ابا نے سن لیا تھا۔ ابا گرج پڑے تھے۔

''مت بلا مجھے منحوس لڑکی! پتا نہیں کہاں سے ٹپک پڑی۔ ان چاہی سزا۔''

ابا کراہ اٹھے تھے۔ اسے لگا ابا کو تکلیف ہوئی ہے وہ اپنا درد بھول گئی اور یک ٹک ابا کو دیکھنے لگی۔

''شکل گم کر، عذاب کہیں کی۔''

خدیجہ نے شکل گم کرلی تھی۔ تو کیا آج وہ اپنی منحوس شکل لے کر کریم بخش کے سامنے چلی جائے گی۔ اب بھی ان کو تکلیف نہیں ہوگی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔

''نہیں مجھے نہیں جانا چاہیے۔''

اس نے فیصلہ اور واپسی کے لیے قدم موڑ دیے۔

☆☆☆

سخت گرمی کی دوپہر تھی وہ نقاب لیے سستی سے چلنے لگی ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ اس نے ایک دس سالہ بچے کو کالی کوٹھڑی کے اندر جاتے دیکھا۔ اس بچے کے ہاتھ میں چنگیر تھی جس پر روٹی اور سالن تھا دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

بچہ جلدی میں تھا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ پھر وہ رونے لگا شاید اسے چوٹ لگی تھی، وہ اپنا سامان رکھتی بچے کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا بچے۔'' اس نے بچے کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ بچے کا رونا اور تیز ہوگیا تھا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ بچہ نئی عورت کو دیکھ کر حیران ہوا پھر رونا کم کردیا۔

"دادا کا کھانا گر گیا۔"

"دادا؟"

"کیا ہوا سعد پتر" کسی بوڑھے۔ نحیف کی آواز آئی تھی۔ کالی کوٹھری کے دروازے پر کوئی ضعیف لکڑی کے سہارے کھڑا تھا۔

سعد اٹھ کر بوڑھے کے پاس چلا گیا۔

"دادا! آج ہماری باری تھی آپ کو روٹی دینے کی اماں کو بخار تھا اس لیے دیر سے پکائی۔ ابا نے کہا دادا کو دے آؤ، اب دیکھیے مجھے ٹھوکر لگی اور روٹی گر گئی خراب ہوگئی۔ کسی اور سے مانگ لاؤں۔"

"کوئی نہیں دے گا۔ سب گن گن کر روٹیاں پکاتے ہیں کسی کے پاس اضافی ہوگی تو بھی نہیں دیں گی۔ اگلے وقت کے لیے رکھ لیں گی۔"

بوڑھے شخص نے بے جان نظروں سے وہاں نظر ڈالی جہاں اوندھی چنگیر پڑی تھی۔

"یہ عورت کون ہے۔"

"پتا نہیں دادا میں رونے لگا تو میرے پاس آگئی۔" اس نے گری ہوئی روٹی صاف کی چنگیر پر رکھی اور ان دونوں کے پاس چلی آئی۔

بوڑھا کل رات سے بھوکا تھا۔ بھوک کا غم اسے بے ہوش کرنے والا تھا۔ خدیجہ نے جب نوالہ بنا کر اس کے منہ میں دیا تو بنا کوئی بات کیے روٹی چبانے لگا تھا۔

وہی بچہ ٹیوب ویل سے دوبارہ پانی کا گلاس بھر لایا۔ وہ اور بوڑھا کوٹھری کے اندر رکھی چارپائی پر بیٹھے تھے۔

بوڑھے نحیف کی بھوک مٹی، بدن میں قوت تو نہ آسکتی تھی لب بولنے کے قابل ہو چکے تھے۔

"کون ہو لڑکی۔" لڑکی کو حیرت ہوئی۔ جس شخص نے اس کے ساتھ پورے سولہ سال گزارے تھے اس نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ آج اسے کیسے پہچانتا اس کی حیرت غلط تھی۔

"آپ بتائیں آپ کیوں اس حال میں ہیں۔"

"رب نے سات نعمتوں کے بعد ایک رحمت سے نوازا تھا۔ میں مردود اسے بیزار کہتا رہا۔"

بوڑھے کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس کے آنسو گم تھے۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ قدرت جب سزا دیتی ہے تو اسے ٹھکرانے کا اختیار انسان کے پاس نہیں ہوتا۔" بوڑھا اپنی جھکی کمر اور جھکے سر کے ساتھ بول رہا تھا۔ اور وہ آج جی بھر کے اپنے ابا کو دیکھ رہی تھی۔

"وہ مجھے بوجھ لگتی تھی" پہاڑ "میں نہیں جانتا تھا اصل میں تو رب کی رحمت کو ٹھکرانا بوجھ ہے۔"

"رحمت کو عذاب کہنے والے پر عذاب آتا ہے اور میں بدبخت سے ہی عذاب کہتا رہتا۔"

کالی کوٹھری میں چاروں اطراف گھاس پھونس اگی ہوئی تھی۔ بوڑھے کے لیے صرف ایک چارپائی تھی بستر تھا اور ایک ٹرنک۔ ٹیوب ویل اندر ہی لگا ہوا تھا باہر کو پائپ جا رہا تھا۔

خدیجہ کو دن میں اس کوٹھری سے خوف آ رہا تھا۔ اور اس کے ابا نے نہ جانے کتنے سال اس کوٹھری میں گزارے ہوں۔ خدیجہ نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ وہ اپنے ابا کو اس حال میں نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

"مجھے سات بیٹوں کا زعم تھا۔ وہ زعم مجھے یہاں لے آیا۔" ان کو زور سے کھانسی آئی تھیں۔

پورے سولہ سال "وہ" اپنے باپ کے گھر میں مجرموں کی طرح رہی وہ بے قصور تھی۔ اس کے رب نے اس کے قصوروار کو سزا دے دی ہے۔

خدیجہ نے ان کو روکنے کی کوشش کی وہ اپنے ابا کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سننا چاہتی تھی۔

"تم جو بھی ہو آج میرا بوجھ بانٹ لو۔ مجھے بولنے دو۔" خدیجہ چپ ہوگئی۔ ابا کا حکم خدیجہ کے سر آنکھوں پر تھا۔ میں نے تو نفرت میں آ کر اس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی میں نے، مجھے لگتا تھا، اس کی صورت دیکھ کر میرے دن رات منحوس ہو جائیں گے۔

بچی! میں نے رب کے رحم کو ٹھوکر مار دی۔ پچھلے پانچ سال سے اس کالی کوٹھری میں رہ رہا ہوں۔

میرے سات بیٹے جو میرا غرور تھے۔ انہوں

نے مجھے ٹھوکر ماردی، نہ کسی کے دل میں جگہ ہے نہ گھر میں۔ دن میں ایک بار کھانا ملتا ہے۔ ایسا۔"

وہ چپ ہوگئے۔ خدیجہ رونے لگی بلند آواز نہ جانے باپ کا حال دیکھ کر یا اپنا درد تازہ ہونے پر۔

"تو کیوں روتی ہے بچی۔"

بوڑھے کو لگا وہ اس کے انجام پر رو رہی ہے۔

"تمہارا باپ ہے بچی؟"

خدیجہ ساکت رہ گئی۔

"نہیں۔"

"کب فوت ہوئے؟"

خدیجہ کی نظریں اپنے بوڑھے باپ کی کمزور ٹانگوں پر تھی۔

"میری پیدائش والے دن ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

بوڑھے کی ٹانگیں کانپ رہی تھی۔ "میں شادی شدہ ہوں نہ میرا کوئی بھائی ہے نہ ماں باپ۔ شوہر بہت اچھا ہے تین بچے بھی ہیں لیکن......"

وہ آگے نہ بول پائی۔

"کیا ہوا بچی۔"

"میں باپ کے پیار کو ترسی ہوئی ہوں آپ مجھے اپنی بیٹی بنائیں گے۔"

بہت مان سے کہا تھا۔

بوڑھا چند لمحے چپ کا چپ رہا۔ پھر وہ زور، زور سے رونے لگا۔

خدیجہ کو لگا وہ اس کی پیدائش پر بھی ایسے ہی رویا ہوگا۔ کئی لمحے وہ روتا رہا۔ بلند آواز سے خدیجہ چاہ کر بھی چپ نہ کرواسکی۔

"بچی میں ایک بیٹی کا باپ نہیں بن سکتا۔ میں اس قابل نہیں...... میں اس قابل نہیں۔"

خدیجہ چارپائی سے اتر کر اس کے قدموں میں آبیٹھی۔

"خدا کے لیے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ مجھے ابا کہنے کا حق دے دیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گی آپ کا خیال رکھوں گی۔ مجھے بیٹی کہہ دیں۔" وہ بوڑھا رونا بھول گیا۔ اسے دیکھتا رہا وہ یہ کیا کہہ رہی تھی۔

"تم جس کی بھی بیٹی ہو، کمال کی بیٹی ہو۔ یقیناً میری بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی اس نے بھی مجھ سے شکوہ نہیں کیا تھا۔ ہائے ...... ہائے...... میں نے رحمت ٹھکرادی تھی۔"

ہائے...... یہ ناشکروں کا واویلا کتنی دیر سے شروع ہوتا ہے۔

"میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔"

وہ بوڑھا کریم بخش چپ کا چپ رہ گیا۔

"عورت بیٹی کے روپ میں کتنی معصوم لگتی ہے۔" زمین و آسمان جتنا وسیع پچھتاوا تھا جو کریم بخش کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔

خدیجہ اٹھی اپنے باپ کا سامان (جو کہ بہت مختصر تھا) باندھا۔ اپنی چادر سنبھالی اور اپنے شوہر کو کال کی کہ وہ اسے لینے آجائے۔ اسے باپ کی طرح پالنے والے بھائی بھول گئے تھے۔ غیروں جیسا سلوک کرنے والے باپ کا حال وہ ایسا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

خدیجہ جانتی تھی اس کے باپ کو اس کے رب نے سزادی تھی بیٹی کا حق مارنے کی۔

یہ اللہ اور اس کے باپ کا معاملہ تھا۔ اللہ اپنی رحمت ٹھکرانے والوں کو سزا دیتا ہے۔

اس نے اپنے باپ کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کی بیٹی خدیجہ ہے۔ وہ اپنے باپ کی سزا اور پچھتاوے میں اضافہ نہیں کی کرنا چاہتی تھی۔

بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہے معصوم اور پاکیزہ ان کا اپنے والدین کے لیے پیار پائیدار ہوتا ہے لوگ غلط کہتے ہیں کہ بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں۔ بیٹے پرائے ہوسکتے ہیں لیکن جان لو۔

"بیٹیاں کبھی پرائی نہیں ہوتی۔"

بیٹیاں ان کو عطا کی جاتی ہے جن سے قدرت خوش ہو اور رب کی رحمت ٹھکرانے والے کا انجام ہمیشہ کالی کوٹھڑی ہی ہوتا ہے کالی کوٹھری زندوں کے لیے قبر کے جیسی۔

☆

ثانیہ چوہدری

"پیارے بابا!

مجھ میں نہیں آرہا کہاں سے شروع کروں لیکن مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ کوئی ایسی بات جو شاید میں آپ کے سامنے بھی نہ کہہ سکوں۔ اسی لیے میں آپ سے یوں مخاطب ہوں۔ بابا! یہ خط وکتابت بھی کتنا خوب صورت، پیارا سلسلہ ہے۔ کبھی کبھی ہم اپنے کسی بہت پیارے عزیز شخص سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے کچھ بتانا چاہتے ہیں لیکن لفظ زبان کی نوک پر آ کر دم توڑ جاتے ہیں، زبان لڑکھڑانے لگتی ہے اور ہچکچاہٹ ہونٹوں کو سی دیتی ہے۔ میں بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر زبان میرا ساتھ نہیں دیتی بابا!

کیسی عجیب بات ہے۔ اللہ پاک نے مجھے بولنے کی نعمت سے نوازا ہے لیکن یہ زبان وہ کیوں نہیں بولتی، جو میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں، یہ خط بھی زبان پر دم توڑتے الفاظ کے جیسا ہے، لکھ تو رہی ہوں، لیکن آپ کو کبھی دے نہیں سکتی، جو بات آپ سے کہنے کی ہمت نہیں اسے لکھ کر آپ تک کیسے پہنچاؤں؟ کاش بابا! ایسا ہو جائے کہ میں بہت دلار سے آپ کے پاس جاؤں اور آپ ہمیشہ کی طرح اپنی کتاب بند کر دیں اور میری طرف مسکرا کر دیکھیں اور کہیں، میری خوش بخت آگئی ہے اور میں آپ کے گلے میں باہیں ڈال کر کہوں۔

"بابا! میں نے آپ کے لیے کچھ لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں آپ کے نام جتنی بھی نظمیں میں نے لکھیں وہ آج بھی آپ کی دراز میں محفوظ ہیں۔ میں جانتی ہوں بابا! آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور ایک بار آپ نے میرا ماتھا چوم کر کہا تھا۔

"خوش بخت! تم میری بہت قیمتی بیٹی ہو۔ نایاب، کسی بیش بہا خزانے کی طرح ہو میرے لیے۔ تمہارا نام تو نادرہ ہونا چاہیے تھا۔ جانتی ہو نادرہ کا کیا مطلب ہے؟"

اور میں نے فوراً سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نادرہ مطلب قیمتی، نایاب۔"

پیارے بابا! مجھے آپ کے ان لفظوں نے دنوں شاد رکھا تھا۔ بابا! آپ کو پتا ہے باپ کی محبت دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور میں تو خوش بخت تھی کہ مجھے اللہ نے آپ کی چھاؤں، آپ کی محبت سے نوازا ہوا تھا۔

رضیہ بی بی مجھے اکثر بتاتی ہیں کہ جس دن میں پیدا ہوئی، آپ بہت خوش تھے۔ بے تحاشا خوش۔ اور ماما بھی بہت خوش تھیں۔ پھر جب ماما کی ڈیتھ ہوئی تو میں چھ سال کی تھی۔ اپنے گھر میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میں بہت گھبرا گئی تھی۔ خوف سے میرا سانس اکھڑنے لگا تھا اور آپ نے مجھے اٹھا لیا تھا۔ آپ رو رہے تھے بابا! اور آپ کو روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے، مجھے یہ بات تکلیف دے رہی تھی کہ میرے پیارے بابا کی آنکھوں میں آنسو کیوں آئے۔ ماما ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔ مجھے ان کی کمی بہت محسوس ہوتی بابا! اگر میرے پاس آپ نہ ہوتے۔

اور پھر چند سالوں بعد ہمارے گھر شہلا آنٹی آگئیں۔ رضیہ بی بی نے بتایا تھا کہ یہ میری نئی ماما ہیں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ میں بہت خوش تھی کہ ایک بار پھر

سے میرے پاس ماما، بابا دونوں تھے۔

بابا میں آپ کی اچھی بیٹی تھی لیکن جیسے جیسے میں بڑی ہوتی مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ مجھے شہلا آنٹی بری لگنے لگی تھیں۔ وہ مجھے بغیر کسی غرض اور لالچ کے بے حد چاہتی تھیں اور میں ان کی محبت کو ہی سمجھ نہیں سکی۔ مجھے وہ سب ڈھونگ لگتا تھا، مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ آپ کو مجھ سے بدظن کر دیں گی۔ اسی لیے بابا میں نے ان کی شکایتیں لگانا شروع کر دیں آپ سے تاکہ آپ ان کو گھر سے نکال دیں لیکن شہلا آنٹی ہمیشہ آپ کی ڈانٹ برداشت کر لیتی تھیں اور انہوں نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں اور پھر جو میں چاہتی تھی وہ ہو گیا۔ میں چاہتی تھی کہ شہلا آنٹی ہمارا گھر چھوڑ کر چلی جائیں اور وہ چلی گئیں۔ بابا میں اب سمجھ گئی ہوں کہ میں غلطی پر تھی۔ میں نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے دو لوگوں کی محبت گنوا

دی۔ میں نے ان کے لیے برا سوچا تھا لیکن نجانے کیسے میں نے اپنے ہی پیار کرنے والے بابا کو خود سے دور کر دیا۔ بابا! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ مجھ پر غصہ ہیں کہ آپ کی بیٹی، جس پر آپ فخر محسوس کرتے تھے اس کی وجہ سے آپ کو شرمندگی ہوئی۔ میں بہت شرمندہ ہوں بابا! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کہیں گے تو شہلا ماما بھی مجھے معاف کر دیں گی۔ خوش بخت بہت نادم ہے بابا۔

آپ کی بیٹی

خوش بخت!"

خوش بخت نے اپنا خط دھندلی آنکھوں سے مکمل کیا اور اس کی تہہ جما کر ڈائس کے آگے سے ہٹ گئی۔ ڈائس کے سامنے اب اگلا طالب علم اپنا خط پڑھ رہا تھا۔ اس کے کالج کی لٹریری سوسائٹی نے خطوط نویسی پر ایک مقابلہ رکھا تھا۔ آج کل کے جدید دور میں جہاں پیغام ایک سیکنڈ سے پہلے بھی پہنچایا جا سکتا ہے وہیں اس کاوش کا اوّلین مقصد نوجوان نسل کو خط لکھنے کی مٹھاس سے روشناس کروانا تھا کہ کیسے پہلے وقتوں میں نہ صرف خط لکھے جاتے تھے بلکہ ان خطوط کے جواب کے انتظار میں بھی دن گن گن کر گزارے جاتے تھے مگر اب خط کی جگہ موبائل نے لے لی تھی۔

اس مقابلے کا پوسٹر خوش بخت کی نظروں کے سامنے سے بھی گزرا تھا اور وہ جیسے منجمد ہو گئی تھی۔ وہ بھی تو اپنے بابا سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جب وہ ان کے سامنے جاتی تو زبان تالو سے چپک جاتی تھی۔ خوش بخت، جس کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں اور بابا اسے سنتے ہوئے کبھی تھکتے نہیں تھے۔ بابا تو اب بھی اسے دیکھ کر اپنی کتاب بند کر دیتے تھے شاید خوش بخت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن خوش بخت، جسے بابا نے دلیری، بے خوفی اور ہمت نہ ہارنا جیسے اسباق پڑھائے تھے۔ جب بھی ان کے سامنے جاتی شرمندگی کے مارے ہمت ہار جاتی تھی اور واپس پلٹ آتی تھی۔ اسی لیے خط لکھنے کے مقابلے میں خوش بخت نے بھی حصہ لیا تھا اور ایک دن یونہی وہ اپنا خط لٹریری سوسائٹی میں جمع کروا آئی تھی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا خط منتخب کردہ پانچ خطوط میں سے ایک تھا، جسے لکھنے والے نے خود پڑھ کر سنانا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں رزلٹ کا اعلان کیا جانا تھا اور وہ سن سی ہال میں بیٹھی تھی۔ یہ خط اس نے کسی بھی انعام کے لیے نہیں لکھا تھا۔ یہ الفاظ درحقیقت اس کے دل کی آواز تھے، جو وہ اپنے بابا سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہنے کی ہمت نہ پا کر اس نے لکھ لیا تھا۔ ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کے لیے وہ ایک خط تھا مگر خوش بخت کے لیے وہ خط بہت اہم تھا کیوں کہ اس نے اپنے پیارے بابا کے نام لکھا تھا۔ جب وہ خط لکھنے بیٹھی تھی تو کتنی ہی مرتبہ اس کی آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔ بابا کا وہ بے یقین سا چہرہ اور آنکھوں میں پھیلی حیرت جب چشم تصور میں لہرائی تو اس کا دل چاہتا زور سے روئے۔

☆☆☆

اس دن بابا نے دفتر سے دیر سے آنا تھا اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شہلا آنٹی کو بہت تنگ کیا تھا۔ شہلا آنٹی نے اس کا پسندیدہ پالک پنیر اور کھیر بنائی تھی اور اس نے کیا کیا، جان بوجھ کر غصہ دکھاتے ہوئے کانچ کا گلاس زور سے زمین پر دے مارا تھا۔ شہلا آنٹی کا پاؤں بہت بری طرح زخمی ہوا تھا۔ ویسے شہلا آنٹی بھی جانے کس مٹی سے بنی تھیں، وہ ان سے بدتمیزی کرتی پھر بھی وہ ہمیشہ پیار سے پیش آتی تھیں۔

بابا آئے تو وہ سارے کانچ کے ٹکڑے اکٹھے کر رہی تھی۔

"خوش بخت! یہ کیا کر رہی ہو؟" بابا فوراً سے اس کے پاس آئے۔

"بابا! شہلا آنٹی کے لیے پانی لے کر آ رہی تھی تو مجھ سے غلطی سے ٹوٹ گیا۔ شہلا آنٹی نے بہت ڈانٹا ہے۔ وہ کہتی ہیں اندھی کہیں کی، دیکھ کر نہیں چل سکتیں تم۔ مفت کے نوالے توڑتی ہو۔" اس نے آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھرے ہر بار کی طرح شکایت لگائی تھی۔

"بابا! میں سچ کہہ رہی ہوں، گلاس میرے ہاتھ سے اچانک ہی پھسل گیا تھا۔"

بابا غصہ ضبط کرتے فوراً شہلا آنٹی سے باز پرس کرنے کے لیے اٹھے اور وہ چپکے سے مسکرادی۔ اس بار قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ شہلا آنٹی بھی شاید تھک گئی تھیں، اس کی بدتمیزیوں کو برداشت کرتے کرتے۔ اس بار وہ بھی چپ نہیں رہیں اور بول پڑیں۔ انہوں نے خوش بخت سے ایسا کچھ نہیں کہا۔ جھگڑے نے شدت اختیار کی اور شہلا آنٹی اپنا سامان باندھ کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔

خوش بخت کی مانو مراد بر آئی تھی۔ یہی تو وہ چاہتی تھی۔ شہلا آنٹی کے چلے جانے کے بعد کچھ دن اس نے اپنی جیت کی خوشی میں گزارے تھے پھر آہستہ آہستہ اس کا دل اکتانے لگا تھا۔ عجیب سی کیفیات میں دل گھرا رہنے لگا تھا۔

☆☆☆

رضیہ بی بی نے نہایت تاسف سے خوش بخت کی طرف دیکھا۔

''خوش بخت بیٹا! کیا ملا آپ کو ایسا کر کے۔ شہلا بیٹی تو آپ سے اتنا پیار کرتی تھیں، کیوں ایسی حرکتیں کر کے اپنے بابا کو ان سے متنفر کیا آپ نے؟''

''نہیں اچھی لگتیں وہ مجھے، میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں رہیں۔ اگر آپ نے بابا کو بتایا تو آپ کی بھی شکایت لگا دوں گی۔'' اور بابا نے سب سن لیا تھا۔ سب کچھ جب اس نے غصے میں آ کر رضیہ بی بی کو شہلا آنٹی کے گھر چھوڑ کر جانے کا بتایا تھا۔

انہوں نے اسے ڈانٹا نہیں تھا، کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس وہ خاموش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس سے کوئی باز پرس بھی نہیں کی تھی۔

اور خوش بخت سوچتی تھی کہ اس نے اپنے بابا کی محبت گنوا دی ہے

بابا کا بے یقین چہرہ اسے سونے نہیں دیتا تھا اور دل پر منوں بوجھ آ گرا تھا۔ یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔ بابا ہی نہیں اس نے شہلا آنٹی کی محبت بھی گنوا دی تھی۔ وہ اس سے بے لوث محبت کرتی تھیں۔ جب وہ گھر سے گئی تھیں تب بھی انہوں نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا کہ خوش بخت نے سب کچھ جان بوجھ کر کیا۔ وہ ہمیشہ اس کا پردہ رکھتی تھیں لیکن تب اسے ان کی محبت کا احساس ہی کہاں تھا اور اب اس کے جان سے پیارے بابا بھی روٹھ گئے تھے۔ انہیں منانے یا معافی مانگنے جب بھی وہ ان کے پاس جاتی تھی، اسے لگتا تھا اس کا جرم معاف کیے جانے کے قابل نہیں اور وہ الٹے قدموں لوٹ آتی تھی۔ خوش بخت نہیں جانتی تھی بابا تو روز اس کا انتظار کرتے تھے۔

رزلٹ کا اعلان ہو گیا۔ اس کے خط نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی لیکن اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ایک جبری سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنا انعام حاصل کیا تھا۔

☆☆☆

''کاش بابا! آپ میرا خط پڑھ سکتے یا کاش بابا! میں آپ سے یہ سب کہہ سکوں جو میں نے لکھا ہے۔''

انعام اور خط ہاتھ میں لیے وہ جلدی ہال سے نکل گئی تھی۔ اس کی ابھی مزید دو کلاسیں تھیں اور مس رخشندہ بانو، جو اس سوسائٹی کی ہیڈ تھیں، اسے ہال سے نکلتا ہوا دیکھ کر مسکرائیں۔

انہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کال موصول ہوئی تھی اور وہ کال خوش بخت کے بابا جان کی تھی۔ اس کے بابا نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے ناراض نہیں ہیں، ان کی اچھی بیٹی خوش بخت نے جو غلطی کی تھی، اس کے لیے تھوڑی ناراضی دکھانا ضروری تھی۔

''پیاری خوش بخت! تمہارے خط کی ایک کاپی تمہارے بابا کو ارسال کر دی گئی تھی۔ تمہارے لفظوں کی خوشبو اور اس صفحے پر گرے آنسو، مجھے یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ یہ خط خوش بخت نے اپنے بابا کے نام لکھا ہے اور تم واقعی خوش بخت ہو کیوں کہ تمہارے بابا تمہیں سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کی سو خطائیں معاف کر دیتے ہیں کیونکہ یہ وصف انہیں اللہ پاک سے ملا ہے۔''

دیکھ لیتے ہیں اب اس بام کو آتے جاتے
یہ بھی آزار چلا جائے گا جاتے جاتے

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقشِ پا ہوتے تو ممکن تھا مٹاتے جاتے

تھی کبھی راہ جو ہمراہ گزرنے والی
اب حذر ہوتا ہے اس راہ سے آتے جاتے

کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا! شہرِ بے مہر
اک دیا ہم بھی کسی رُخ سے جلاتے جاتے

پارۂ ابر گریزاں تھے کہ موسم اپنے
دُور بھی رہتے مگر پاس بھی آتے جاتے

ہر گھڑی ایک جُدا غم ہے جدائی اس کی
غم کی میعاد بھی وہ لے گیا جاتے جاتے

اس کے کوچے میں بھی ہو، راہ سے بے راہ نصیرؔ
اتنے آئے تھے تو آواز لگاتے جاتے

نصیر ترابی

تمام عمر وہی قصۂ سفر کہنا
کہ آسکا نہ ہمیں اپنے گھر کو گھر کہنا

جو دن چڑھے تو تیرے وصل کی دُعا کرنا
جو رات ہو تو دُعا ہی کو بے اثر کہنا

یہ کہہ کے ڈوب گیا آج آخری سورج
کہ ہو سکے تو اسی شب کو اب سحر کہنا

میں اب سکوں سے رہوں گا کہ آگیا ہے مجھے
کمال بے ہُنری کو بھی اک ہُنر کہنا

کبھی وہ چاند جو پوچھے کہ شہر کیسا ہے
بجھے بجھے ہوئے لگتے ہیں بام و در کہنا

وہ ایک میں کہ میرا شہر بھر کو اپنے سوا
تیری وفا کے تقاضوں سے بے خبر کہنا

وہ اک تُو کہ تیرا ہر کسی کو میرے بغیر
معاملاتِ محبت میں معتبر کہنا

وفا کی طرز ہے محسنؔ کہ مصلحت کیا ہے
یہ تیرا دشمنِ جاں کو بھی چارہ گر کہنا

محسن نقوی

شمع اس راہ پہ جلی ہے ابھی
رنج کی شب کہاں ڈھلی ہے ابھی

گل کھلے ہیں تمہاری آہٹ سے
آنکھ مہتاب نے ملی ہے ابھی

دل کہ جس کو فقیر کہتے ہیں
ایک اُجڑی ہوئی گلی ہے ابھی

کاروبارِ جنوں کی گمنامی
شہرتِ عقل سے بھلی ہے ابھی

چاند اُتریں گے رہگزاروں میں
رسمِ تابندگی چلی ہے ابھی

اب طبیعت بحال ہے ساغر
کچھ ذرا من میں بے کلی ہے ابھی

ساغر صدیقی

کہ وہ اب تک پلٹا نہیں،

اُجالا سسکیاں لیتا رہا گھر میں
دیا دہلیز پر جلتا رہا
جس کو
کسی جاں بخش ساعت میں
مقدس آگ سے روشن کیا اس نے
وہ انسان دیوتا تھا یا مسیحا تھا
وہ بھولا تو نہیں ہوگا
نہ جانے بے وفا دنیا کے کتنے کام تھے
اس کو
نہ جانے کتنے دھندے تھے
کہ وہ اب تک پلٹا نہیں
دیا تو صبح ہونے تک سدا ہی جلتا رہتا ہے
کوئی اتنا بتا دیتا
کہ وہ جن راستوں میں ہے
وہاں اس کو اندھیرا تو نہیں ملتا

ادا جعفری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب آدمی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ اسے بتلادے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن ہے)

فوائد و مسائل:۔

اطلاع دینے میں حکمت یہ ہے کہ وہ دوسرا شخص بھی آگاہ ہو جائے گا، تاکہ یہ محبت دو طرفہ ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے سے محبت اور تعاون کریں، کیونکہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس سے کئی طرح کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر اسے بتا دیا جائے تو وہ بھی اس کی رعایت رکھے گا۔

میٹھی زبان،

کڑوی زبان والے کا شہد بھی نہیں بکتا اور میٹھی زبان والے کی مرچیں بھی بک جاتی ہیں۔

ثنا اسلم رانا، میرب فاطمہ۔ کلور کوٹ

گارنٹی،

ہمارے ہاں سب سے مضبوط وزیر اعظم، نگراں وزیر اعظم ہوتا ہے۔ اس کے پاس تین ماہ کی گارنٹی ہوتی ہے۔

وکیل،

ایک وکیل نے ایک پادری سے مذاقاً پوچھا۔
"اگر شیطان اور پادری میں مقدمہ ہو تو کون جیتے گا؟"

پادری نے جواب دیا۔ "شیطان ہی جیتے گا اس لیے کہ سارے وکیل اسی کی طرف ہوں گے۔"

خواہش،

ایک امیر نے، جو سقراط کا شاگرد تھا، فخریہ یہ کہا۔
"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ میری سب خواہشیں پوری کرتا ہے۔"
سقراط نے کہا۔ "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میری کوئی خواہش ہی نہیں ہے۔"

علم،

مشہور ہے، کسی نے سقراط سے پوچھا۔
"آپ کا علم کہاں تک پہنچا ہے؟"
سقراط نے جواب دیا۔ "مجھے اب یہ علم حاصل ہوا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔"
معترض نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو کسان، جو کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، ان میں اور آپ میں کیا فرق ہے؟"
سقراط نے کہا۔ "یہ فرق ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور کسان اس کو نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔"

وجہ انتخاب،

جلدی امراض کے ایک ڈاکٹر سے کسی نے پوچھا۔
"آپ نے خاص طور پر یہی لائن کیوں اختیار کی؟"
ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ میرے مریض رات کو نہیں جگاتے، دوسری یہ کہ ان کے مرنے کا میرے علاج سے کوئی تعلق نہیں

ہوتا اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔"

رنگ اور خواتین،

○ جو خواتین سبز رنگ پسند کرتی ہیں، وہ ہر حال میں خوش رہتی ہیں۔
○ جن خواتین کی پسند سرخ رنگ ہو، وہ ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں۔
○ سفید رنگ پسند کرنے والی خواتین امن پسند ہوتی ہیں۔
○ وہ خواتین جو رونا دھونا مچائے رکھتی ہیں، کالا رنگ پسند کرتی ہیں۔
○ گلابی رنگ پسند کرنے والی خواتین قناعت پسند ہوتی ہیں۔
○ پیلا رنگ پسند کرنے والی خواتین نرم خو ہوتی ہیں۔
○ وہ خواتین بلندی کی جستجو رکھتی ہیں، جو نیلا رنگ پسند کرتی ہیں۔
○ نارنجی رنگ پسند کرنے والی خواتین نخرے والی ہوتی ہیں۔
○ جامنی رنگ پسند کرنے والی خواتین سچائی پسند ہوتی ہیں۔
○ بھورا رنگ پسند کرنے والی خواتین محنتی اور سخت جان ہوتی ہیں۔

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

چوکے پہ چھکا،

دو شہری بابو کار میں ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ ایک جگہ انہیں سڑک کے کنارے دیوار کے عقب میں سُرخ سُرخ سیبوں سے لدے پھندے درخت دکھائی دیے۔ وہ سیبوں کا باغ تھا، جو ذرا اونچی چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ شہری بابوؤں کو شرارت سوجھی۔ گاڑی ایک جگہ کھڑی کرکے ایک مناسب جگہ دیکھ کر وہ دیوار سے باغ میں کودے اور اندر جاکر بہت سارے سیب توڑ لائے۔ سیب گاڑی میں رکھ کر وہ آگے روانہ ہوئے تو چار دیواری کے کونے پر انہیں مالی کی جھونپڑی نظر آئی۔ جہاں بوڑھا مالی اطمینان سے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

شہری بابوؤں کا ذرا شو مارنے کو جی چاہا۔ انہوں نے سوچا کہ چند سیکنڈ کے لیے گاڑی روک کر دیہاتی مالی کو اپنے کارنامے سے آگاہ کرتے چلیں پھر تیزی سے گاڑی بھگا کر لے جائیں گے۔

چنانچہ گاڑی چلانے والے نے رفتار کم کی اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔

"بڑے میاں! برا نہ ماننا، ہم نے تمہارے باغ سے آٹھ دس کلو سیب توڑ لیے ہیں۔"

بڑے میاں نے حقے کا کش لگایا اور اطمینان سے بولے۔

"بیٹا! تم بھی برا نہ ماننا۔ جب تم سیب توڑ رہے تھے تو میں نے تمہاری کار سے جیک، اسپیئر وہیل اور ٹول کٹ نکال لی تھی۔"

فضہ بلال۔ کراچی

پھر بھی،

عطا (عطاء الحق قاسمی) کے سفرنامہ امریکا (شوقِ آوارگی) کا وہ واقعہ یاد آگیا۔ جب ان سے کسی لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا کہ سچ سچ تمہارے ملک میں شادیاں دولہا دلہن کے بجائے ان کے والدین کی مرضی سے طے ہوتی ہیں اور لڑکا لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوتے؟ تو عطا نے اسے بتایا تھا کہ "یہ بات صرف والدین ہی طے کرتے ہیں، مگر طے کرنے سے پہلے وہ لڑکے اور لڑکی کی رائے ضرور لیتے ہیں۔

اگر وہ ہاں کر دیں تو یہ شادی کر دی جاتی ہے لیکن اگر انکار کر دیں تو ...."

"انکار کر دیں تو کیا ہوتا ہے؟" لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پھر بھی کر دیتے ہیں۔" عطا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

نہلے پہ دہلا،

ایک لڑکی اپنے والد کے ساتھ بک شاپ میں کتابیں فروخت کر رہی تھی کہ اپنے بوائے فرینڈ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

کہنے لگی: "کیا آپ المانی کی کتاب "ابو میرے برابر میں کھڑے ہیں" خریدنے آئے ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا: "نہیں، میں تو ماس ہرنائنز کی کتاب "کب ملوگی" خریدنے آیا ہوں۔"

لڑکی: "یہ کتاب ہمارے پاس نہیں، البتہ باتریس فرد کی کتاب "کل یونیورسٹی میں" مل سکتی ہے۔"

لڑکا: "اچھی بات ہے لیکن کل آپ بلجیکی برنار کی کتاب "رات کو فون پہ بات ہو سکتی ہے" لا سکتی ہیں؟"

لڑکی: "ہاں کیوں نہیں، کیا آپ میشیل دانیال کی کتاب "رات دس بجے کے بعد" بھی خریدنا پسند فرمائیں گے؟"

لڑکے نے جواب دیا: "بسر و چشم۔"

جب لڑکا چلا گیا تو باپ نے بیٹی سے کہا: "کیا لڑکا ان ساری کتابوں کا مطالعہ کر سکے گا؟"

بیٹی نے کہا: "جی ہاں یہ ذہین ہے اور یونیورسٹی میں شریف طالب علم ہے۔"

والد: "اچھی بات ہے بیٹی! لیکن میرے پاس تم دونوں کے لیے دو بہترین کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تم دونوں ضرور پڑھنا۔ ایک ہولنڈی فرانک مارتینز کی کتاب "میں بے وقوف نہیں ہوں، سب کچھ سمجھ گیا ہوں" ہے اور دوسری روسی مورلیس ہنری کی کتاب "کل اپنے چچازاد کے ساتھ شادی کے لیے تیار رہو" ہے۔"

سُنہرا سال،

ہر سال کے اختتام پر ہم یہ ضرور سوچتے ہیں کہ اس سال ہمیں کیا ملا، لوگوں نے ہمیں کیا دیا لیکن کبھی ہم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس سال ہم نے کسی کو کیا دیا، ہو سکتا ہے کسی کو دی ہوئی ہماری ایک چھوٹی سی خوشی اس کے سال بھر کے غم کو بھلا دے۔

کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

محبت اور جنگ،

ایک دفعہ ایک سپاہی نے ٹیپو سلطان سے کہا۔ "کیا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے؟"

ٹیپو سلطان نے تاریخ ساز جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ انگریزوں کا قول ہے، ہم تو کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں جو کچھ ہو، وہ جائز ہو۔"

نہلے پہ دہلا،

ایک عورت ایک دکان سے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی، پولیس نے گرفتار کر لیا۔ عدالت میں پیش ہوئی تو جج نے پوچھا۔

"خاتون! آپ نے دکان سے کیا چرایا؟"

عورت: "جناب میں نے اسٹرابیری کا ایک پیکٹ چرایا۔"

جج: "اس پیکٹ میں کتنی اسٹرابیریز تھیں؟"

عورت: "اس میں چھ عدد اسٹرابیریز تھیں۔"

جج: "فی اسٹرابیری کے حساب سے تمہیں چھ دن جیل میں رہنے کی سزا دی جاتی ہے۔"

"لیکن جج صاحب!" اچانک عدالت کے ہال میں ایک آواز گونجی۔ "اگر اجازت ہو تو فیصلہ لکھنے سے پہلے میری گزارش سن لیں۔"

جج نے اجازت دی تو وہ آدمی آگے کٹہرے میں آیا۔

جج: "لیکن محترم! آپ ہیں کون؟"

آدمی: "جناب میں اس عورت کا شوہر ہوں۔"

جج: "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

آدمی: "جناب! اس عورت نے صرف اسٹرابیری کا پیکٹ ہی نہیں بلکہ ایک پیکٹ چنے بھی چرائے تھے۔"

یہ سنتے ہی جج نے فیصلہ دیا۔ "اس عورت کو فوراً رہا کیا جائے کیونکہ اس کے خاوند نے سچائی کی اعلا مثال قائم کی ہے۔"

اور اس کے بعد سے خاوند گھر سے لاپتا ہے۔

نمرہ عاقب۔ گرین سٹی

خالدہ جیلانی

ارم کمال ________ فیصل آباد

نہیں مجھ کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھا ہوا ہوں
بظاہر خوش ہوں لیکن سچ بتاؤں
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں

نادیہ یاسر ________ گوجر خان

تیرے منظر بھی ہیں ویران میرے خوابوں جیسے
تیرے قدموں میں بھی زنجیر وفا میری طرح
وہی صحرا لئے شب زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانہ جاں دشت وبلا میری طرح

فضہ بلال ________ ڈیفنس گارڈن

جانے کیا کیا خواب بنے تھے پہلے ساون میں، میں نے
جانے اس پر کیا کیا لکھا پہلی پہلی بارش میں

فاکہہ سہیل ________ کراچی

ہر ایک کے نام پر نہیں رکتیں صاحب
دھڑکنیں بہت با اصول ہوتی ہیں

صدف عمران ________ کے ڈی اے

نیند نہ آئے تو چراغوں کو بجھا دیا کرو
رات بھر کسی کا جلنا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا

ندا طارق ________ فیصل آباد

دہرائے گا وہ اپنی کوئی داستان غم
وہ آ رہا ہے پھر میرا غم خوار دیکھنا

مدیحہ یوسف، ایمان ________ کراچی

میرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا
جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

نخبہ اکرم ________ گاؤں گوئیکی

سن کر تمام رات میری داستان غم
وہ مسکرا کے بولے، بہت بولتے ہو تم

حمدہ خان ________ کراچی

پوچھ اس قطرے سے کہ لذت طوفاں کیا ہے
لاکھ طوفان سے جو گزرا ہو گہر ہونے تک
ہم نے مانا دعائیں قبول ہوں گی لیکن
ہم کہاں ہوں گے دعاؤں میں اثر ہونے تک

آسیہ جاوید ________ (بارہ دری) علی پور چٹھہ

اپنے سائے سے اشکوں کو چھپا کر رونا
جب بھی رونا چراغوں کو بجھا کر رونا
لوگ پڑھ لیتے ہیں چہرے پہ لکھی تحریریں
کتنا دشوار ہے لوگوں سے چھپا کر رونا

عائشہ ________ گوجرہ

یہ دن یہ رات یہ لمحے مجھے اچھے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے مجھے اچھے لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا، مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تم ہی تک دائرے اچھے لگتے ہیں

اقصیٰ ناصر ________ گلستان جوہر

لاحاصل کا عشق میں چرچا نہیں کیا
دنیا جو چاہتی ہے تماشا نہیں کیا
منظر سے ہٹ کر کر دیا آسان جدائی کو
اس فیصلے میں بھی اسے تنہا نہیں کیا

ثوبیہ قطب ________ کراچی

ملا ہے ہم کو محبت میں معرفت کا سراغ
وصال ذات تک لے گئی جدائی ہمیں

فائکہ سہیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر اتباف ابرک کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

یقین کی راہ کوئی کیسے اختیار کرے
تمہارے بعد کوئی کس کا اعتبار کرے

حسین بہت ہیں مگر کیا کرے یہ بے چارہ
تمہیں اتارے تو سر پر انہیں سوار کرے

تو دیکھ ہم کو کہ اس کو بھی بے وفا نہ کہا
جو کہہ کے جان ہمیں اور پر نثار کرے

تو میرے حال کو جانے گا ایک ہی صورت
کہ اب کی بار کوئی تجھ سا تجھ کو پیار کرے

ہمارے خواب بھی سادہ رہے ہماری طرح
کوئی تو ایسا ملے سامنے سے وار کرے

گزر نہ جائے کہیں مختلف کناروں پر
انا کی ضد میں کہ دریا کو دو جا پار کرے

یہ انتظار بلا کیا ہے، پوچھنا اس سے
جو ساتھ رہ کے ترے تیرا انتظار کرے

تمہارے ساتھ کا مطلب فقط خسارہ ہے
وہ کس حساب میں ابرک تمہیں شمار کرے

شہرین اسلم کی ڈائری سے

میری ڈائری سے ناصر زیدی کی یہ غزل آپ کو مزود پسند آئے گی۔

ربط و ضبط باہم میں دخل ہو کسی کو کیا
جان بھی چلی جائے اس کے واسطے سو کیا

راز داں بتا آخر تجھ کو تو خبر ہو گی
میرا نام سن کے بھی سوچتے رہے وہ کیا

دوست داریوں میں بھی کلفتیں تو ہوتی ہیں
کتنے لوگ بچھڑے ہیں، ہم بچھڑ گئے تو کیا

بے خبر کہ مرتے ہو ایک آفت جاں پر
پھر سے ان دنوں ناصر باؤلے ہوئے سو کیا

نمرہ، اقرا کی ڈائری سے

میری طرف سے آپ سب کے لیے ناہید قمر کی یہ غزل۔ امید ہے آپ کو اچھی لگے گی۔

کوئی گمان کوئی وعدہ تلاش کرتا ہے
وہ واپسی کا ارادہ تلاش کرتا ہے

بجھا کے دھوپ کے کانٹے وہ میرے پیروں میں
مرے خیال کا سایہ تلاش کرتا ہے

وہ ریت کر کے مرے خوابوں کی زمینوں کو
مرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے

گنوا کے مجھ کو کسی عہد خوش گمانی میں
وہ شاید اب کوئی مجھ سا تلاش کرتا ہے

وہ خوش خیال میرا، ہر نئے تعلق میں
وفا کا ڈھنگ پرانا تلاش کرتا ہے

حبیبہ خان
کی ڈائری سے

جمال زیدی کی یہ غزل نہ جانے کب میں نے ڈائری میں لکھی تھی۔ آج ماضی کے اوراق اُلٹتے ہوئے نظر پڑی۔ آپ سب بہنوں کے لیے۔

اب کیا بیٹھے سوچ رہے ہو، یہ تو اک دن ہونا تھا
جن کی صبح ہونا مشکل ان خوابوں نے کھونا تھا

کاش کہ ان کو دکھ ہوتا غیر کے آنگن کرتے کیوں
بارش کے ان چھینٹوں نے تو میرا صحن بھگونا تھا

اس کی بنا پار لگی ہے دیکھو کتنا اچھا ہے
ورنہ اس کو بھی تو ہم سے اپنے سنگ ڈبونا تھا

یہ کیسی پہچان ہے جس پہ ناز تمہیں بھی کافی ہے
اتنا بھی تم جان نہ پائے، کیا مٹی، کیا سونا تھا

برسوں بعد تھا اس کا چہرہ حیرت کی تصویر لیے
اس کے حسن و جمال کا آخر یہ انجام تو ہونا تھا

صائمہ گل
کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم عباس قیصر کی یہ نظم مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب قارئین بہنوں کی نذر۔

ذرا ٹھہرو کہ تم سے اک ضروری بات کرنی ہے
ادھر آؤ
کہ رستے میں کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا
یہاں بیٹھو
کہ باتیں تو ہمیشہ ہم تسلی سے ہی کرتے ہیں
ہمیں اس طرح مت دیکھو

نہیں تو ہم تمہارے سامنے کچھ کہہ نہ پائیں گے
تو ہاں بس بات اتنی ہے
چلو چھوڑو
کبھی موقع ملا تو پھر بتائیں گے

حمدہ خان
کی ڈائری سے

خالد ندیم شانی کی یہ غزل مجھے میری دوست نے واٹس ایپ کی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

خط کے چھوٹے سے تراشے میں نہیں آئیں گے
غم زیادہ ہیں، لفافے میں نہیں آئیں گے

مختصر وقت میں یہ بات نہیں ہو سکتی
درد اتنے ہیں، خلاصے میں نہیں آئیں گے

اس کی کچھ خیر خبر ہو تو بتاؤ یارو
ہم کسی اور دلاسے میں نہیں آئیں گے

جس طرح آپ نے بیمار سے رخصت لی ہے
صاف لگتا ہے جنازے میں نہیں آئیں گے

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... روبی بٹ
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

وہ ہم سفر تھا

نصیر ترابی کا نام شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انجان نہیں۔ ان کی غزل "وہ ہم سفر تھا مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی" نے ان کو عوام میں بھی روشناس کرادیا۔ یہ غزل انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے المیہ پر لکھی تھی۔

نصیر ترابی کا اپنے آپ کو ادبی رسائل و جرائد، مشاعروں، آرٹس کونسل اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہونے والی نام نہاد ادبی تقریبات سے دور رکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے بہت اچھی پی آر رکھنے کے باوجود شہرت کے لیے استعمال ہونے والے مروجہ طریقوں سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ غزل کا جو مخصوص تہذیبی مزاج اور لب و لہجے کی جو تہذیبی سطح نصیر کے ہاں ملتی ہے، وہ دوسروں کے ہاں ذرا کم یاب ہے۔

نصیر ترابی کو غزل کے اس تہذیبی مزاج کی تربیت اپنے ہی گھر کے علمی و ادبی ماحول سے ملی۔ ان کے گھر میں اردو، فارسی کے نامور اساتذہ اور ان کے اشعار کی شعری لطافتوں اور نزاکتوں پر گفتگو رہتی تھی۔ اپنے والد رشید ترابی (جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے) سے یہ نکتہ سیکھا کہ اچھی غزل کہنے کے لیے فارسی شاعری کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

نصیر ترابی کی غزل میں جو دکھ نظر آتا ہے، وہ اس تہذیبی روح کی بربادی کا دکھ ہے جو تہذیبی معنویت کے سانچے میں ڈھلنے سے پہلے ہی بکھر گئی تھی۔

مرا سفر عجب آشوب کا سفر ہے نصیر
وہ آئے جس میں ہو چلنے کا حوصلہ آگے

حقیقت

گلوکار جواد احمد کا گیت "کساناں" نے بھارت میں مقبولیت کے ریکارڈ قائم کردیے ہیں۔ جواد احمد کا یہ گیت بھارتی حکومت کے خلاف کسانوں کی تحریک کی آواز بن گیا ہے اور تیزی سے زبان زد عام ہو رہا ہے۔ بھارتی میڈیا بھی اس پر واہ واہ کر رہا ہے (واہ واہ تو ہمارا میڈیا بھی کر رہا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ ہمارے کسان کبھی کھڑے ہوئے تو کیا یہ ان کا ساتھ دیں گے؟)

یہ گیت اصل میں فیض احمد فیض کا لکھا "جٹا" ہے جس میں ترمیم کر کے جواد احمد نے اسے کساناں بنا دیا ہے (پر کس کی اجازت سے بھئی؟) اور کچھ الفاظ کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ اس کی موسیقی جواد احمد نے نہیں بلکہ ساحر علی بگا نے ترتیب دی ہے۔

اعتراض

حال ہی میں سننے میں آیا ہے کہ سنجے لیلا بھنسالی لاہور کی ہیرا منڈی پر فلم بنارہے ہیں۔ جس کے لیے انہوں نے عالیہ بھٹ کو کاسٹ کرلیا ہے اور ایشوریا رائے، ودیا بالن، مادھوری اور دپیکا وغیرہ سے مذاکرات جاری ہیں۔

اداکارہ منشا پاشا نے اس بات پر شکوہ کیا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں موجود حقیقی کہانیوں پر بھارتی فلم ساز فلمیں بنا کر ان سے پیسے کمانے کا سوچ رہے ہیں اور ہم افسانوی مواد پر بھی پابندی لگا رہے ہیں اور اس بات پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ اخلاقی طور پر کیسا خیالی مواد دکھایا جانا چاہیے اور کیسا نہیں (ہماری کچھ معاشرتی اور مذہبی اقدار بھی ہیں محترمہ!) ہماری ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے دوسرے لوگ ہمارے ملک اور معاشرے سے تعلق رکھنے والی حقیقی کہانیوں پر فلمیں بنا کر انہیں پوری دنیا میں فروخت کرکے پیسے کماتے ہیں (آپ کو اعتراض فلمیں بنانے پر ہے یا پیسے کمانے پر؟) آخر میں ایسا ہوگا کہ ہم اپنی ہی کہانیاں دوسروں کی زبانی سنیں گے (تو اس میں کیا حرج ہے؟)

تعلق

بدلتے ماحول نے خواتین کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کے اندر اتنا حوصلہ بھی دے دیا ہے کہ وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرسکیں۔ ان ہی خواتین میں نوین وقار کا شمار بھی ہوتا ہے۔ نوین وقار نے میگا سیریل "ہم سفر" سے اپنا کیریر کا آغاز کیا۔ 2012ء میں اظفر علی نے اپنی پہلی بیوی سلمیٰ اظفر کو طلاق دے کر نوین وقار سے شادی کی تاہم یہ شادی 2015ء میں ختم ہوگئی۔

نوین وقار کا خیال ہے کہ عورت کی زندگی میں سب سے اہم وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ خود مختاری کے ساتھ اپنے خوابوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزارے (جیسے اظفر علی سے شادی؟) شادی کے بغیر بھی خواتین زندگی گزار سکتی ہیں (بہت جلدی خیال آگیا) اور لوگوں کو شادی سے متعلق صرف خواتین سے ہی سوال نہیں پوچھنے چاہئیں (مردوں سے بھی پوچھا جاتا ہے)۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ چادر پہننے والی عورت ہی شریف ہے، لباس کا کسی بھی خاتون کے کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ادھر اُدھر سے

☆ اداکارہ ہما نواب سائبر کرائم کا شکار ہوگئیں۔ بینک کا نمائندہ بن کر کال کرنے والے نے اکاؤنٹ بند کرنے کی دھمکی دی اور ذاتی تفصیلات پوچھ کر اکاؤنٹ سے دو لاکھ روپے نکال لیے۔

(اخبار جہاں)

خامشی کو بیاں ملے

امت الصبور

فہمیدہ جاوید......ملتان

فہمیدہ بانو شادی سے پہلے اور اب فہمیدہ جاوید ہے اور ڈائجسٹ پڑھنا ہے میرا پسندیدہ کام، عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہو کر کہتی ہوں جو کہوں گی سچ ہم......

چلیں اب سوالات والے کمرے میں چلتے ہیں۔

(1) ''ڈائجسٹ'' اس لفظ سے ہی اتنی محبت ہے کہ جب بھی یہ لفظ سنتی ہوں تو دل میں سکون اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ پیارے پیارے خواتین، شعاع اور کرن اپنے خوب صورت ٹائٹلو کے ساتھ ساتھ۔ کسی اور جہاں میں لے کر جانے والی ایک چیز، اس کے ساتھ ساتھ روشن موتیوں جیسی پر تفریح اور اصلاحی تحریریں۔ پیسوں کے ساتھ وقت کی قیمت بھی وصول ہو جاتی ہے۔ کتنا مزا آتا ہے جب چالیس سے پچاس صفحات کا مکمل ناول ہو اور رات کے وقت سردیوں کی راتوں میں زیرو والے ہرے یا لال بلب کی روشنی میں ایک کپ گرما گرم کافی یا چائے کے ساتھ خاموشی کی موجودگی میں ہمارے ہاتھ میں نیا یا پرانا شمارہ ہو۔ چادر میں چھپا کر، رضائی میں رکھ کر اسکول کی کتابوں کے بیچ میں رکھ کر۔ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں پسینہ زدہ کپڑوں اور سردیوں کی طویل راتوں میں وہ رسالے پڑھنا۔ وہ یادیں وہ وقت وہ یادوں کے پنگھ، جب بشریٰ رحمن، نسیم سحر، ایم سلطانہ فخر اور نادرہ ورضیہ اپنے سلسلے وار ناول لاتیں اور ہر مہینے ہمارے دلوں کو تھماتی تھیں۔ وقت آگے سرکا تو رفعت سراج اور نگہت عبداللہ آئیں اور چھا گئیں، اس کے بعد رخسانہ نگار اور عمیرہ احمد، فائزہ افتخار اپنی تحریریں ہمیں ہر ماہ پیش کرتی رہیں۔ اسی طرح سمیرا سے پہلے نمرہ احمد آئیں۔ اصلاحی مواد لے کر پھر سمیرا کے ساتھ سائرہ رضا آئیں اور ابھی تک اپنے موتی نما لفظ ہمیں دے رہی ہیں۔ کچھ میری پرانی رائٹرز بھی ابھی تک ہر ماہ بذریعہ تحریر میرے گھر آتی ہیں اور میرا دل لگاتی ہیں جیسا کہ نگہت سیما میری پسندیدہ ترین مصنفہ۔

اللہ کی ایک رحمت اور چار نعمتیں میرے پاس ہیں اور ان کی خوشیوں میں خوش ہوں۔ چلیں اب اپنی اچھائیاں اور برائیاں بتاتی ہوں۔''

(2) ''خوبی یہ ہے کہ غصہ کم آتا ہے۔ جلدی معاف کر دیتی ہوں۔ جانوروں اور پرندوں سے ہمدردی ہے۔ طبیعت نرم اور حساس ہے۔ اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتی ہوں۔ پہلے ایسی نہیں تھی مگر اب ہوں کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ عقل آتی ہے۔ گھر میں تو حلیہ نوکرانی والا مگر کسی فنکشن میں جانا ہو تو تیار ہو کر اچھی لگتی ہوں۔ اب میک اپ بیس کا کمال ہے اور تیس سال پہلے اپنی جوانی کا کمال تھا۔ کھانے میں بقول لوگوں کے کوفتے، میٹھی، بریانی، کباب اور چند دوسری چیزیں خاص کر اروی کے پتے بڑے لذیذ بناتی ہوں اور مزے لے لے کر کھاتی ہوں۔ رشتہ داری کا فارمولا ہے کہ کوئی بلائے نہ بلائے ہم تو سب کو بلائیں گے اور سب کی خوشی اور غم کے شریک ہوں گے۔ اف مجھے شرم آ رہی ہے اپنی تحریر کی تعریف کرتے ہوئے، ویسے ہی جیسے 1990ء کی دلہن شادی کے وقت اپنے مجازی خدا سے شرماتی تھی۔''

''خامیاں زیادہ ہوں گی کہ نماز چھوٹ جاتی

ہے۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے جھوٹ مصلحتاً بولنے پڑتے ہیں اکثر دوسروں کے فائدے کے لیے بھی جھوٹ بولتی ہوں۔ غلط اور ناجائز بات اگر کرنے والے کے منہ پر نہ کہہ سکوں تو کسی کو اپنا حال دل بھڑاس کی شکل میں سناتی ہوں کہ فلاں نے کسی دوسرے کے ساتھ یا میرے ساتھ برا کیا۔ حساس ہوں ابھی بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ شاید کبھی کبھی خودغرضی بھی آتی ہے کہ پہلے میں یا مجھے ملے ہاہاہا۔ بقول لوگوں کے چالاک نہیں ہوں اور تیزی نہیں ہے مجھ میں۔ اللہ نے اتنی ساری نعمتیں دی ہیں۔ شکر کرتی ہوں مگر شاید کم کم، دعا رورو کر کم مانگتی ہوں۔

یہ تھیں خامیاں۔ ہاں بہنوں کسی اور میں یہ خامیاں ہیں؟ یاد آیا یہ بھی شاید خامی ہے کہ دل کھول کر رسالوں میں خط اور سلسلے لکھتی ہوں اور دل کھول کر ہی کچھ زیادہ ہی اچھی بری کہانیوں اور ٹائٹل، سلسلوں، انٹرویوز (جو کہ موسٹ امپورٹنٹ سمجھتی ہوں) پر رائے دیتی ہوں۔

(3)''پسندیدہ مصنفات صرف یہ ہیں جی میری پیاری نگہت سیما، ناہید سلطانہ اختر، نیم سحر، رضیہ بٹ، خالدہ اسد، عظمت عزمی، سیما کمال صوفی، زہرہ ممتاز، لبنیٰ غزل، ریحانہ زیدی، مشرف تمیز، نادرہ رضیہ جمیل، سیما یاسمین، شاہدہ طلعت، بشریٰ رحمن، اے آر خاتون، دلشاد نسیم، نگہت عبداللہ، میری رفعت سراج، نگہت نسیم، ایم سلطانہ فخر، ذکیہ بلگرامی، رخ اور ناہید چوہدری، انجم انصار، رفعت ناہید سجاد، ثمرہ وعالیہ وفرح بخاری، راحت وفرحت وفاخرہ جبیں، رضیہ فرحت، نبیلہ شمیمہ نقوی، شیریں حیدر، نزہت شانہ حیدر، فعت شبانہ، فرحانہ ناز ملک، لبنیٰ عروج، بلقیس کنول، بلقیس ظفر، چاندنی عمران، عطیہ عمر، عالیہ حرا، سحر ساجد، نایاب جیلانی، افشاں آفریدی، سعدیہ رئیس، ناصرہ زیدی، فرخندہ جبیں، عطیہ بانو، عفت سحر طاہر، نازیہ کنول نازی، اقرا صغیر احمد، سمیرا شریف طور، عشنا کوثر سردار، ام مریم، مریم عزیز، آسیہ رزاقی، حیا بخاری، اختر شجاعت، روحیلہ خان، آسیہ مرزا، مہوش افتخار، مصباح علی سید، نعیمہ ناز، تنزیلہ ریاض، آمنہ ریاض، امایہ خان، سلویٰ سیف اللہ بٹ، حمیرا نوشین، مصباح نوشین، قراۃ العین خرم ہاشمی، شبینہ گل اور آگے، یہ آئے گا کہ ختم نہیں ہوں گی۔

(4)''نہیں سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ ہاں مگر دل کرتا ہے کہ کوئی ہمارے لیے بھی سالگرہ منائے، امید ہے کہ اگلی سالگرہ میرا بڑا بیٹا جنید جو یہ تمام خطوط سلسلے لکھتا ہے پوسٹ کرتا ہے وہ میری سالگرہ منائے گا کہ اس سال ہر فرد کی جب گھر میں سالگرہ ہوتی ہے۔ وہ کیک لاتا ہے تو میرے لیے بھی لائے گا۔ لگتا ہے مجھے تو پھر سالگرہ مناؤں گی تصویر کھنچواؤں گی اور مزے سے کیک چاکلیٹ والا کھاؤں گی اور کھلاؤں گی۔''

(5)''شاعری سے کبھی لگاؤ تھا اور اب اتنا زیادہ لگاؤ نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ الفاظ دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ میں یہاں اپنی پسندیدہ شاعرہ کا کلام پیش کرتی ہوں جو ہیں پروین شاکر۔

تو نے بھی سوچا گلہ کم کوئی کام مجھ سے بجا ہے
لیکن اے جان سخن!
تو نے کبھی سوچا
کہ تیری سمت جب میں آنکھ بھر کر دیکھتی ہوں تو
میری ہلکی سنہری جلد کے نیچے
اچانک
اتنے ڈھیروں ننھے ننھے سے دیے کیوں جلتے ہیں؟

جی تو یہ تھیں دل کے کونوں کھدروں کی پوشیدہ باتیں۔ اب بہنوں! آپ مجھے بتایئے گا کیسی لگیں باتیں۔

ثانیہ مرید۔ ڈی جی خان

ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں دوسرے نمبر پر ہوں۔ میرے والدین الحمدللہ بہت اچھے ہیں۔ امی کی تو تعریفیں ہی تعریفیں سننے کو ملتی ہیں۔ ماشاءاللہ سے جوائنٹ فیملی ہے ہماری۔ چاچو کے بچے، ماموں کے بچے سب ایک ساتھ رہتے ہیں ہم۔ بہت مزا آتا

ہے۔ اگر کوئی ہمارے گھر آئے تو بہت خوش ہو کر واپس جاتا ہے اور ہمیشہ آنے کا شوق رکھتا ہے۔ اللہ سلامت رکھے ہماری فیملی کو...... (آمین)

1۔ رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے مجھے پہلے پڑھائی میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اب کرونا وائرس کی وجہ سے پڑھ رہی ہوں۔ دیکھو، کیسے کرونا وائرس نے میری خواہش پوری کردی۔ کب سے خالہ کو رسالہ پڑھتے دیکھ رہی تھی اگر ٹائم ملتا تو پڑھ بھی لیتی۔ لیکن اب میں مستقل پڑھ رہی ہوں۔

شاعری مجھے بہت پسند ہے۔ ناصر کاظمی اور پروین شاکر کی شاعری میرے دل میں اتر جاتی ہے۔ نمرہ احمد، سمیرا حمید اور عمیرا احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ نمرہ احمد کو حکومت کی طرف سے ایوارڈ ملنا چاہیے۔ نمرہ احمد ایک بہت اچھی اور بہت محنتی لکھاری ہیں۔

2۔ خامیوں کے بارے میں پوچھیں ہی نہ۔ صفحے بھر جائیں گے خامیاں ختم نہیں ہوں گی۔ یہ میرے گھر والوں کا کہنا ہے۔ میرے خیال میں میں اتنی بُری بھی نہیں ہوں۔ بہت ضدی ہوں۔ ہر بات منوا لیتی ہوں۔ گھر کے کاموں میں بہت سستی کرتی ہوں۔ بلکہ کرتی ہی نہیں، کوئی دلچسپی ہی نہیں بس میرے پاس کتابیں ہوں، رسالے ہوں اور میں ہوں۔

3۔ بہت حساس ہوں کسی کو غم میں دیکھ کر رو پڑتی ہوں۔ حوصلہ بھی نہیں دے سکتی۔ سیڈ ڈرامے دیکھ کر رو پڑتی ہوں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ بھی نہیں سکتی اور نہ ہی ان کے لیے کچھ کرسکتی ہوں۔ میرے اندر اعتماد نہیں ہے۔ اپنے سے بڑوں سے تو بات کرتے ہوئے بھی رو پڑتی ہوں۔ اساتذہ سے بھی آرام سے بات نہیں کرسکتی۔ دعا کریں کہ میرے اندر اعتماد پیدا ہو جائے۔

مجھے ایئر فورس میں جانے کا بہت شوق ہے۔ لیکن گھر والے اجازت نہیں دیتے۔ دعا کریں کہ میں جلدی ایئر فورس کو جوائن کروں اپنے وطن کے لیے تو میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اللہ میری خواہش کو پورا کرے۔ (آمین)

4۔ سالگرہ...... اس کے بارے میں پوچھیں ہی نہ ہمیں تو پتا بھی نہیں ہوتا کہ ہماری سالگرہ کب ہے۔ مجھے پچھلے سال پتا چلا ہے کہ میری سالگرہ مئی میں آتی ہے۔ وہ بھی ب فارم میں دیکھ کر۔ ہمارے ہاں سالگرہ نہیں منائی جاتی اسے انگریزوں کی رسم مانا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہر انسان کو اپنی سالگرہ پر ایک پودا لگانا چاہیے اور پورا سال اس کی دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ ہمیں آکسیجن سے سانس ملتی ہے اور آکسیجن درختوں سے حاصل ہوتی ہے۔ درخت زیادہ لگائیں گے تو سانسیں بھی دیر تک رو کے گی۔ اس کا مطلب ہے سالگرہ بھی زیادہ منائیں گے۔ (ہاہاہا)

5۔ مجھے پہلے شاعری پسند نہیں تھی لیکن اب پسند ہے کیونکہ میرے ایک استاد سجاد حسین کشور مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ شاعری کرتے ہیں اس لیے ان کی وجہ سے مجھے شاعری پسند آ گئی۔ اب میں ناصر کاظمی اور پروین شاکر کی شاعری بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔

میرا پسندیدہ شعر

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

بہنوں کا
شعاع
اپنا ماہنامہ

بقیہ ہمارے نام

بے حد دلچسپی سے پڑھے ہمیشہ کی طرح۔ شکریہ ان تمام بہنوں کا جنہوں نے میری فیملی کے لیے خاص الخاص دعائیں دیں۔ اللہ آپ سب کو اس کا اجر دے۔ میرے گھر کی ہر خاتون (سوائے والدہ ماجدہ کے) اب بہت دلچسپی سے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتی ہیں اس طرح دونوں آپا کا دھیان بٹا رہتا ہے۔ اور لڑائی جھگڑوں کے شوروغل سے کچھ لمحے "نجات" مل جاتی ہے ورنہ تو دونوں ایک دوسری پر اپنا غصہ نکال کر ہلکان ہوتی رہتی تھیں اور پھر کافی ٹائم منہ پر دوپٹہ ڈالے۔ اپنی اپنی چارپائی پر پڑی رہتیں۔ ہم گاؤں میں رہتے ہیں، ان دنوں ہمارے گھروں میں دیسی مٹھائیاں (پنیاں) طرح طرح کی بن رہی ہیں۔ اماں کو جوڑوں کا درد رہتا ہے، انہوں نے اپنی پسند کے مطابق "السی کی پنیاں بنائی ہیں جنہیں رات دن تناول فرما فرما کر مزاج میں اور گرمی پیدا کر لی ہے۔ ابھی چند لائنیں خط کی لکھی تھیں کہ اماں نے حملہ کر دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ دن کو اماں نے السی کی پنیوں سے پورا پورا انصاف کیا اور شام میں "مچھلی" کھالی جو میں نے کافی مزے کی بنائی تھی۔ اماں کا کمرہ الگ ہے وہ مچھلی بروسٹ کھا کر اپنے روم کی کھڑکیاں اور دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے ڈبل لحاف لے کر سو گئیں اوپر سے اپنی نواسی سے کوئلوں کی انگیٹھی بھی چارپائی کے نیچے رکھوالی۔ گیارہ بجے گرمی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ تو ان کی نظر میرے کمرے کی جلتی لائٹ پر پڑ گئی۔ "اے گوشی! رات کے بارہ بجے کس نگوڑ مارے کو خط لکھا جا رہا ہے۔"

ان کی پاٹ دار آواز سے باہر گھر والے بھی اٹھ گئے۔ بھیا الٹا پاجامہ پہنے ننگے پاؤں اماں کے برابر آ کھڑا ہوا۔ بھابھی لمبی جمائی لیتے آں آں آں کی آواز نکالتے جو کہ منہ پر ہاتھ رکھنے سے نکلتی ہے آدھمکی۔ اس کو اور آپا کو پتا تھا اس ٹائم یہ "لو لیٹر شمارہ، خواتین ڈائجسٹ" کو لکھا جا رہا ہے۔ آپا نے سارا معاملہ سنبھالا اور اماں کو ان کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔

"زندگی ہم تجھے گزاریں گے" ویل ڈن آپا راحت "رنگ ریز میرے" بہت دلچسپ موڑ پر آگیا ہے۔ "رقص شرر" کا رقص لگتا ہے اگلے ماہ واقعی اختتام پر ہے۔ بہت عمدہ موضوع۔

رائٹر خواتین سے میری گزارش ہے گھریلو ٹائپ اور رومانس والی اسٹوریز سے ہٹ کر بھی موضوع چنا کریں۔ کسی کرکٹر اور سیاست دان کی زندگی پر لکھیں یہ بھی بہت حساس اور اہم موضوع ہے۔ زندگی صرف پھول پتیوں، عشق و عاشقی اور کچن کے مسالہ جات اور مٹر چھیلتے نہیں گزرتی۔ سیاست کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ شاہین رشید آپ سے بھی گزارش ہے اداکاراؤں کے ساتھ ساتھ کرکٹر اور کسی سیاست دان سے بھی خصوصی نشست رکھا کریں۔ صرف شوبز کے لوگوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر ہم ہلکان ہوتے رہتے ہیں مومنہ ریاض کا افسانہ "میں بھی بنی ہوں" بہت اعلا ہے۔ سروے روشن لمحے، خوف کے سائے بہنوں کے جوابات بہت بھائے۔ آصفہ زہرا سے ملاقات بہت ڈیسنٹ، بیوٹی ٹپس میں کھیروں کا ماسک میں نے بنا کر ٹرائی کیا۔ بہت اچھا رزلٹ آیا۔

ج: پیاری گوشی! شاہین رشید تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں مفصل اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

فرحانہ شہناز...... اسلام آباد

قارئین سے سروے سب نے بہت اچھا لکھا۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" خواتین کے لیے اچھا اضافہ۔ فرخ کی امی جان نے جیسے کھیر بانٹی راحت جبیں آپ کے انصاف پر مزہ آگیا "رنگ ریز میرے" بالکل جی بقول ڈاکٹر فریال کے صفحات بڑھائیں کیونکہ یہ ہمارا پسندیدہ ناول ہے۔ "حالم" پہلی قسط سے ہی نہیں پڑھ رہے۔ تبصرہ کیسا۔ ویسے میری بھانجی عائشہ حالم کی وجہ سے ہی ڈائجسٹ پڑھتی ہے۔ "رقص شرر" فائزہ ثمرین نے میوزک مقابلے کے بارے میں معلومات حاصل کر کے بہت اچھا ناول لکھا۔ میں تم سے نہ پوچھوں تابندہ کو اتنا ساتھ دینے والا شوہر ملا لیکن سسرال کو خوش کرنے کی کوشش میں سب ہاتھ سے گیا۔ "اک خواب تھا کوئی" بس ٹھیک تھا۔

صفیہ مہر کا گرمیوں کے موسم کا باورچی خانہ بہت اچھا لگا۔ (بھئی اس کی تعریف لازم تھی ورنہ میری طرح آپ بھی دل مسوس کر رہ جاتیں)۔ ''نفسیاتی الجھنیں'' پہلی بار اتنا لمبا سوال تھا ایک کہانی کی صورت۔ باقی کرن کرن روشنی، رنگا رنگ پھول انگوٹھی میں نگینے کی طرح چمک رہے تھے۔

ج: پیاری فرحانہ! آپ دل چھوٹا نہ کریں، آپ کا سلسلہ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوگیا۔ یہی سب سے بڑی تعریف ہے۔ خطوط ایڈٹ کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔

ہمیں ہر ماہ بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں ممکن ہے جو خطوط ہم شامل نہ کر پائے، ان میں کسی قاری بہن نے آپ کے سلسلے کی تعریف کی ہو۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ناہید اسمٰعیل ...... کراچی

سائرہ رضا میری موسٹ فیورٹ ہیں لیکن پہلی بار سائرہ رضا کی باتیں دل کو نہیں بھائیں، وہ اگر کوئی ناول یا افسانہ لاتیں تو کیا ہی بات ہوتی۔ تاریخ کی کیا بات کریں کہ ہر گزرتا لمحہ تاریخ کا حصہ بن رہا ہے۔ ظلم وجبر اور خیر وشر کی جنگ ازل سے ہر قوم نے لڑی ہے۔ ابد تک یہ جنگ جاری رہے گی۔ کسی ایک قوم کی بات نہیں کر سکتے کیونکہ قوم پاکستانی ہو، ہندوستانی ہو، عرب ہو یا ترک۔

بحیثیت مسلمان ہماری اساس اسلام ہے ایک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والی ایک ہی امت، جو ماضی کا حصہ بن چکے، ان پر بحث سے کیا حاصل، عوام ترکی کے ٹرینڈ سے پہلے دبئی اور امریکا جانے کے شوقین بھی رہے ہمارے ہاں خواتین، وحضرات بلکہ بچہ بچہ انڈین غیر مسلم اداکاروں اور ڈراموں کا بھی دیوانہ رہ چکا ہے، سو نو ٹینشن! یہ ٹرینڈ بھی ختم ہو کر رہے گا۔ یہاں ارشد چائے والے کی آنکھوں کے دیوانے صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد بھی تھے یعنی لمحہ فکریہ کے ساتھ یہ بھی اک طمانچہ تھا کر کے......

تاریخ جھوٹی ہو یا سچی، ہے تو مسلمانوں کی تاریخ ناں......اور قومیت کو زیر بحث لانا (وہ بھی ڈائجسٹ میں) نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ بحیثیت مسلم یہ اپنی ہی عیب جوئی ہوگی۔ ڈائجسٹ کئی ممالک میں پڑھا جاتا ہے اور قارئین غیر مسلم بھی ہیں بر سبیل تذکرہ جیسے تبصرے پڑھ کر یقیناً ان کی نظروں میں محض ترکوں کا نہیں بلکہ پوری اسلامی تاریخ کا امیج خراب ہی ہونا ہے کیونکہ ان کی نظر میں ہم ترک یا پاکستانی بعد میں اور مسلمان پہلے ہیں، ہماری سوچ بھی یہی ہونی چاہیے حال پہلے ہی خراب ہے۔ ماضی ہی تھوڑا سا قابل فخر رہ گیا ہے اسے بھی خراب کرنا ضروری ہے کیا؟

بھلے آپ ان سے متفق ہوں لیکن اس طرح ڈائجسٹ کے ذریعے ماضی کے تاریخی دکھڑے پر لکھنا ایک رائٹر کو زیب نہیں دیتا (اور جب رائٹر پسندیدہ بھی ہو تو زیادہ تکلیف ہوتی ہے)

ج: پیاری ناہید! بر سبیل تذکرہ پر ہمیں بہت سی بہنوں کے خطوط موصول ہوئے تھے لیکن ہم اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ اس طرح بہت سے تکلیف دہ حقائق سامنے آنے کا امکان تھا۔ اس لیے ہم نے کوئی بھی خط شائع نہیں کیا۔ آپ کو تکلیف پہنچی اس لیے ہم آپ کا پچھلے ماہ کے خط کا وہ حصہ شائع کر رہے ہیں۔ جو ایڈٹ کر دیا تھا۔

مریم انصاری...... بہاول پور

کبھی سنی سے فیض یاب ہوتے، انشاء جی کو خراج عقیدت پیش کرتے، کرن کرن روشنی پڑھا۔ سروے رپورٹ سے لطف اندوز ہوئے۔ اگلی منزل ''ہمارے نام'' تھی۔ خط پڑھنا کتنا اچھا لگتا ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔ راحت جبیں ہمیشہ سے مسحور کرتی آئی ہیں۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' منظر نگاری ایسی...... لگتا ہے قاری کو کرداروں کی رفاقت نصیب ہے۔ شان دار ناول!!!

صفیہ مہر کے کچن میں جھانکا۔ لسی، پودینے والی چٹنی، روٹیوں نے قدم جکڑ لیے خوش رہیں۔

''رنگا رنگ پھولوں'' میں انصاف کی اہمیت نے دل موہ لیا واقعی۔ نئے سال کی خوشی ابھی محسوس بھی نہ کر پائے تھے کہ روہی کا البیلا، خواجہ فرید کی کافی جیسا، محبتوں سے گندھا، انسان دوست لیٹیین عرفان دور دیس سدھار گیا، صدمے نے نڈھال کر دیا ہے۔ موت حقیقت ہے۔ زندگی فسانہ ہے۔

ج: پیاری مریم بلاشبہ موت سے بڑی حقیقت کوئی

نہیں، کامیاب وہی لوگ ہیں جو اللہ کی وحدانیت پر ایمان لائے۔ اس پر قائم رہے اور نیک عمل کیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا ایمان پر خاتمہ کرے۔ آمین۔

تانیہ تبسم......ملتان

براؤن آنکھوں والی ٹائٹل گرل پیاری لگ رہی تھی۔ ارے نساء جبیں آپ نے شال کہیں میری پھپھو کی تو نہیں چرائی؟ اس کے بعد فہرست پر نظر دوڑائی۔ قسط وار ناول میں پڑھتی ہی نہیں ہوں اور میری آپیوں نے جب دیکھا کہ راحت جبیں اپنے نئے ناول کے ساتھ تشریف فرما ہیں تو خوشی سے اچھل پڑیں۔

''آدم حوا کا ساتھ'' نام کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ناول بہت اچھا ہو گا مگر کچھ خاص نہیں تھا، یہ میں نہیں میری آپی کہہ رہی ہیں۔ بھئی مجھے تو بہت پسند آیا۔ حنا بشریٰ کا ناولٹ بھی بہت اچھا لگا۔ افسانے سب اچھے تھے ارے زینب نور آپ کو بہت مبارک, آپ کی پہلی کاوش بار آور ثابت ہوئی۔ ''خط آپ کے'' میرا پسندیدہ سلسلہ......خط سب ہی اچھے تھے اور جواب اور بھی اچھے، اتنا خط پڑھتے ہوئے مزہ نہیں آتا جتنا کہ جواب پڑھتے ہوئے آتا ہے۔ ارے حمیرا اگل آپی میرا نام بھی حمیرا ہے مگر کہتے مجھے سب تانیہ ہی ہیں کیونکہ یہ نام میری آپی نے رکھا تھا میرا اور انہوں نے ہی مجھے پالا ہے کیونکہ میری جڑواں بہن کو میری امی سنبھالتی تھیں اور مجھے آپی......حمیرا اگل آپی میں بھی ملتان میں ہی رہتی ہوں, کبھی آئیں مجھ سے ملنے اور نہیں تو مہندی لگوانے ہی آجائیں۔ میں نے مہندی کا کورس مکمل کیا ہے۔

ڈاکٹر فریال خان......ڈی جی خان

آج کل اتنا مصروف ہوں کہ یقین کریں دل چاہتا ہے میرا منہ کوئی لے جائے اور دھلوا کے پھر لگا دے۔ رسالہ بھی کچھ آج پڑھنا ہے، کچھ پڑھ لیا بس یہ تھا حال۔ سنا ہے اس بار کراچی میں بہت سردی ہے کیا واقعی ایسا ہے؟ میرا آج ذرا بھی موڈ نہیں ہے تبصرہ کرنے کا کیونکہ عفت صاحبہ کو پڑھ کر دل ہولتا رہتا کہ اب طلاق ہوئی اور تب طلاق ہوئی۔ پھر پڑھا حالم کو دل تو باغ باغ ہو گیا مجھے تو شک تھا میرے دل میں مالٹوں کا باغ ہی نہ اُگ آئے۔ ویسے نمرہ! اللہ آپ کو صبر و جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ رقص شرر، اللہ اللہ فائزہ ثمرین زبردست بہت بہت اعلا۔ آپ کے منہ میں گھی شکر بلکہ پورا گڑ اور سارا گھی اللہ کرے، یہ سب کو سمجھ میں آجائے جو میوزک سنتے اور اس پر تھرکتے ہیں، میں تو شکر ہے شادیوں میں کم ہی جاتی ہوں، ٹائم ہی نہیں ملتا اور ہمارے ہاں تو خیر میل فی میل الگ الگ ہوتے ہیں شکر ہے اللہ کا۔ یقین کریں ذہن کی گرہ کھل گئی ہے واقعی لوگ یہی کہتے کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ اب پتا چلا روح نہیں شیطان کی غذا ہے۔ بس اللہ ہم سب کے ایمان کو سلامت رکھے آمین۔ راحت جبیں ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' اچھا لکھ رہی ہیں اور شکر ہے زرمین کو عقل آئی، اپنی امی سے بات کرلی۔ کیونکہ میں بھی یہی سمجھتی ہوں ماں باپ کو ہر بات ضرور بتائی جائے۔ میں ایسے ہی کرتی ہوں۔

میں نے کراچی نہیں دیکھا۔ کوئی مجھے دکھا دے۔ اماں نے پوچھا فری اس رسالے میں کیا ملتا ہے میں نے کہا اماں دنیا جہاں کی سیر، اماں نے کہا تو کراچی بھی اس سے دیکھ لو ہاہا، پھر سمجھیں چراغوں میں روشنی رہی۔

☆ پیاری فریال! کراچی کا موسم بہت بے اعتبار ہے۔ اس بار دسمبر میں سردی ہوئی۔ تو ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اس بار سردی خوب پڑے گی۔ لیکن ہوا کیا؟ ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پھر وہی گرمی۔ اب یہ حال ہے کہ دن میں پنکھے چل رہے ہیں۔ راتیں کچھ ٹھنڈی ہوتی ہیں لیکن کچھ لوگ تو رات کو بھی پنکھا چلا کر سوتے ہیں۔

آپ کی اماں نے آپ کو لاجواب کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اسٹور میں چھپ کر پرچا پڑھیں یا ہسپتال میں، آپ کی امی جانتی ہیں کہ آپ رسالے پڑھتی ہیں۔ بہتر یہ ہے اب ان کو راضی کر کے ان سے اجازت لے لیں۔ کب تک اسٹور کے چوہوں سے ڈرتی رہیں گی۔

دل میں مالٹوں کا باغ......! واہ بھئی مالٹے تو ہمیں بہت پسند ہیں جب مالٹوں کا باغ اُگ آئے تو ہمیں ضرور بھجوایئے گا۔

ثانی رانی شانزے......گاؤں نوشہری خان، سنگجانی، ٹیکسلا

شعاع کرن اور خواتین کے ساتھ ہمارا ناتا تیرہ چودہ سال پرانا ہے۔ اور یہ بالکل نہیں کہوں گی کہ پرچوں کا معیار ہمیشہ کی طرح بلند ہے بلکہ معیار کا گراف اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہم پڑھنا تو نہیں چھوڑ سکتے ناں (آہم!)۔ یہ ہمارا پہلا خط ہے اب یہ ہی آخری ہوگا یا نہیں؟ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اور اس کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ کسی کہانی کو پڑھ کر جو سوال ذہن میں آتے تو یہ ہی سوچتی کہ کتنا اچھا ہو کوئی بہن اپنے خط میں یہ سوال پوچھ لے خیر۔ اچانک میرے سوئے ہوئے ذہن میں آیا کہ ہمارے بالکل ساتھ والے گاؤں میں بھی تو پوسٹ آفس ہے۔ پانچ منٹ کی ڈرائیو پہ، تو پھر کیا تھا۔ بھائی کے پیچھے پڑ گئی کہ جاؤ اور لیٹر پوسٹ کروا کے آؤ۔ ہمیں تمام ڈائجسٹ خاور اور زوہیب (چھوٹے بھائی) ہی لا کر دیتے ہیں۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے ہمیں ہر ماہ کا رسالہ وقت پہ مل جائے یہ ناممکن ہے۔ بھائی جب شہر جاتے ہیں تو لے آتے ہیں کبھی شروع کی تاریخوں میں مل جاتا ہے تو کبھی پورا مہینہ گزرنے کے بعد۔ تو جناب ''کہنی سُنی'' سے لے کر ''بیوٹی بکس'' تک سب کچھ چاٹ لیتے ہیں۔ ''رنگ ریز میرے'' مائی موسٹ فیورٹ ناول، مجھے لگتا ہے اس میں حریم کے ساتھ زیادتی ہے۔ پلیز آپی اس کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں۔ تھوڑے بڑھا دیں۔ اور نمرہ آپی پلیز ''حالم'' اب بور کر رہا ہے۔ کچھ نیا لے کر آئیں۔ ''نفسیاتی الجھنیں'' بہنوں کے دکھ اور بے وقوفیاں پڑھ کر دل اداس ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک عدنان بھائی کو اجر دے، بہت اچھے مشورے دیتے ہیں۔ مکمل ناول کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے۔ ہم بہنیں خط بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ کچھ خاص پسند نہیں ہے ہمیں اور ریکویسٹ ہے کہ سماء 107-4Fm کے ''عمران حسن'' اور دوستی 98 FM کے ''اسفندیار خان'' کا انٹرویو لیں۔

ج: پیاری ثانی رانی! ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ اور بہت اچھا تبصرہ کیا۔ آپ کے بھائیوں خاور اور زوہیب کا شکریہ کہ وہ آپ کو رسالے لا کر دیتے ہیں اور انہوں نے آپ کا خط بھی پوسٹ کیا۔

آپ کی رائے ہم متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

حمیرا شفیع......صادق آباد

سرورق معصوم، حسین، کم عمر دلہن سے مزین تھا۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو دل خوش ہو گیا۔ تمام پسندیدہ مصنفات کی تحریریں موجود تھیں۔

افسانے اس بار پانچ ہیں اور پانچوں ہی سبق آموز۔ خاص طور پر شازیہ جمال اور قانتہ رابعہ جی کا بہت پسند آیا۔ ''تتلی جیسا پیار'' آخری قسط میں آخر کار راحت باجی نے صائم اور زیبی کو بغیر کسی بڑے دنگے فساد کے آپس میں ملا ہی دیا۔ فائزہ ثمرین اور فرح بھٹو دونوں کے ناول لاجواب تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کا زور قلم اور زیادہ کرے۔

نعیمہ باجی کا ناولٹ ''ایک انوکھا ایک البیلی'' بھی مزا دے گیا۔ ''خلش'' شبانہ شوکت نے بھی بہت اچھا لکھا۔ خاتون کی ڈائری میں دانیہ عقل اور سمیرا ستار کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ ''آپ کا باورچی خانہ'' میں گل صاحبہ نے کوفتے اور سوجی کا حلوہ دو ترا کیب پیش کیں۔ پڑھتے ہوئے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہم بھی کسی روز بنانے کی کوشش کریں گے۔

''نفسیاتی الجھنیں'' میں زینب عمر کے شوہر کے خود غرضانہ رویہ نے افسردہ کر دیا۔ عدنان بھائی نے اچھا مشورہ دیا۔

آخر میں بات کروں گی اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ سلسلے ''ہمارے نام'' کی۔ بہنوں کی خوب محفل جمی تھی۔ ہر تیسرے خط میں کوئی نہ کوئی بہن اپنی تحریر کا پوچھتی پائی گئی۔ اس سلسلے میں میری ایک تجویز ہے۔ آپ ہر مہینے دو کالم شائع کریں، ایک قابل اشاعت اور دوسرا ناقابل اشاعت۔ صرف تحریر کا نام اور شہر لکھیں۔ رائٹر کا نام مت لکھیں تا کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

☆ پیاری حمیرا! ہم فہرست شائع کر دیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ خطوں میں بہنیں اپنی تحریروں کے متعلق پوچھتی رہیں گی۔ ہماری قارئین پھر ہم سے یہ پوچھیں گی کہ ان کی کہانی ناقابل اشاعت کیوں ہے۔

آپ نے تمام سلسلوں پر بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ بہت اچھا لگا۔ افسانہ فریحہ اشتیاق نے لکھا تھا، سہواً فریحہ اشفاق شائع ہوا۔ اس سہو کے لیے ہم فریحہ اشتیاق سے معذرت خواہ ہیں۔

☆

آپ کا باورچی خانہ

بشریٰ یامین ملک

عموماً کوکنگ کی ذمہ داری عاصمہ کی ہے، اکثر میں بھی کھانا بنالیتی ہوں لیکن سویٹ ڈش بناتی ہو تو میں ہی بناتی ہوں۔

س: کھانا بناتے ہوئے کن باتوں کا دھیان رکھتی ہیں، صحت، غذائیت یا گھر والوں کی پسند ناپسند؟

ج: کھانا بناتے ہوئے سب سے پہلے تو میں صفائی کا بے حد خیال رکھتی ہوں اس بات کا بھی خیال رکھتی ہوں کہ کوئی مسالا کم نہ ہو۔ میرا بنایا ہوا کھانا سب کو پسند آجائے۔ غذائیت کو بھی نہیں بھولتی اور صحت کا دھیان اس طرح رکھتی ہوں کہ مسالے تیز نہ ہوں، بہت توجہ سے کھانا بناتی ہوں۔ ویسے ہمارے ہاں اتنے نخرے نہیں ہوتے۔ چاول ابالتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھتی ہوں کہ ٹوٹ نہ جائیں کیونکہ ابو جان سیل فون کی روشنی میں اسپیشل جائزہ لیتے ہیں (کہ چاول ثابت بھی ہیں یا......) اور میرے دل کی دھڑکن پچاسی بار فی منٹ ہو جاتی ہے۔ (ہاہاہا)۔

س: کھانے کے وقت گھر میں اچانک مہمان آجائیں تو کیا کرتی ہیں، فوری تیار ہونے والی ڈش کا نام......جو پیش کر سکیں؟

ج: گھر میں اچانک مہمان آجائیں تو کوئی مسئلہ نہیں، ویسے بھی ہفتہ میں چار دن بیف، مٹن یا چکن بنتا ہے، وہی پیش کر دیتے ہیں۔ ساتھ میں نکیاں، چٹنی، اچار اور سلاد......اگر ایسا نہ ہو تو پھر بریانی منگوا لیتے ہیں۔ اگر مہمان بتا کر آئیں تو پھر عاصمہ چکن یا بیف پلاؤ، چکن کڑاہی اور چکن میکرونیز بنالیتی ہے۔ میں سلاد اور سویٹ ڈش بنالیتی ہوں۔

س: صبح کا ناشتہ کیا بناتی ہیں کوئی اسپیشل ڈش؟

ج: صبح کا ناشتہ وہی عام سا ہوتا ہے چائے، سالن ہمراہ پراٹھے یا سادہ پھلکے۔ چائے کے ساتھ محمد علی اور جویریہ بسکٹ یا کیک لازمی لیتے ہیں اور میں بسکٹ، سادہ کیک یا فروٹ کیک لیتی ہوں۔ اسپیشل کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی نان حلیم، نان چنے اور حلوہ پوری منگوا لیتے ہیں۔ سردیوں میں صبح صبح تازہ سوہن حلوہ ناشتہ کا لازمی حصہ ہوتا ہے اور کبھی سوجی والا۔ اگر سردیوں میں آنکھ دیر سے کھلے اور ناشتہ لیٹ ہو جائے تو ریڈی میڈ ناشتہ منگوا لیتے ہیں اور ہاں، ناشتہ میں آملیٹ بھی ہوتا ہے۔

س: مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتے ہیں؟

ج: ایک بار بھی نہیں۔ اگر شاپنگ پر جائیں تو برگر یا سینڈوچ کھالیتے ہیں (لیکن یہ کھانا اور بات ہے) اگر دل چاہے تو ہم بھائی سے دہی بھلے، شوارما، برگر، بریانی، قیمہ والے سموسے، چپلی کباب، تلے ہوئے نان اور بروسٹ چکن منگوا لیتے ہیں (صرف بروسٹ چکن باہر کھاتے ہیں)۔

س: کچن کی صفائی کے لیے خصوصی انتظام کیا کرتی ہیں؟

ج: کچن کی صفائی کے لیے خصوصی انتظام یہی ہوتا ہے کہ لیمن میکس ڈش واش لیکوئیڈ و دا اسفنج کی مدد سے فریج کو چمکاتی ہوں۔ کچن کے پردے اور چولہے اچھی طرح دھوتی ہوں۔ شیلف پر بچھی شیٹ کو اچھے سے صاف کرتی ہوں۔ گرم پانی سے فرش دھوتی ہوں

اور کیبنٹ کی صفائی کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ عام روٹین میں ڈسٹ بن کی صفائی کرتی ہوں (کوڑا پھینک کر)۔ کوکنگ کرتے وقت استعمال شدہ برتن فوراً دھو دیتی ہوں (عاصمہ کی طرح نہیں کہ پورے کچن کو پھیلا کر رکھ دوں)۔ عاصمہ شرم سے ڈوب مرو کیونکہ میں تمہیں شرم دلا رہی ہوں۔

س: کھانا بناتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

ج: جی بالکل۔ موسم سرما میں پائے، گجریلا، فرائی فش، گڑ والے چاول، ابلے ہوئے انڈوں اور آلو کا سالن، مکس سبزی، مٹر پلاؤ، آلو مٹر، قیمہ مٹر، شملہ مرچ اور قیمہ، ساگ، مولی، میتھی، ساگ، آلو والے اور سادہ پراٹھے۔ موسم گرما میں کڑی چاول، دال چاول، چنے چاول، بیف پلاؤ، چکن پلاؤ، حلیم، بھنا ہوا گوشت، کدو کا رائتہ، ساتھ ابلے ہوئے چاول، کھچڑی، بھنڈی گوشت، کریلا گوشت۔ برسات کے موسم میں بارش کے آثار دیکھتے ہی کچن کی کھڑکی کھول کر موسم بھی انجوائے کرتی ہوں اور چولہے پر ایک طرف چائے اور دوسری طرف پکوڑے بنا لیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ فل سے تھوڑا کم والیوم میں گنگنا رہی ہوتی ہوں، بہت مزا آتا ہے۔ بارش میں چائے اور پکوڑے یا پھر چائے اور گلگلے ہوں تو......

س: اچھا کھانا بنانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج: اچھا کھانا بنانے کے لیے اتنی محنت کی قائل ہوں (بھئی میرے ہاتھوں کی طرف دیکھیے، کتنی دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، ہاہاہا)۔ یعنی بہت زیادہ محنت کی قائل ہوں۔ صرف کھانا بنانے کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر کام میں محنت کی قائل ہوں۔ اچھا کھانا بنانے کے لیے محنت اور تمام مسالے ہوں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کھانا اچھا نہ بنے۔

س: کچن کی کوئی ٹپ؟

ج: اگر کچن میں کاکروچ ہوں تو ہر کیبنٹ میں سرف کے پیکٹ بنا کر رکھیں یا پھر کیڑے مار پاؤڈر اچھی طرح چھڑک کر شیٹ بچھا دیں (شیٹ بچھانے سے کھانے پینے کی اشیا پر اثر نہیں پڑے گا)۔

اگر پیاز جلد فرائی کرنا ہو تو دو چٹکی نمک ڈال دیں، جلد فرائی ہوگی۔ اگر چیونٹیاں کچن میں تباہی مچاتی ہوں تو سورۂ نمل کی آیت نمبر سترہ (اول و آخر درود شریف) سات بار مٹی پر پڑھ کر دم کریں، چیونٹیاں ختم ہو جائیں گی۔

روٹیاں نرم بنانے کے لیے آٹا گوندھتے وقت تھوڑا سا بیکنگ پاؤڈر ڈال دیں، روٹیاں بہت نرم بنیں گی۔

سالن میں شوربا زیادہ ہو جائے تو بھنی ہوئی سوجی کے دو چمچے ڈال دیں، سالن کا ذائقہ بہت اچھا ہو جائے گا اور شوربا بھی گاڑھا ہو جائے گا۔

فریج میں برف جم جائے اور اسکریپر سے صاف نہ ہو تو کھانے والا نمک، برف پر تہہ کی طرح بچھا دیں، برف پگھل جائے گی۔

پیتل کے برتن چمکانے کے لیے لیمن جوس ایک چمچہ لے کر اسٹیل کے جونے سے اچھی طرح برتن کو مانجھیں، برتن کی چمک دیکھ کر آپ کے ساتھ ساتھ سورج بھی حیران رہ جائے گا (ہاہاہا)۔

اگر گوشت یا قیمہ جل جائے اور جلنے کی بو آنے کا خدشہ ہو تو تھوڑا سا دودھ ڈال کر بھنائی کریں، بو نہیں آئے گی (اگر بہت زیادہ جل جائے تو یہ ٹپ استعمال نہ کریں)۔

عاصمہ جب کچن میں کوئی کام کرنے جائے تو ایسا گھمسان کا رن مچاتی ہے کہ ہم (یعنی میں) دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پلیز دعا کیجیے گا کہ اللہ میری بڑی سسٹر کو تھوڑا سا سلیقہ عطا فرمائے تاکہ یہ سسرال میں جا کر امی جان کی پیاری سی ناک کٹوانے میں ناکام رہے (ہی ہی ہی)۔ بتانا مت بھولیے گا کہ آپ کو میری شرکت کیسی لگی کیونکہ میں ننھی سی (اتنی بھی نہیں بلکہ سترہ سال کی ہو چکی ہوں) بچی ہوں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن مونگ پھلی کے ساتھ

اجزاء

چکن	تین پاؤ سے ایک کلو
شملہ مرچ	تین سے چار عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار عدد
آئل	ایک کپ
چینی	دو چائے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ
انڈے کی سفیدی	دو کھانے کے چمچے
مونگ پھلی	آدھا کپ
پیاز (درمیانی)	دو عدد

ترکیب:

چکن (سالم یا سینے کا پیس لے لیں) کے ٹکڑوں کو چھری کے ساتھ ہلکے ہاتھ سے کٹ لگائیں۔ اب ان کی چھوٹی بوٹیاں کرلیں۔ کارن فلور (پانی میں گھول لیں) اور پندرہ منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب شملہ مرچ کے چوکور ٹکڑے کرلیں۔ پیاز کے چار ٹکڑے کرلیں۔ ادرک کو لمبائی کے رخ سے باریک کتر لیں۔ آئل کو گرم کریں۔ پھر اس میں چھلی ہوئی مونگ پھلی ڈال کر براؤن کریں۔ اور نکال کر ٹشو پر پھیلا دیں۔ اسی آئل میں چینی براؤن کرلیں۔ اب مسالا لگا کر گوشت ڈال کر الٹ پلٹ کریں۔ پانچ منٹ بعد پیاز اور شملہ مرچ ڈال دیں۔ اور ادرک بھی شامل کردیں۔ جب ان کی رنگت تبدیل ہونے لگے (تقریباً سات سے آٹھ منٹ بعد) تو ایک چائے کا چمچہ سرکہ ڈال دیں۔ اب دو منٹ بعد سویا ساس، اور نمک شامل کریں۔ پانچ سے سات منٹ پکائیں۔ تلی ہوئی مونگ پھلی، ہری مرچ ڈال دیں۔ اور برتن کو ڈھک دیں۔ جب مرغی گل جائے تو اتار لیں۔ ابلے ہوئے چاول یا فرائیڈ رائس کے ساتھ نوش فرمائیں۔

گارلک مایو ونگز

اجزاء

مرغی کے بازو	بارہ عدد
پسا لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
کُٹی لال مرچ	ایک سے دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	آدھا کپ
انڈا	ایک عدد
نمک	حسب ضرورت

ساس کے لیے

مایونیز	ایک کپ
کٹا ہوا لہسن	چار جوے
نمک	حسب ذائقہ
کالے زیتون	دو سے تین عدد

ترکیب:

ونگز میں لہسن ادرک، لال مرچ، کارن فلور، انڈے اور نمک کے ساتھ تیس منٹ کے لیے میری نیٹ کرلیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کرکے اس میں ونگز کو فرائی کرلیں یہاں تک کہ یہ کرسپی ہوجائیں اور گل جائیں۔

ساس کے لیے: ایک پین لے کر اس میں مایونیز ڈال دیں۔ پھر اس میں لہسن، نمک اور کالے زیتون ڈال کر مکس کرلیں اور چولہا بند کردیں۔ اب ساس کو ونگز کے اوپر ڈال کر سرو کریں۔ (زیتون کے بغیر بھی بن سکتا ہے)

ایرانی چکن ود بٹر رائس

اجزاء

چکن	آدھا کلو (ہڈی کے بغیر)
پیاز	ایک عدد
لہسن	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ

کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی دار چینی	ایک چائے کا چمچہ
زعفران ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
مایونیز	دو کھانے کے چمچے
سرکہ یا لیموں کا رس	تین کھانے کے چمچے

چاول کے لیے

چاول	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

سبزیوں کے لیے

مکھن	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
آلو	ایک عدد

چکن کے لیے: تمام مسالوں کو چکن کے ساتھ ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر پیاز اور لہسن کو چکن سے الگ کرلیں۔ چکن کو اسکیورز پر لگا کر باربی کیو کرلیں یا کسی پین میں تھوڑے سے تیل میں فرائی کرلیں۔ چاول کے لیے، مکھن کو گرم کرلیں اور پہلے سے ابلے ہوئے چاولوں کو نمک اور کالی مرچ ڈال کر دم دے دیں۔

سبزیوں کے لیے: مکھن گرم کرکے کیوبز کی شکل میں کٹی ہوئی تمام سبزیوں کو نمک اور کالی مرچ کے ساتھ سوتے کرلیں یہاں تک کہ سبزیاں نرم ہوجائیں۔ سرونگ کے لیے: چکن چاول اور سبزیوں کو پلیٹر میں ڈال کر سرو کریں۔

بیف چاؤمن

اجزاء

انڈر کٹ	آدھا کلو
سویا ساس	تین کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	تین کھانے کے چمچے
چینی	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
نوڈلز	آدھا پیکٹ
تیل	حسب ضرورت
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
بند گوبھی	ایک چھوٹا پھول
شملہ مرچ	دو عدد
گاجر	دو عدد
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی مرچ، کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تل کا تیل	ایک چائے کا چمچہ
ہری پیاز کے پتے	آدھی پیالی
ثابت لال مرچ	چھ سے آٹھ عدد
بین اسپراؤٹس	ایک پیالی

ترکیب

پہلے گوشت کے چھوٹے پارچوں کو اچھی طرح دھو کر چھلنی میں رکھ دیں۔ اب ایک پیالے میں پارچے، ایک کھانے کا چمچہ سویا ساس، ایک کھانے کا چمچہ سفید سرکہ، چینی، کارن فلور اور نمک ملا کر پارچوں کو پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر ایک دیگچی میں پانی گرم کرکے نوڈلز اور تیل ڈال کر ابال لیں۔ جب وہ گل جائیں تو چھلنی میں چھان لیں۔ تھوڑے سے ٹھنڈے پانی سے دھو کر ایک چمچہ تیل لگادیں۔ اب ایک کڑاہی میں تیل گرم کرکے اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈالیں۔ پھر پیاز شامل کرکے ہلکی گلابی کرلیں۔ اس کے بعد مسالے لگے پارچے شامل کرکے ہلکا سا بھونیں اور تمام باریک کٹی سبزیاں بند گوبھی، شملہ مرچ اور گاجر ڈال دیں۔ اب سبزیوں کو مکس کرکے نوڈلز ڈالیں۔ پھر دو کھانے کے چمچے سویا ساس، دو کھانے کے چمچے سفید سرکہ، نمک، چکن کیوب والا میدہ اور کالی مرچ شامل کرکے تھوڑی دیر کے لیے اسٹر فرائی کرلیں۔ پھر تل کا تیل ڈالیں۔ سرو کرتے ہوئے باریک کٹی ہری پیاز کے پتے، لال مرچ اور بین اسپراؤٹس شامل کردیں۔

شازیہ...... پشاور

س: بھائی مجھے آپ سے اپنی ایک دوست کی ازدواجی زندگی میں درپیش ایک الجھن کا حل چاہیے۔ میری دوست کی محبت کی شادی تھی۔ شادی کو بارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنی تعلیم بھی شادی کے بعد مکمل کی ہے۔ اس نے ایم اے اردو کیا ہے اور اب ایک مایہ ناز تعلیمی ادارے میں اچھی سیلری لے رہی ہے۔ جب کہ اس کے شوہر کم تعلیم یافتہ ہیں اور معمولی سیلری والی جاب کرتے ہیں۔

میری دوست کی جاب کے بعد سے ان کے حالات کافی بہتر ہوئے ہیں۔ بظاہر سب کچھ نارمل ہے ایک ضروری بات کہ میری دوست کے شوہر جو کسی وجہ سے باپ نہیں بن سکتے کافی علاج بھی کروا چکے ہیں (ان کے بڑے بھائی کا بھی یہی مسئلہ ہے) بظاہر تو میری دوست کے ساتھ اچھا رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ اس پر شک کرتے ہیں کہ یہ مجھ سے اچھا کماتی ہے اور زیادہ پڑھی لکھی بھی ہے تو کہیں کسی اور میں انٹرسٹڈ نہ ہو جائے۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ان کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی ساری سیلری بھی ان کو دیتی ہے اور اے ٹی ایم وغیرہ بھی ان ہی کے پاس رکھواتی ہے۔ اپنے پاس کوئی سیونگ بھی نہیں رکھتی ہے۔ روزانہ کی پاکٹ منی بھی ان سے مانگ کر لے جاتی ہے کہ کہیں ان کو شک کا موقع نہ مل جائے۔

میری دوست نے اپنے بھائی کی بیٹی بھی ایڈاپٹ کی ہوئی ہے صرف اپنے شوہر کے ذہنی سکون کے لیے ہی کہ ان کو خود میں موجود کمی کا احساس نہ ہو۔ ان کا رویہ بھی بچی کے ساتھ کافی مشفقانہ ہے۔ لیکن میری دوست بہت مشکل میں ہے۔ ان کے طعنے اور شک اب دن بہ دن بڑھتے جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب بیٹی کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور بارہا میری دوست کو چھوڑنے کا بھی کہہ چکے ہیں۔ حالانکہ یہ سب تو میری دوست کو کہنا چاہیے کہ ان کی وجہ سے وہ ماں جیسے اعلیٰ رتبے پر فائز ہونے سے محروم ہے۔ لیکن اس سارے معاملے میں عجیب بات یہ ہے کہ جیسے ہی میری دوست کو سیلری ملنے کے دن قریب آنے لگتے ہیں، ان کا رویہ خود بخود میری دوست کے ساتھ اچھا ہونے لگتا ہے۔ پلیز آپ کوئی مشورہ دیں۔ میری دوست ذہنی مریضہ بنتی جا رہی ہے اور وہ مجھ سے خودکشی کا ارادہ رکھنے کا ذکر بھی کر چکی ہے۔

ج: خودکشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ دنیا بھی خراب، آخرت بھی خراب۔ جو حالات آپ نے لکھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی دوست کے شوہر احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اس لیے وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور انہیں اذیت دیتے ہیں۔ آپ کی دوست کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر سے سنجیدگی سے بات کرے۔ اور اپنی شکایتیں ان کے سامنے رکھے۔ انہیں بتائے کہ ان کا رویہ کتنا غلط ہے۔ اور وہ شک کر کے اس کی توہین کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ شوہر کا ذہن صاف ہو جائے اور وہ اپنے رویہ میں تبدیلی کریں۔

ورنہ ایک راستہ علیحدگی کا ہے۔ آپ کی دوست خلع لے سکتی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں تنہا عورت کا رہنا بھی آسان نہیں۔ آپ کی دوست کو بہت ہمت سے کام لینا ہوگا۔

فیصلہ آپ کی دوست اور اس کے شوہر کو مل بیٹھ کر اور تمام حالات سامنے رکھ کر کرنا ہوگا۔ کوئی دوسرا اس بارے میں اپنی رائے صادر نہیں کر سکتا۔

ف۔ن...... قصور

س: عدنان بھائی میرا مسئلہ وہی ہے جو آج کل کی نئی جنریشن کا ہے موبائل کا استعمال میرے لیے وبال جان بن گیا ہے۔ میرے خاوند جو کہ پولیس میں جاب کرتے ہیں۔ انہوں نے میرے موبائل پر ٹریکر لگایا ہوا تھا۔ وہ میرا ایک ایک لمحہ چیک کرتے رہتے تھے مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا وہ نا صرف میرے بلکہ میرے تمام گھر والوں اور اردگرد کا جائزہ لیتے رہتے تھے، مجھے چونکہ اس چیز کے متعلق بالکل نہیں معلوم تھا، میرا اور ان کا کچھ خاص بھی ریلیشن نہیں رہا کیونکہ وہ تو موبائل سے سب کچھ پڑھتے اور سنتے رہتے تھے۔ ان کو میرے متعلق شک ہو گیا ہے کہ میرے کچھ لڑکوں سے تعلقات ہیں حالانکہ وہ ایک فیک اکاؤنٹ ہے۔ میرے فیس بک اکاؤنٹ پر میرے متعلق کچھ خاص شیئر بھی نہیں کیا گیا۔

میرے خاوند نے میرے متعلق میری فیملی کو بھی مکمل گمراہ کر دیا ہے۔ اب وہ لوگ بھی مجھ پر کچھ خاص اعتماد نہیں کرتے۔ ہائر ایجوکیشن تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی میں گھر میں محصور ہو کر رہ گئی ہوں۔ میرے شوہر مجھے اور میری بیٹی کو میرے میکے چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے کوئی ایسا کام بتائیں جو گھر بیٹھے کر سکوں۔

کیا کوئی کسی کا پرسنل ڈیٹا چیک کر سکتا ہے؟

کیا کوئی ایسا قانون نہیں بنا کہ اس طرح پرسنل باتیں سننے یا دیکھنے والے موبائل ٹریکر استعمال کرنے والے کو قانون کوئی سزا دے سکے۔ بے شک وہ خاوند ہے اور پولیس میں ہے تو کیا کسی کی پرائیویسی کا کوئی قانون نہیں؟ اگر ہے تو اس کی کیا سزا ہے؟

ج: آپ کا خط ان تمام لڑکیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو صرف وقتی تفریح یا وقت گزاری کے لیے دوسرے لڑکوں یا مردوں سے باتیں کرتی ہیں۔ وقت گزاری کرنے کے لیے بظاہر بے ضرر نظر آنے والی یہ باتیں ان کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ بہت سے جرائم پیشہ افراد اس طرح لڑکیوں کو بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ آپ کے شوہر نے انتہائی قدم اٹھالیا اور ایک بیٹی کے ماں ہونے کے باوجود آپ کو طلاق دے دی۔ وہ آپ کو تنبیہ بھی کر سکتے تھے۔

اب آپ گھر بیٹھے کام کرنا چاہتی ہیں۔ آپ پڑھی لکھی ہیں آج کل بہت سی خواتین گھر بیٹھے آن لائن پر کام کر رہی ہیں۔ آپ موبائل استعمال کرتی رہی ہیں۔ اس بارے میں نیٹ سے معلومات حاصل کر کے آن لائن کام کر سکتی ہیں۔ گھر بیٹھے آپ بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا سکتی ہیں۔

سائبر کرائم کے تحت کسی شخص کی پرائیویسی کے تحفظ کے لیے بہت سے قوانین بنائے گئے ہیں اور کوئی شخص ان کی خلاف ورزی کرے تو سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے لیکن آپ کا مسئلہ مختلف ہے۔ شوہر کے لیے ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ وہ بیوی کے فون چیک نہیں کر سکتا۔

ہ۔ب

س: ایک بہن ہ...... ب کا خط ملا ہے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ڈپریشن اور خوف کا شکار ہیں۔ طرح طرح کے خیال انہیں تنگ کرتے ہیں، ہر چیز سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ پڑھی لکھی ہیں، اللہ پر یقین رکھتی ہیں۔ لیکن اپنے خیالات پر قابو نہیں پا سکتی ہیں۔

ج: اچھی بہن ڈپریشن کی دواؤں سے آپ کو فرق پڑا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی کیفیت پر قابو پا سکتی ہیں اور آپ کو جو تکلیف ہے، اس کا علاج ممکن ہے۔

اس طرح کے خیالات کا آنا ابنارمل یا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اکثر لوگ وہم کا شکار ہوتے ہیں لیکن آپ کے سلسلے میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ یہ کیفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ خود سے دوائیں لینا آپ کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ فوری طور پر کسی ماہر ڈاکٹر سے مل کر مشورہ کر لیں۔ اس سلسلے میں تاخیر نہ کریں یہ آپ کے لیے نقصان دہ ہوگی۔

☆